عمل چغتائی

قدر و قیمت

مجھے اپنے عزیز دوستوں اور کرم فرماؤں کا شکریہ ادا کرنا ہے جنھوں نے
میرا حوصلہ اور اعتماد بڑھایا اور میرے اس نیک ارادے کو پھلنے پھُولنے کا موقع مُہیا
کیا، جس کا بُنیادی پتھر شاعرِ مشرق علامہ اقبال کی زندگی میں رکھا تھا اور انتہائی مشکلات
کے باوجود اس کام کو آسان سمجھا تھا۔

وہ مخلص شخصیت جو دُکھ سُکھ میں برابر ساتھ دیتی رہی
آنریبل چیف جسٹس سُپریم کورٹ ایس۔ اے۔ رحمٰن صاحب
کی ہے، جنھوں نے ہر موڑ پر بلند نظر انسان ہونے کا ثبوت دیا۔
پروفیسر سیّد وقارِ عظیم صاحب کا مَیں دِلی ممنون ہُوں
جنھوں نے اردو مُسوّدہ جات کو پڑھا

اِس سلسلہ میں مجھے اپنے عزیز بھائی عبدُالرّحیم صاحب کا بھی ذکر کرنا ہے جن
کی ان تھک کوشش اور تعاون سے یہ اشاعت، یہ مُرقّع اس معیار سے صُورت پذیر ہُوا
اور مَیں اپنی ذمّہ داریوں سے عُہدہ برآ ہونے کے قابل ہُوا ہُوں۔

حیات و موت نہیں التفات کے لائق
فقط خودی ہے خودی کی نگاہ کا مقصُود

محمد عبدالرحمٰن چغتائی

آنسو ہیں تو آنسو مگر ان کی مختلف قسمیں ہیں۔ آنسو اکثر تو غم و اندوہ کے اظہار کے لئے بہتے ہیں، لیکن کبھی کبھار خوشی میں بہتے تو نہیں اُچھل آتے ہیں۔ مَیں اس عرصہ میں کس آرزو کی بھینٹ چڑھا اور وُہ کون سی آرزو تھی جس نے ساتھ دیا۔ نقش ہائے رنگا رنگ کی اشاعت سے واضح ہے۔ جذبات کی طُغیانی اور مسلسل جدوجہد کس طرح ارتقا کی منزلیں طے کرتی رہی۔ اور ذہنی توازن کو متزلزل کرنے میں مشکلات اور رکاوٹیں کس صُورت نازل ہوتی رہیں کچھ مَیں ہی جانتا ہُوں۔

اعلیٰ مقاصد کے زیرِ نظر میری تصویروں کی نمائش ۱۹۴۹ء میں منعقد ہُوئی۔ اس کے بعد ۱۹۵۲ء، ۱۹۵۵ء اور ۱۹۵۹ء میں مُختلف نمائشیں ترتیب پاتی رہیں —— بڑی بڑی اُمّیدوں اور سرگرمیِ عمل سے ایک جہان آباد ہُوا تو فرد اور جماعت کا خاکہ لکھنے پر مجبُور ہُوا۔ آج ۱۹۶۸ء رواں دواں ہے۔ اور میں مطمئن ہُوں کہ وُہ سرمایہ جو کارِ خیر کے لیے ہزاروں حیلوں بہانوں سے جمع کیا تھا، اِس **لمُو ترنگ** میں رچا ہُوا نظر آ رہا ہے۔

علاّمہ **اقبال** کے اِس مصوّر ایڈیشن کی تکمیل کے دَوران مشکلات کے زیرِ اثر کچھ یُوں محسُوس ہوتا رہا کہ ابھی ہمارے ہاں ذوقِ نظری میں وُہ وسعت پیدا نہیں ہُوئی۔ کہ کوئی احساس مند فراغت و یکسُوئی کے ساتھ معاشرے کی علمی ادبی خدمت انجام دے سکے۔ بعض کم نظر افسروں نے اپنی کم ظرفی کو بلند نگاہی پر ترجیح دی۔ ناشناساؤں نے صدمے پر صدمے پہنچائے۔ مگر اپنے اِعتماد نے اَنا کو ٹھیس لگنے نہ دی۔ اِس خیال سے بھی کہ منزل تک پہنچنے کے لئے راستے میں طُوفان اور چٹانوں کا حائل ہونا فطرت کا تقاضا ہے ؎

جب تک نہ زندگی کے حقائق پہ ہو نظر
تیرا زجاج ہو نہ سکے گا حریفِ سنگ

یہ زورِ دست و ضربتِ کاری کا ہے مقام
میدانِ جنگ میں نہ طلب کر نوائے چنگ

خونِ دل و جگر سے ہے سرمایۂ حیات
فطرت لہُو ترنگ ہے غافل نہ جل ترنگ

محمد عبدالرحمٰن چغتائی
۱۹۶۸ء

فرد اور جماعت

انقلابی حکومت کی مجبوریاں، مجبوریاں رہیں۔ اور مَیں آپ اپنی مجبوریوں کا شکار ہوتا رہا۔ زخم پر زخم کھائے۔ اور پریشانیوں پر پریشانیاں اُٹھائیں۔ لیکن حوصلے کو پست نہ ہونے دیا۔ اپنی آرزوؤں کی خاطر در در پر دستک دی۔ اقبال کو وسیلہ بنایا اور اُس کی تخلیق کا ہر ورق اُلٹ پلٹ کر دکھایا مگر بے اعتنائی اور بے نیازی نے مایُوس لوٹایا۔ اس پر بھی خود اعتمادی نے ساتھ نہ چھوڑا۔ اور مَیں اس خود اعتمادی کے سہارے اس عمل میں مصروف رہا جس سے ایک عظیم ثقافتی انقلاب بپا کرنا مقصود تھا۔

علامہ اقبالؒ کی ہمیشہ یہ آرزو رہی کہ ان کے کلام کا ایک باتصویر اور جامع ایڈیشن شائع کیا جائے۔ وُہ اکثر فرمایا کرتے تھے کہ صحت بحال ہو جائے تو جاوید نامہ کا انگریزی میں ترجمہ کروں گا۔ اسے ترتیب دُوں گا۔ اس میں تُمھاری بنائی ہُوئی تصویریں ہوں گی۔ اور اس مصور ایڈیشن کو نوبل پرائز کے لئے پیش کیا جائیگا۔ علامہ مرحوم کی اس خواہش کو مَیں نے اپنی آرزو بنا لیا۔ لیکن اس آرزو کو عملی صُورت دینے میں پچیس۲۵ سال گذر گئے۔ اور اب ان کی فلسفیانہ و شاعرانہ تخیّل خیزیاں رنگوں اور خطوں کے سانچے میں ڈھل کر جمالی اور جلالی صفات کے ایک پیکر کی صُورت میں رُونما ہوئی ہیں۔ علامہ مرحُوم زندہ ہوتے تو اس پیکر کو ان کی خدمت میں پیش کر کے اپنی محنت کی داد طلب کرتا۔

میرا خیال ہے کہ ذوق کی فراوانی سے کامرانی ہاتھ آتی ہے۔ مَیں اپنی ناکامیوں اور پریشانیوں کے باوجود برسرِ عمل اور مستعد رہا کہ مجاہدوں کا شیوہ یہی ہے۔ اقبال نے بھی یہی تعلیم دی ہے۔ اقبال کی تعلیم کا اثر، ذوق کی رہنمائی اور مسلسل کاوش ـــــ ان چیزوں کی بدولت جو کچھ ہو سکا، وُہ کر دکھایا۔ اس ایڈیشن پر کم و بیش تین لاکھ رُوپیہ خرچ ہوا ہے۔ کس طرح ہُوا؟ ـــــ اس کی داستان طویل بھی ہے اور ناگفتنی بھی۔

شعر اور تصویر کا رشتہ بڑا نازک ہے۔ شعر تخلیق کے بعد ہزاروں بار پڑھا جاتا ہے اور ہزاروں

بار چھپتا ہے لیکن اس میں کسی طرح کا فرق نہیں آتا۔ تصویر کی تخلیق ایک جنم کا بوجھ ہے۔ وُہ بیسیوں مراحل سے گزرتی ہے تو تصویر کہلاتی ہے۔ اس کا دُوسروں تک پہنچانا اور تخلیق کا احساس دِلانا ایک کارِ دُشوار ہے۔ تصویر میں سقم پیدا ہونے کے امکانات اس درجہ ہیں کہ ذرا سے سقم سے تصویر تصویر نہیں رہتی۔ انھیں مراحل اور مُشکلات کے مدِنظر موجودہ ایڈیشن کو درجۂ تکمیل تک پہنچانے میں تقریباً دس بارہ سال کا عرصہ لگ گیا ہے اور آرزوؤں میں ابھی تک وُہی تشنگی اور حسرت ہے۔ پچھلے بارہ پندرہ سال کس کس طرح گذرے اور مُخلص دوستوں اور صاحبانِ نظر نے کس کس طرح مدد کی۔ کلامِ اقبالؒ کے مصوّر ایڈیشن کے لئے شوق نے کیسے کیسے آنکھیں بچھائیں اور تمناؤں کی برآوری کے لئے دُعائیں مانگیں، ان سب باتوں کا حال دِل ہی جانتا ہے۔ اُمید ہے کہ جو کچھ مَیں نے طرح طرح کی مُشکلات کے باوجود پیش کیا ہے علامہ کے شیدائیوں اور دیدہ وروں کو اپنی طرف متوجہ کریگا اور میں جلد از جلد دوسری جلد شائع کرسکوں گا۔ اور یُوں کورذوقی اور بے بصیرتی کے لئے ذوق اور بصیرت کی تازہ راہیں کُھلیں گی۔

بُہت سی مجبُوریوں کے زیرِ اثر مَیں نے شاعرِ مشرق علامہ اقبالؒ کے مصوّر ایڈیشن کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ پہلی جلد پیش خدمت ہے۔ دُوسری جلد کی تیاری ابھی سے شرُوع ہو گئی ہے۔ کہ وہ مواد، معیار اور حُسن میں بہتر ہو۔

اقبالؒ کا کلام ایک بحرِ بیکراں ہے۔ اس بحر کی غوطہ زنی آسان کام نہیں۔ پھر بھی اگر رائلٹی کے مراحل طے ہو سکے تو کوشش کروں گا کہ بہترین غزلیں اور نظمیں اسی طرح تصویروں کے سانچے میں ڈھل سکیں جس طرح ایک آدھ غزل اور نظم کو اس وقت پُرانے ایرانی مرقعوں کی شکل دے دی ہے۔ تصویر کوئی بھی ہو الفاظ کی ترجمانی کے لئے جواز پیدا کرلیتی ہے۔ اور پھر صاحب نظر ایک ایک تصویر میں کئی کئی شعروں، غزلوں اور نظموں کے ایسے معنی تلاش کرسکتا ہے جو اس کی ذہنی بلندیوں سے مطابقت رکھتے ہوں۔

علامہ اقبالؒ کے اکثر شیدائیوں کو تصویروں سے زیادہ لگاؤ نہیں اور بہت سوں نے تصویریں دیکھیں تو ٹس سے مَس نہ ہوئے۔ جب تک تصویریں دکھاتا رہا یُوں محسُوس ہوتا رہا کہ کسی گُناہ بلکہ عظیم گُناہ کا

مرتکب ہو رہا ہُوں۔ اس جبر کی حالت میں بھی تصویریں بناتا رہا اور کوشش کرتا رہا کہ ایسی تصویریں بنیں جن کے کُچھ معنی نکلتے ہوں۔

تصویریں بناتا رہا۔ تصویریں بنتی رہیں۔ مگر اس طویل عرصے میں یہ احساس بڑھتا رہا کہ تصویریں دیکھنے والے نگاہ باز آہستہ آہستہ آنکھوں سے اوجھل ہوتے جا رہے ہیں۔ میرے پردادا کا نام بابا صلاح معمار تھا۔ وُہ صلاح چغتہ کے نام سے مشہُور تھے اور مہاراجہ کھڑک سنگھ کے دربار میں میرِ عمارت تھے۔ نسلاً اُن بزرگان مہندس میں سے تھے۔ جو تاج محل، لال قلعہ اور شاہی مسجد جیسی رفیع الشان عمارتوں کے خالق ہیں۔ بابا صلاح خاندانی روایات کے مطابق بڑے نکتہ رس اور معاملہ فہم تھے۔ جب کوئی معاملہ اُلجھتا تو مہاراج کہتے صلاح کو بُلاؤ صلاح دے۔ ایک موقع پر مہاراج نے بابا جی کی ذہانت سے متاثر ہوکر سرِ دربار اپنے جڑاؤ کڑے ہاتھوں سے اُتار کر بابا جی کی نذر کر دِئیے تھے۔ اُس زمانے میں حویلی میاں خاں کے اندر چراغ نامی ایک ترکھان رہتا تھا۔ اُسے اپنے فن پر بڑا مان تھا۔ اُس نے محرّم کے لئے بڑی محنت اور جاں فشانی سے ایک تعزیہ بنایا۔ جب تعزیہ تیار ہوگیا تو وُہ عقیدت مندی کے طور پر بابا صلاح کی خدمت میں حاضر ہُوا کہ وُہ تعزیہ دیکھ کر داد دیں۔ بابا جی نے تعزیہ دیکھ کر اُستاد کی بُہت تعریف کی لیکن دبی زبان سے یہ بھی کہا۔ چراغ، یہ تیرا بنایا ہُوا تعزیہ دوست دشمن سب نے دیکھنا ہے۔ تعزیہ کی گُمٹی کُچھ ٹھیک نہیں بیٹھی یعنی اس کی ہَوا نہیں ملی۔ یہ کہکر وُہ گھر لوٹ آئے۔ اُستاد چراغ اس فکر میں لگ گیا کہ وُہ گُمٹی کی ہَوا ملاکر دم لے گا۔ محرّم کا مہینہ سر پر آگیا۔ جن لوگوں نے اُستاد چراغ کو چراغ سمجھ کر تعزیہ بنانے کا کام سپرد کیا تھا تعزیہ دیکھنے آئے تو دیکھا تعزیے کا جوڑ جوڑ الگ پڑا ہے۔ چراغ دِن رات اِس فکر میں تھا کہ گُمٹی کی ہوا بندی کر کے دم لے گا۔ اچانک اسے خبر ملی کہ بابا صلاح کا انتقال ہوگیا ہے۔ استاد کو یہ سُن کر جو صدمہ ہُوا وُہ دُوسرا کیا جانے۔ اس نے دوبارہ کام کو ہاتھ نہیں لگایا۔ اور یہ کہہ کر خود بھی مر گیا کہ جب دیکھنے والی نگاہ ہی نہیں رہی تو گُمٹی کی ہوا بندی ہو بھی گئی تو کیا ہوگا۔ یہی احساس مجُھے ہر گھڑی ستاتا رہا اور بڑی متعدی سے گُمٹی کی ہوا بندی میں لگا رہا۔ اپنی دُھن میں جو کرسکا کر دکھایا ہے، تاکہ رُوحانی رِشتہ ٹُوٹنے نہ پائے، اور وُہ الفاظ جو مَیں نے اپنے مُحترم شاعرِ مشرق کی حیات میں

کے سند رہیں اور آنے والی نسلیں اپنے معاشرے کو لعن طعن نہ کر سکیں۔

فن کی قدر و منزلت کے متعلق میرا بھی یہ نظریہ ہے کہ دیکھنے اور پرکھنے والی ایک نگاہ بھی مل جائے تو وُہ لاکھوں پر بھاری ہے۔ ویسے بھی میرے نزدیک تصویر کی داد طلبی بیوی اور خاوند کا رشتہ ہے۔ کہ اگر وُہ اپنی سَو سالہ زندگی کے پروگرام کو صرف ایک دوسرے سے "تو اچھا" اور "بہت اچھا" کہہ کر گُذار سکتے ہیں تو مَیں سمجھتا ہُوں آرٹسٹ کی تسکین اور تصویر کے اسرار کا رشتہ بھی باہمی تاثّر سے مُستحکم ہے۔

مَیں نے یہ فریضہ انجام دینے کی دُھن میں نہ صرف اپنے بڑے بڑے مقاصد کو چھوڑا، بلکہ ان کا گلا دبا دیا ہے۔ اِسے مَیں نے ہر مقصد پر مقدّم جانا۔ اِس لئے کہ علّامہ سے اس کا وعدہ کر چکا تھا۔ عمر خیام کی اشاعت میرے لئے ایک فطری تقاضا تھا۔ مَیں نے اسے اس وقت ترک کیا جب وُہ تکمیل کی منزل پر تھا۔ اس کی طلب ایک بین الاقوامی طلب تھی۔ اس کے ہر رُخ اور پہلو میں حُسن کی جولانیاں اور حیات کے جمالیاتی تصوّر تھے۔ وُہ رومانی اور رُوحانی قدروں کا مرقّع تھا The Art of Chughtai کی اشاعت تقسیم کے وقت اس منزل پر پہنچ چکی تھی کہ اب تک اس کے کئی ایڈیشن شائع ہو چکے ہوتے۔ مگر مَیں نے شاعرِ مشرق کے مصوّر ایڈیشن کو ان سب پر ترجیح دی اور موجودہ صُورت اور معیار میرے لئے طمانیت کا باعث ہے۔

مجھ کو معلوم ہیں پیرانِ حرم کے انداز
ہو نہ اخلاص تو دعویٰ نظرِ لاف و گزاف

اس کی تقدیر میں محکُومی و مظلُومی ہے
قوم جو کر نہ سکی اپنی خودی سے انصاف

فطرت افراد سے اغماض بھی کر لیتی ہے
کبھی کرتی نہیں مِلّت کے گُناہوں کو مُعاف

محمد عبدالرحمٰن چغتائی ۶۰ء

انتساب

پاک سرزمین ہماری ملی امانت ہے
مَیں اِس مُرقّع کو
امانت کے امین، قائدِ انقلاب
فیلڈ مارشل صدرِ مملکت مُحمّد ایُوب خان
کے نام نامی سے
منسُوب کرنے کی سعادت حاصل کرتا ہوں

محمد عبدالرحمٰن چغتائی
١٩٦٨

دیدنِ دگر آموز

آج وُہ انمول آرزُو سانچوں میں ڈھل رہی ہے جس کی تکمیل کے خود علامہ اقبالؔ آرزُو مند تھے۔
وُہ ڈانٹے اور گوئٹے کے مصوّر ایڈیشنوں سے بہت متاثر تھے اور ہمیشہ اِس بات کا احساس دلاتے رہتے
تھے کہ اُن کا کلام بھی رنگوں اور خطوں میں منتقل ہونا چاہیئے۔ علامہ اقبالؔ کی زندگی ہماری تاریخ کا ایک زرّیں
ورق ہے اور ان کا کلام ایک بیش بہا اور زندہ جاوید تہذیبی ورثہ ہے۔ چنانچہ یہ خیال ایک مدّت سے دِل
میں مچل رہا تھا کہ اِس عظیم ورثے کو جو ایک عظیم ہستی کی یادگار ہے رنگوں اور خطوں میں محفوظ کیا جائے۔ کوشش
میں کسی طرح کی کمی نہ رہ جائے تاکہ آنے والی نسلیں یہ کہہ سکیں کہ ہم نے جدّوجہد کے دور میں بھی اپنے ورثے
کی حفاظت کی۔ اور اسے محفُوظ رکھنے کے لیئے اپنے ثقافتی مقاصد کو ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔

تیرہ سَو سال سے بھی زیادہ ہم نے زندگی کے ہر دور میں اپنی صلاحیتوں کو انسان اور انسانیت کی
عالمگیر خدمت کے لیئے وقف رکھا ہے۔ اجتماعی زندگی کی بھلائی کو کبھی نظر انداز نہیں کیا۔ نہ ان رمُوز سے
چشم پوشی کی جن سے خود آگاہی اور انسان شناسی کا بلند نصب العین ہاتھ آتا ہے۔ مجاہد صفت لوگ ہر دَور
اور ہر زمانے میں چٹانوں سے ٹکراتے رہے۔ انسان اور انسانیت کے لیئے علم وعمل کی راہیں تلاش کرتے رہے۔
اور ہمیشہ نئی قدروں کے دھاروں کا رُخ بڑھتی چڑھتی زندگی کی طرف پھیرتے رہے۔ رُومی، فردوسی، سعدی،
حافظ، فیضی، عُرفی اور اسی طرح بہزاد، میرک، سید میر علی تبریزی، قاسم، فرخ بیگ قلماق، اُستاد عبد الصّمد
اور استاد رضا عبّاسی نے اپنے زمانے اور اس کے تقاضوں کے زیرِ اثر معاشرے کو علم وفن کی روشنی
دِکھائی اور زندگی کو زیادہ بامعنی اور زیادہ اہم بنانے کی خدمت انجام دی۔

ہر بڑے شاعر کی طرح علامہ اقبال کی شاعری بھی اس انتشار کی پیداوار ہے جس سے انسان
صدیوں سے دوچار ہے۔ اقبالؔ چاہتا ہے اس بے اطمینانی اور انتشار کو ہمیشہ کے لیئے ختم کردے۔ جس سے
عہدِ حاضر اور اس کا انسان دوچار ہے۔ ناستواری کا یہ عالم ہے کہ اس نے فرد کی خود اعتمادی کو کچل کر رکھدیا
ہے۔ خصُوصیّت سے اس کا نظریۂ زندگی اپنے پیش روؤں کے دوش بدوش اتنا اسلامی اور مذہبی ہے کہ ہماری

قدامت پسندی تعمیرِ حیات کو تعمیرِ مذہب کہنے پر مجبُور ہے۔ مغرب پرستی نے ہمارے معاشرے کو اس قدر گدلا کر رکھا ہے کہ پاکیزگی کی قدروں کے لئے ایک مستقل خطرہ درپیش ہے۔ اقبالؔ جیسا مفکرّ، شاعر اور فلسفی تہذیبِ مغرب کے اتباع کو خودکُشی قرار دیتا ہے۔ مَیں نے اپنی مصوّری کے ذریعے شاعرِ مشرق کی ترجمانی کی جو کوشش کی ہے اس کا تعلق اقبالؔ کی مشرقیّت کے جنون ہی سے ہے۔ اور مَیں سمجھتا ہُوں اسی خلوص اور جنون سے ہماری انفرادیت کی سلامتی ہے۔

زندگی کے متعلق علامہ اقبالؔ کا نظریہ انوکھا، اچھوتا اور انفرادیت سے بھرپُور ہے۔ وُہ ان حقائق کی اساس پر قائم ہے جن سے زندگی کے پھلنے پھُولنے کے امکانات پیدا ہوتے ہیں۔ یہ بات بڑے بڑے مفکرّوں، شاعروں اور مصوّروں کی غور و فکر کا مرکز رہی ہے کہ کسی نظریئے کی تکرار یا تقلید ہر اس مخلُوق کی موت کا سبب بنی ہے جو اپنی انفرادیت سے جینے کی آرزُو لے کر پیدا ہو۔ نقالی کا دُوسرا نام خودکُشی ہے۔ چنانچہ یہ ایک حقیقت ہے کہ ہر فن کار اپنے نظریۂ حیات اور مسلکِ فن کو اپنی انفرادیت سے فروغ دیتا ہے۔ فن جدید ہو یا قدیم اس کی بقا کا انحصار فن کار کی شخصیت اور اسکی نمائندگی پر ہے۔ فن کا ز دلآویز، خوش آہنگ تشبیہوں استعاروں اور دِلکش رنگوں اور خطوں سے زندگی کے سوز و ساز میں ولولہ پیدا کرنے کی کوشش میں اِس لئے رہتا ہے کہ رشتہء اخوّت کی ہمہ گیری میں جو انسان اور انسانیت کے درمیان موجود ہے فرق نہ آنے پائے۔ اقبالؔ کی مقبولیت کا راز اس کی عظیم شخصیت اور اس کی انفرادیت میں مُضمر ہے۔ وہ اپنے تفکرّ کو خم میں بھی ڈبوتا ہے تو اسکی توانائی اور فراوانی ایک نیا رُوپ اختیار کرتی ہے۔ اس کے ہاں گُل و خار بھی ہیں صحرا اور چمن زار بھی ہیں۔ شکوہ و ترنّم بھی ہے۔ پیمانہ و شراب بھی ہے۔ اور اس کے ساتھ ساتھ وُہ رومی سے لیکر برگسان، گوئٹے، نطشے، عُرفی، غنی کاشمیری، نانک، بھرتری تک سب پر نظر رکھتا ہے۔ لیکن فِکر کی انفرادیت کبھی اس کا ساتھ نہیں چھوڑتی۔ اقبالؔ کے ہاں غزل، نظم، رُباعی، مثنوی، مسدّس سبھی کچھ ہے۔ وُہ متاثر ہوتا ہے تو دونوں جہانوں کے در اُس کے تخیّل کے سامنے کھُل جاتے ہیں۔ وہ ہر شے کو اپنے ساغر میں ڈال کر پی جاتا ہے۔ زندگی کے اُتار چڑھاؤ کا جائزہ جس طرح اقبالؔ نے لیا۔ اور فن کے مسلک کو جس طرح اُجاگر کیا وُہ اسمیں منفرد ہے۔ کوئی اس کا ہمسر نہیں۔

آرٹسٹ نے ہمیشہ اپنے فن سے ذہنی ارتقا اور رُوح کی بالیدگی کی خدمت انجام دی ہے۔ اُس نے تلوار کی دھار سے بھی زیادہ تیز اور نازک جذبات کی ترجمانی کا حق ادا کیا ہے۔ اور اُس نے اخلاق اور انسانیت کے پرچم کو اُونچا رکھا ہے۔ انفرادی طور پر آرٹسٹ اپنے اندر سرکشی اور بغاوت کے جوہروں کو جنم دیتا ہے۔ اور یہ جوہر اور جراثیم اس وقت اُبھرتے ہیں جب تخلیق اور بخشش ودیعت کی گئی ہوں۔ فن کُل ہو یا محض ایسی تحریکیں کبھی سازگار نہیں ہوتیں۔ اور نہ معاشرے نے ان سے کبھی فائدہ حاصل کیا ہے۔ اعتماد اور عقائد کو گمراہ کرنا جھوٹے پیغمبروں کا وطیرہ رہا ہے۔ لیکن سچّے پیغمبروں کی نقالی جھوٹے پیغمبروں کو کبھی راس نہیں آئی۔ جھوٹی پیغمبری کو اپنی ظاہری سامریت کے باوجود کبھی فروغ نصیب نہیں ہُوا۔ اس لئے کہ کوئی نہ کوئی پیغمبر اپنے یدِ بیضا سے طلسمِ سامری کو توڑتا رہا ہے۔

آرٹسٹ جو اپنے قومی کردار کا ترجمان ہے اپنے قومی وقار اور روایات کو جھٹلا نہیں سکتا۔ اگر اس کی ارادی قوتیں نقّالی اور تتبّع پر مبنی ہوں تو تنزل اور زوال اس کے شعور پر مسلّط رہتا ہے۔ وہ اس نظامِ حیات کو پس پُشت ڈال دیتا ہے جس سے کسی قوم میں حمیّت اور ولولۂ حیات پیدا ہوتا ہے۔ اور جس کے بغیر آرٹ کی تکمیل نہیں ہوتی۔ ایسا نقّال آرٹسٹ اگر آرٹ کا کوئی شعبدہ پیش بھی کر دے تو تخلیقِ فن میں اس کا کوئی مقام نہیں۔ خود بینی یا زیادہ صحیح الفاظ میں خود فروشی کا جنون اس کی تخلیق کو باعثِ ننگ بنا دیتا ہے۔ جھوٹے پیغمبروں اور خود فریب دانشوروں نے رضائے الٰہی کے خلاف اکثر معجزے بیان کئے ہیں۔ مگر انکی ایک کوشش بھی ایسی نہیں جو انسانیت کے کام آئی ہو۔ اور جب کبھی ایسا ہوتا ہے تو انسانیت کی پُوری عمارت منہدم ہو جاتی ہے۔ یہی حال نقّال فن کاروں کا ہے۔

فنِ محض کا ایک کرشمہ یہ ہے کہ اُس نے فن کاروں کو لادینی اور مذہب کے قیود سے آزاد کر دیا۔ اور یہ سوچنے اور سمجھنے کا موقع ہی مہیّا نہ ہو سکا کہ یہ جذباتی فلسفی خود بھی کوئی مذہب رکھتا ہے یا نہیں۔ فنِ محض نے حرام و حلال کو، رُوحانی صلاحیتوں کو اور جلال و جمال کو ایسی گمراہی میں ڈال دیا کہ اسے معاشرے میں سوائے جذباتی عیّاشی کے کوئی جگہ نہ مل سکی۔ اس انتشار اور بے راہ روی نے تاریخ میں وُہ خلا پیدا کر دیا ہے کہ وُہ

فن کار کی نیت اور عقائد کی طرف توجہ نہ دے اور یہ محرومی جذباتی آسودگیوں سے ہم آغوش نہ ہو سکے ۔ اور آرٹسٹ کو وُہ مقام حاصل نہ ہو سکے جو مغرب میں دور احیاء سے لے کر آج تک فن کاروں کے لئے طرۂ امتیاز رہا ہے ۔ جنہوں نے خیر و شر کے تلاطم سے دُور رہ کر فن کی افادیت سے اپنی دُنیا کے انسانوں کو سیراب کیا۔ اور یہ کہہ کر نجات دلائی ' پیغمبر اور اسکی کتاب آرٹسٹ کا صحیح مقام ہے ۔'

الہامی اور مقدس کتابوں کے پُر زور سچے الفاظ اور اُن کے حقائق زمین کی وسعتیں، آسمانوں کی دلکشی اور نئے نئے تصورات کے امکانات انسانی بصیرت کا ساتھ دیتے ہیں ۔ تاکہ ارتقاء کی ہر منزل میں ذہنی فکر کے لئے ہیئت اور مواد مہیا ہوتا رہے ۔ ہم نے اختراع و ایجاد کے نام سے جو تجریدی شکلیں، عجیب و غریب خد و خال، اور اُن کے Patterns اختراع کرنے کی خُو پیدا کی ہے ۔ اس سے دیکھنے اور پرکھنے والے کی خود اعتمادی جاتی رہی ہے ۔ تجریدی تجربات میں فرار اور جنسی لذتیں بدرجۂ اُتم موجود ہیں ۔ قدم قدم پر بدراہی کا خطرہ لاحق ہے ۔ یہ نئی نئی تحریکیں دِل کو بہلانے اور خود کو فریب دینے کیلئے چمکیلے زیور ہیں ۔ اُن کا شمار کبھی لازوال قوتوں میں نہیں ہُوا ۔

جب ہم اپنے فن مُطلق کا جائزہ لیتے ہیں اور مشینی رُجحانات کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہر طرف انحطاط ہی انحطاط نظر آتا ہے ۔ اور انحطاط کے زہریلے اور مُہلک جراثیم خود فن کاروں کے اپنے پیدا کئے ہُوئے ہیں ۔ فن محض ہو یا فن برائے زندگی، فن کی عظمت سے چھیڑ چھاڑ انتہائی بد اخلاقی بلکہ ناقابلِ معافی گُناہ ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ یہ بدراہ مقلّد خود بھی انہی اختراعوں اور بدعنوانیوں سے مطمئن نہیں ۔ اور جب ایک آرٹسٹ کو خود اعتمادی حاصل نہ ہو ۔ اس کی بقا کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ۔ پھر اس کے میکانی اثرات پُشت ہا پُشت معاشرے کا پیچھا نہیں چھوڑتے ۔ تنزل کے اِس پس منظر میں نظامِ زندگی پر ذہنی فالج کے مسلّط ہو جانے کا خطرہ مستقل حیثیت اختیار کر لیتا ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ آج مغرب کے طُول و عرض میں زوال پذیر آرٹ کے بے شمار ایسے نمونے دیکھنے میں آتے ہیں جنہیں ہم نہ سینوں سے لگا سکتے ہیں اور نہ آرائش گاہوں کی زینت بنا سکتے ہیں اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ انسان پھر بَن مانس بن جانے کی طرف مائل ہے ۔

دورِ احیا کے عظیم اُستادوں نے حضرت مسیح کی زندگی کے تابع جس خلوص اور نیک نیتی سے اپنی صلاحیتوں کا اظہار کیا ہے۔ ہزار قنوطیت کے باوجود ان کا ہر شاہکار قابلِ قدر ہے۔ ان کی ہر کوشش اُن کے عقائد کی رُو سے لافانی ہے۔ راہبانہ زندگی کے مقلد مخلص فن کار زندگی کے تنزل کو دیکھنے کی تاب نہ لا سکے۔ پیچیدگیاں بڑھیں اور ہوتے ہوتے ان صلاحیتوں کا خاتمہ ہو گیا جن کی حدت نے اُنھیں اس عظیم خدمت پر مامور کیا تھا۔ ان عظیم فن کاروں نے اپنے فنی شعور اور صلاحیتوں سے اپنے مذہب اور مقدس جذبے کی وُہ لازوال خدمت انجام دی ہے جس کا اجر ان غیر فانی شاہکاروں کی قدر و منزلت کی صُورت میں ان کی معصوم رُوحوں کو برابر پہنچ رہا ہے۔ ان خلوص بھرے فن کاروں نے اپنے ہادی کی پیغمبرانہ زندگی کا تصوّر جن رنگین پیکروں میں ڈھالا ہے۔ اور جس عقیدتمندی سے انہیں تشکیل کیا ہے وُہ انھیں کا حصّہ ہے۔ آج کے مصوّروں کو ان کا مذہبی جذبہ اور تقدّس راس نہ آیا۔ تو وُہ اس سے اُکتا کر ان سے متنفّر ہو گئے۔ اور ردِّ عمل کے طور پر یہ نعرہ بلند کرنے لگے۔ کہ جو آرٹ مذہب کے پردے میں فروغ پاتا رہا ہے ترقی کی راہوں میں آن کھڑا ہوا ہے۔ اس کا معیار فنی مزاج اور اس کی حدت اور شدت سے خالی ہے۔

اجنٹا، الورا اور مشرقِ بعید کے مندروں اور غاروں کا جائزہ لیا جائے تو اُن کے اندر آرٹ کے نادر اور بیش قیمت نمونے ملتے ہیں۔ ان کی مذہبی کیفیات کو اُن کے عقائد کے پیمانوں سے ناپا جائے تو تسکین سی محسوس ہوتی ہے۔ اس وقت کے فن کاروں نے عیسائی آرٹسٹوں کی طرح بُدھ کی عظمت کو فن کی عظمت کا درجہ دے کر اس بات کا ثبوت بہم پہنچایا ہے کہ ان شاہکاروں کا رشتہ مذہب اور عقیدے کے سوا کسی اور چیز سے نہیں مطالعہ بتاتا ہے کہ بُدھ کے پرستاروں نے اپنی تخلیق میں حضرت مسیح کے پیروؤں سے کہیں زیادہ بُدھ کی ہستی کو جُزوِ زندگی بنا رکھا تھا۔ وُہ جہاں بھی جاتے تھے۔ سائے کی طرح یہ خلوص اور جذبۂ ہُنر ان عقیدت مندوں کے ساتھ ساتھ چلتا تھا۔ آج بھی وُہ غیر فانی شاہکار جو بُدھ مت کی پیداوار ہیں ہزار قنوطیت کے باوجود جلال و جمال اور کمال و شکوہ سے مالا مال ہیں۔ ان شاہکاروں کے جس گوشے پر نگاہ ڈالو سُرمگیں صُورتوں کے پُر تبسم جھکے ہُوئے لب اِس بات کا یقین دِلاتے ہیں کہ حُسنِ عقیدت کے سوا کوئی اَور خالق اُنھیں حیاتِ جاوداں نہیں بخش سکتا تھا۔ اور ایسا نظر آتا

ہے کہ مذہب کے وُہ پرستار اس ارادت اور خلوُص کیساتھ آج ان بُتوں کو دوبارہ جنم دے سکیں گے۔ اجنٹا اور الورا کے غاروں میں داخل ہونے والا زیرک انسان ان فنکاروں کی ریاضت اور ذہانت کا سمہ اپنی آغوش میں لے لیتا ہے۔ یہاں اسے ذوقِ نظر اور کمالِ فن کا ایک ایسا اُفق دِکھائی دیتا ہے جس کے پس منظر میں نگاہیں تصوّر کے حدُود سے بھی تجاوز کر جاتی ہیں۔ اور وُہ مجبُور ہوتا ہے کہ ان کے بے پناہ جذبے کی قدر کرے۔ میں نے ایک موقع پر ایک سوال کے جواب میں کہا تھا۔ یہ ان چِتر کاروں اور دانشوروں کا سورگ ہے جنھوں نے پوری طمانیت سے اپنی صبر آزما زندگیاں اپنے ہادی کے قدموں پر بھینٹ چڑھائی ہیں۔ وُہ دُنیا کی لذتوں سے دُور رہ کر بھُوک اور پیاس سے بے نیاز بُدھ سے لَو لگائے اس کے چرنوں میں بیٹھے ریاضت کا دم بھرتے اور فن کو پروان چڑھاتے رہے ہیں۔ عورت کی تنومندی، اُس کا حیات پرور تناؤ، سینے کا اُبھار، بدمست لرزاں ہونٹ۔ کھُلے کھُلے شانے، بھاری بھاری کُولھے، زندگی کا سوز ساز سدا رہبانیت کے مسلک کو دُہراتا اور اسرارِ بے خودی کے دُشوار گُذار رستوں کی یاد دلاتا رہے گا جو اپنی دُشواریوں، دُوریوں اور مجبُوریوں کے باوجود جنّتِ نگاہ اور فلسفیانہ مُوشگافیوں کا آماجگاہ ہے۔

اجنٹا اور الورا کے غار اس بات کا ثبوُت ہیں کہ بُدھ کی تعلیم کا مقصد شانتی اور تپسیا تھا۔ اور اسی سے زندگی کا سکُون تلاش کرنا تھا۔ اور یہی ایک وجہ تھی کہ مہاتما بُدھ نے برگد کے نیچے بیٹھ کر سارے جگ کی بپتا کا پالن کیا۔ اور مُکتی دلانے والا کہلایا۔ اُس نے اپنے مقصد میں لافانی کامیابی حاصل کی۔ اس کی سُرمگیں آنکھیں، پُر تبسّم ہونٹ یُونہی امرت بہاتے رہیں گے۔ جاتری درشنوں کے لئے بے کنڈ لہراتے رہیں گے۔ عقیدت سے سر جھکائے اس کی قربانیوں کے گُن گاتے رہیں گے اور اس امرت رس سے پیاس بُجھاتے رہیں گے۔ جس پوِتر جل سے بُدھ نے اشنان کیا تھا۔

مصر کے انکشافات نے جب یورپ کا نظریۂ فن اور معیار بدل ڈالا۔ اور عیسائیت کے خلاف اندر سے زہریلا مادہ پھُوٹ نکلا تو مغرب کی نگاہیں مشرق کے ان زندہ جاوید خزینوں کی طرف جُھک گئیں۔ اور انھیں یُونانیوں اور عیسائیوں کا مذہبی جذبہ فراعنۂ مصر کے مقابلے میں بُہت کم قیمت نظر آیا۔ اور یہ احساس عام ہو گیا

کہ مغرب کا فن جمالیاتی حسن سے خالی اور پستی اور انحطاط کا مظہر ہے مصر کے فن کاروں کی رجائیت اور احساس خودی نے مجسموں اور دیواروں پر بنی ہوئی تصویروں نے اپنا عکس اور رنگ دکھایا۔ اور وُہ تنزل کے اس بوجھ کو اُتارنے میں کامیاب ہوگئے جسے اپنی زبوں حالی کی وجہ سے صدیوں سے برداشت کرتے چلے آرہے تھے۔ اُنھوں نے استبداد کی چیرہ دستیوں سے نجات حاصل کرنے اور غلامی کی زنجیروں کو پارہ پارہ کردینے کا تہیہ کیا۔ اور اپنی نجات کے لئے معبد خانوں کا رُخ کیا۔ اور مجسمے تراشنے میں مصروف ہوگئے۔ دُنیا نے ان پتھروں کے صنم تراشنے والوں کو فن کی خُدائی کا لقب دیا۔ اور ان کے فن کی بدولت مصر کو حیاتِ ابدی ملی۔ احساسِ خودی اور خود پرستی سے نہ ان عظیم فن کاروں کے دماغی توازن میں کمی آئی، نہ ان کے قوا میں اضمحلال پیدا ہوا۔ وُہ برابر ایسے جوہر تلاش کرنے کی دُھن میں لگے رہے جن کے وجود نے اُنھیں ساری دُنیا کے فنون پر برتری دی ہے۔ خود پرستی، خود اعتمادی اور عالی ہمتی نے انسانی عظمت کی بلند آہنگی کا دعویٰ بلند کیا۔ اور جلال و جمال کے امتزاج نے رُوح کی بالیدگی کو اتنا فروغ دیا کہ فن کا ہر دعویٰ شان و شکوہ، جاہ و جلال، پُروقار خدوخال، رجائیت، تمکنت اور جبروت کا دعویٰ بن گیا۔

فراعنۂ مصر کے خالق فن کاروں کے فنّی عرُوج اور بلند معیار کے مقابلے میں یُونانیوں کے بنائے اور تراشے ہُوئے مجسّے اپنے تصنع اور ادعائے فن کے لحاظ سے ہمہ اوست کا درجہ رکھتے ہوں۔ مگر ان میں زندگی کا وُہ جمالیاتی حُسن نہیں جسے مصری فن کاروں نے ملحوظ رکھا۔ اور جسے اپنا کر پتھر کے خداؤں کو حیاتِ ابدی بخشی۔ یُونانیوں نے اپنی فنی جسارت اور فلسفیانہ بصیرت سے کتنے ہی مُبالغے سے کام لیا ہو۔ اور اپنے مجسّموں کو جنّاتی ڈیل ڈول، پُرشکوہ جسامت، صحت مندانہ ہیئت اور جمالیاتی جلال و جمال کا کتنا ہی مکمل نمونہ بنایا ہو، لیکن مصر کے فن کاروں نے اپنی غیر معمولی ذہانت اور اعلےٰ شعُور سے اپنے آقاؤں کے کرّ و فرّ اور ادعائے خُدائی کے پیغام کو اپنے سنگین بُتوں کی کُشادہ پیشانیوں، کشادہ شانوں اور چوڑے چکلے سینوں پر اس طرح کندہ کیا۔ کہ وُہ آج بھی اپنے مسلک کا اعلان کرتے ہیں اور اپنے دعووں کو دُہراتے ہُوئے بلاخوف و خطر اُفق پر نگاہیں جمائے جُوں کے تُوں کھڑے ہیں۔ اُن کے بھاری بھرکم قدم دھرتی کے سینے پر اس مضبوطی سے جمے ہوئے ہیں

کہ زندگی کا ہر آگے بڑھتا ہوا قدم اور اُس کا ہر تازہ نقش ان کی عظمت وجبروت کے نقش کو زیادہ مستحکم اور زیادہ ابدی بنا رہا ہے۔

علاّمہ اقبال فنِ تعمیر کو ایک انسانی معجزہ خیال کرتے تھے۔ اُنھوں نے "جاوید نامہ" میں مصر کی تہذیب کے متعلق اپنے نظریے کی وضاحت بھی کی ہے۔ وُہ فراعنۂ مصر کی قوّت وہیئت کے قائل تھے۔ اور اس میں زندگی پرور اوصاف پاتے تھے۔ اُن کا خیال تھا کہ مصر کی سرزمین ابدیت کی تصویر ہے۔ اور اس کی بُنیاد قوّت و جبروت پر ہے۔ اسی قوّت و جبروت کے سہارے ہزاروں سال اپنی نگہداشت کرتے رہے۔ اور کوئی قوّت ان کے ارادوں میں حائل نہ ہو سکی۔ الاقصرا اور اہرام کا سلسلہ جو صحراؤں میں پھیلتا چلا گیا ہے اُن کے عظیم ارادوں کا مظہر ہے۔ دُنیا کی شاید ہی کوئی تہذیب اُن کے فنّی کمال کا مقابلہ کر سکے۔ ان کے قصور و ایوان اور ان کی عظمت و شکوہ کا ذکر کتابِ الٰہی میں بھی بڑے مؤثر طور پر آیا ہے۔ کیونکہ یہ سب کچھ اس کی بخششوں کا نتیجہ تھا۔ اس کے باوجود وُہ اپنی جبلّی سرکشی سے گمراہ ہو کر تنزّل اور تباہی کا شکار ہو گئے۔ اسلام نے دُنیا کو اس عذابِ عظیم سے نجات دلائی۔ احساسِ نفس اور رجائیت کا ایک نیا پیغام دُنیا کے سامنے پیش کیا۔ اور خدائی کا دعویٰ کرنیوالا فرعون انسانی عظمت کے سامنے سر جھکانے پر مجبور ہو گیا۔

اقبال کا ماضی کی طرف بار بار جھکنا یا نگاہ اُٹھانا بے مقصد نہیں۔ اُسے کسی بڑی دانش کی جُستجو تھی یا کسی ایسے انکشاف کی جو کائنات کا مظہر ہو۔ اُسے ماضی کے آئینے میں وہ سب کچھ نظر آتا تھا جس کی اُسے تلاش تھی۔ اُسکی نظر کے سامنے مردِ کامل کا نِتھرا ہوا پُر نور چہرہ تھا۔ مردِ مومن کے خدوخال تھے۔ اور اُن مجاہدوں کا خُون جنھوں نے انسانی اقدار کو دُنیا میں عام کرنے کی خاطر بڑی بڑی قربانیاں دی تھیں۔ وُہ چاہتا تھا کہ وُہ قوّتِ عمل رائیگاں نہ جائے جس سے انسان نے ترقّی کی بڑی بڑی منزلیں سَر کی تھیں۔ اِسی طرح جب وُہ کسی سُلطانِ عادل کی صُورت و سیرت کا تصوّر کرتا ہے۔ یا جب کسی صاحبِ تاج و تخت کی دریادلی اس کی نگاہوں میں پھر جاتی ہے۔ یا کوئی رازیؔ، رُومیؔ، سعدیؔ اور عُرفیؔ رُوح کی بالیدگی کا سامان فراہم کرتا ہے تو وجدان کی اہمیت اُس کی نظر میں بڑھ جاتی ہے۔ اقبالؔ کو فرعون اور موسیٰؑ دونوں کی پہچان تھی۔ وُہ ہمیشہ

ان عظیم ہستیوں سے ہم کلام نظر آتا ہے جن کے انمول الفاظ سے یہ جہاں آج بھی بارونق اور آباد ہے۔ وُہ اپنے تصوّر میں کبھی صحراؤں کے اندر گرد و غبار اُٹھتا اور غزالوں کو چوکڑیاں بھرتے دیکھتا ہے۔ اور کبھی قیسؔ کو لیلےٰ کے محمل کا پیچھا کرتے دیکھ کر مسکرا دیتا ہے۔ کبھی اُسے ستاروں کی چھاؤں میں چلتے ہوئے کاروانوں کی صدائے جرس گونجتی سُنائی دیتی ہے۔ اور حُدی خوانوں کے نغموں کی کبھی نہ ٹوٹنے والی جھنکار اُسے اپنی طرف متوجہ رکھتی ہے۔ انہی صداؤں سے اس کے نغموں کے کردار کی تشکیل ہوتی ہے۔ انہی سے اس کی تخلیق کے نقش و نگار اُبھرتے ہیں اور ان کے خدوخال تکمیل پاتے ہیں۔ کبھی یہ شاہین بن جاتے ہیں کبھی آہُو۔ کبھی یہ مجاہد کا رُوپ دھار لیتے ہیں اور کبھی ان کی سُرخی ساغر و مینا میں چھلک کر ہر طرف مستی بکھیرتی ہے۔ آرٹسٹ ہو یا شاعر وُہ سب کچھ اپنے ماضی سے منتخب کرتا ہے۔ تاکہ وہ مستقبل کا معمار کہلائے۔ اور لوگوں کے لئے فرعون اور خُدا کے درمیان تمیز کرنے کے پیمانے مہیا کر سکے۔

صدیوں کے تجربات کے باوجود دہریت اور سکُون پسندی نے ہر بار دُنیا کو قنوطیت کی طرف دھکیل دیا۔ اقبالؔ نے جا بجا اس جذبے کی خدمت کی ہے۔ اور شانتی اور سکُون کو تنزّل کا ذمّہ دار ٹھہرایا ہے۔ آج بھی ان اثرات کا کھوج عجم، ٹیکسلا، گندھارا، اجنتا، الورا جیسی عظیم یادگاروں سے ملتا ہے۔ اسلام نے اس عالمگیر جذبے کی خدمت کر کے دُنیا کو قنوطیت اور رہبانیت سے نجات دِلانے کی صورت پیدا کی۔ اور انسان کے سامنے نظامِ رُبوبیت پیش کیا۔ جس سے ابدی زندگی کا حاصل ہونا یقینی ہے۔ وُہ تمام مُوشگافیاں اور نکتہ چینیاں جن پر اقبالؔ کے کردار کی عمارت استوار ہے۔ ان کا واحد مقصد یہ ہے کہ فکرِ انسانی میں خودی، انانیت، رجائیت ارتقاء اور وسعتِ نظر پیدا ہو۔

علاّمہ اقبال نے ایک موقع پر سوال کیا تھا کہ عرب اور عجم کے فن میں تمھیں کیا نمایاں فرق نظر آتا ہے؟ یہ سوال کیا اور وُہ کمر کو سیدھا کر کے یُوں بیٹھ گئے جیسے مَیں ماضی کے فن کا کوئی بہت بڑا مبصّر ہُوں۔ وُہ الفاظ جن میں مَیں اپنی بات اس وقت ادا کر سکا، ان کا لبِّ لباب یہ تھا کہ وُہ تلوار جو عرب میں بالکل سیدھی تھی عجم تک پہنچتے پہنچتے اس میں خم آگیا تھا۔ اس میں لوچ لچک بھی تھی۔ وہ مرصّع بھی تھی۔ اور پھر دیکھتے دیکھتے

وُہ تلوار جو زندگی کی بلندیوں اور وسعتوں کی آئینہ دار تھی قنوطیت اور رہبانیت میں مدغم ہوکر میانوں کی زینت بن گئی۔

ہماری موجودہ بیداری مغرب کی مرہونِ منت ہے۔ ہم مغرب کے میکانی شور و شر سے دوچار ہیں۔ اگر ہم نے دوام و ثبات کا ذریعہ سمجھ لیا تو مشین کا انسان مشین اور ایٹم کی پرستش کرتا کرتا ختم ہو جائیگا اور اسے وہ دوام حاصل نہ ہوگا جس کی اقبالؒ نے بار بار تمنّا کی ہے۔ فراعنۂ مصر کا دعویٰ خداوندی کتنا ہی قابلِ نفرت ہو ان کی موت پُرعظمت موت اور اُن کی ہلاکت ایک بے مثل کردار کی موت تھی۔ یہ موت خودی کی بدولت آئی اور اُس نے اُنھیں دوام بخشا۔ ان پتھر کے مجسّموں سے ہر لمحہ یہ احساس پیدا ہوتا ہے کہ ان کی انانیت اور خود پسندی میں کتنا جذبہ تھا۔ وُہ اپنے مسخّر کردہ سکون کے باوجود اپنے مسلک اور اپنے دعووں کو فروغ دیے رہے ہیں۔ ان کے خدوخال اور اُن کے نقش فروغِ نظر کا سامان بھی ہیں اور اچھوتے خیالات اور انوکھے جذبات کی تخلیق کا محرّک بھی۔

انسان مغرب کا ہو یا مشرق کا، اس کی تخلیق کا موضوع، اس کے رنگوں اور خطوں کی لطافت بغرض اس کے ہر نقش کی تکمیل اور تشکیل کسی نہ کسی صُورت سے اس ملّت سے وابستہ رہی ہے جس سے اس کا رشتہ ہے طرزِ معاشرت اور اس کی روایات کا رشتہ اس نصب العین کے ماتحت ہوتا ہے جس میں اس نے جنم لیا ہے۔ اس لئے اس کا فرض ہے کہ وُہ اپنے معاشرے کی ثقافت اور اس کی انفرادیت کو گدلا ہونے سے محفوظ رکھے۔ یہ اس لئے بھی ضروری ہے کہ اس کی تخلیق کی رُوح اور اس کا قلب و جگر سخت کوشی اور بلند نظری سے حاصل ہوتا ہے۔ آرٹ مشرق کا ہو یا مغرب کا۔ ذہنی توانائی اور رُوحانی بلندی کا پیدا کردہ ہے۔ اس کے استحکام کیلئے تقلید کی روِش کے اختیار کرنے میں خطرہ ہی خطرہ ہے۔ تقلید انفرادیت کی موت ہے۔ یہ خیال کہ مشرق کی مصوری آج کے رجحانات اور زندگی کی ضرورتوں کو پورا نہ کر سکے گی۔ فرار، سہل ورزی، کم ہمّتی اور کمتری کا احساس ہے۔ ورنہ مشرقی مصوری مغل ہو یا ایرانی، ہندی ہو یا مصری، دُنیا کے فن میں ایک ایسا سنگِ میل ہے جس کا اثر مغربی فن کی ہر شاہراہ پر دکھائی دیتا ہے۔ مغرب نے مشرقی فنوُن کو اپنی تہذیب اور تمدن میں جگہ دی۔

اور معاشرے کو زندگی کے اس ہمیشہ روشن رہنے والے نُور سے منوّر کیا۔

ہر مذہب و ملّت اپنی اپنی علیٰحدہ جلالی و جمالی صفات رکھتا ہے لیکن جب کوئی قوم دوسری قوم سے متاثر ہوتی ہے تو کمزور قوم کے افراد کے چہرے پر زردی اور بدحواسی چھا جاتی ہے اور وُہ اپنی بدحالی اور احساسِ کمتری سے ان حوادث کا شکار ہو جاتے ہیں جو مطالعے کی کمی اور ذہنی پستی کا لازمی نتیجہ ہیں۔ ذہانت اور بصیرت کے باوجود فن کار غلامانہ ہچکچاہٹ سے دب کر ہاتھ پاؤں مارتا ہے اور اپنے دِل میں یہی سمجھتا ہے کہ اُس نے صدیوں کی غُلامی سے چھٹکارا حاصل کرنے کی واحد کوشش کی ہے۔ جب ایسے فن کاروں کو انکی کمتری اور فرار کا احساس دلایا جائے تو جھنجلا کر کہہ اُٹھتے ہیں کہ آخر ہمارے مشرق کی روایات میں دھرا ہی کیا ہے۔ اس کے برعکس جس قوم کو اپنے اُوپر اعتماد ہو وہ اپنے ماضی اور اس کی روایات کی تابندگی پر نگاہ ڈالتی ہے اور اپنی فطری بُلندیوں سے دوچار ہونے لگتی ہے۔ اس وقت مشرق و مغرب کا سوال اُٹھ جاتا ہے۔ اُس کے دِل میں صرف اُن اوصاف اور صلاحیتوں کا احترام جگہ پاتا ہے جو اُسے اپنی انفرادیت سے ہاتھ آتی ہیں۔

لینارڈو ڈونچی کی مونالیزا، رودان کا بلذاک، ریمران کا حضرت مسیحؑ کا تصور، رافیل کا میڈونا، روبنز کی وینس، مائیکل انجلو کا حضرت مُوسیٰؑ، گوگیں کی بالی والی حسینہ، فان گوگ کا ڈاکیہ، سیزان کی نہانے والیاں، ریناے کی بالکنی، میینے کی ہنا لولو، متیسّے کی کسبی، بوٹا چلی کی قاصدِ بہار اور الگریکو، ڈیئرر، اور ٹشین کے تخلیقی کارنامے جو مغربی مصوّری کے شاہکار ہیں، زندگی کے تلاطم اور اسرار کا عکس اور جلوہ ہیں۔ جب ابدیت کے یہ نقُوش تاریخ بن کر سامنے آتے ہیں، تو ہم یہ بُھول جاتے ہیں کہ اجنٹا، الورا، فراعنۂ مصر کی پُرشکوہ یادگاریں، اہرام، بابل اور نینوا کے کھنڈر بھی ہماری خوداعتمادی اور انفرادیت کے مظہر ہیں۔ ایرانی مغل اور کانگڑہ کی مصوّری اور ان کی برتری بھی محتاجِ بیان نہیں۔ اوتامارو کی محبُوب لڑکیاں اور قبلائی خاں کی کی شبیہہ زندہ جاوید تصویریں ہیں۔ فرخ بیگ قلماق، سیّد میر علی تبریزی، نادرالعصر اُستاد عبدالصّمد، گوردھن، بساون، انوپ چیتر، محمدی، میرک، قاسم علی، اُستاد رضا عبّاسی اور بہزاد جیسے اُستادوں کے سامنے مغرب کے بڑے بڑے مصوّروں کے سرخم ہیں۔ اقبالؔ کے ہاں ایسی زندہ جاوید نظمیں موجود ہیں جن کا مقصد

مشرق اور مشرقیت کو زندہ رکھنا ہے۔ مشرق کے بڑے بڑے عظیم انسانی کردار اس کی خودی کے رازدان ہیں۔ اس نے ان کرداروں سے اپنے اسلوب اور حکمت کو جلا دی ہے۔ جنھیں وُہ کسی طرح بھی اپنے فن سے جُدا نہ کرسکا۔ اپنے فکر سے وُہ ان راستوں کا تعین کرتا رہا۔ جو اس کے لئے موجب زندگی تھے۔ اُسے یقین تھا کہ مشین کی یہ دُنیا اور اس دُنیا کی ایجادات انسان اور انسانیت کی موت کا پیش خیمہ ہیں۔ یہی وجہ تھی کہ وُہ ہمہ تن مشرق کی تشکیل میں مصروف رہا۔ اور مشرق کے اعلےٰ کردار کو اس اندوہ ناک موت سے بچانے کی کوشش کرتا رہا۔

میری جدّوجہد بڑے والہانہ انداز میں اپنے مدّعا کا پیچھا کرتی رہی ہے۔ طُوفان کی شدّت اور مخالفتوں کے شور و شر سے کئی بار منجدھار میں ہاتھ سے باگیں چھُوٹ جانے کا گمان لاحق ہوا۔ لیکن احساسات کی حدت اور افکار کی کش مکش نے مقصد کو ہاتھ سے نہیں دیا۔ اور مسلسل جدّوجہد اور ایثار نے بالآخر کامیابی کی صُورت دِکھائی۔ بھُوک اور پیاس کا مقابلہ تو اتنا دُشوار نہ تھا۔ لیکن حالات کی رو کے سامنے مُدّعا کے حصُول کیلئے زندہ رہنا اور ان صلاحیّتوں نے جو کسی فن کی سلامتی اور اُس کے نصب العین کے لئے ضروری ہیں ساتھ نہ چھوڑا۔ آرٹ کسی تصادم کا محتاج نہیں۔ وہ اپنے خالق کا ترجمان اور معاشرے کی رُوح ہے۔ وُہ فطری رُجحانات اور ماحول کے زیرِ اثر پرورش پاتا چلا آیا ہے۔ جس کا بس ایک ہی مُدّعا ہے۔ زِندگی کی بقا اور زندگی کی پرورش۔ مطالعہ بتاتا ہے کہ قُدرت نے اس کے پھلنے پھُولنے میں کہاں تک مدد کی۔ اور کس قدر راہیں کشادہ کیں۔ ضرورتوں کے مدّنظر کیا کیا کروٹیں لیں۔ اور ارتقا نے کیا کیا صُورتیں اختیار کیں۔ تصویر شیطان کی ہو یا درویش کی۔ مرشد رُومی کی ہو یا اقبالؒ کی۔ دُخترِ حرم کی ہو یا مغل شہزادیوں کی۔ مغنّی کی ہو یا داستان گو کی۔ فروغِ دیدہ اور مطالعہ کی روشنی ہی میں کرداروں پر تبصرہ کیا جا سکتا ہے۔ اقبالؔ نے جن کرداروں کو بار بار سراہا ہے مَیں نے ان کی تکمیل اور تشکیل کے لئے مطالعے کی روشنی میں مواد جمع کیا۔ اور پُورے اعتماد سے انھیں رنگوں اور خطوں کے پیکر میں ڈھالا ہے۔ تاکہ اُنکی بقا مستقل بن جائے۔ جس طرح شاعر تشبیہوں کی جدّت اور استعاروں کی ندرت کو فکر کے اظہار کا ذریعہ بناتا ہے اور اپنے محبُوب کرداروں کے لئے اُبھرنے کے مواقع بہم پہنچاتا

ہے۔ اسی طرح ایک آرٹسٹ ترکیب، ترتیب اور استخواں بندی سے رنگوں اور خطوں کی حلاوت اور جذبات کی حدت سے اپنے کرداروں کی تکمیل اور تشکیل کرتا ہے۔ نطشے کا فوق البشر اقبال کے مردِ مومن سے کتنا ہی مختلف کیوں نہ ہو، وہ ایک دوسرے کے دوش بدوش ہیں ۔ وینس کا مجسمہ، مائیکل انجلو کا موسیز، بدھ کی مورتیاں اور مونالیزا اس لامتناہی سلسلے کی کڑیاں ہیں، جہاں آرٹسٹ اور شاعر کا اتصال ہوتا ہے۔ اور جہاں وہ اپنے اپنے معیار سے انسانوں کو ناپتے اور تولتے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ ایک آرٹسٹ کی نگاہ میں ایک اپاہج، ایک خواجہ اور ایک بھکاری کردار ہوں۔ لیکن یہ کردار اس قوم اور آرٹسٹ کے ہو سکتے ہیں جس نے غلامی، انحطاط اور قنوطیت کی آغوش میں پرورش پائی ہو۔ اور جس کے دل میں اپنے موقلم کو نجات کا ذریعہ بنانے کی فکر نہ کی ہو۔ لیکن حکیم الامت علامہ اقبالؒ جیسا عظیم فلسفی اور شاعر جس نے انسان کے جسم و روح کو غلامی کی زنجیروں سے بچایا ہو اور جس کی بالغ نظری نے اُسے پیغمبروں کی صف میں لا کھڑا کیا ہو۔ اس کا نظریۂ جمال جلالی صفات سے خالی نہیں ہو سکتا۔ میں نے بھی ایک آرٹسٹ کی حیثیت سے ہر ممکن کوشش کی ہے کہ اپنے فن کو جلال و جمال میں ڈبو کر فکر کی گہرائیوں سے آشنا کروں جس نے کائنات کو زندہ جاوید بنایا ہے۔

اقبال کے پیام میں نہ کوئی اُلجھاؤ ہے اور نہ ضد۔ اقبال سے لگاؤ رکھنے والا ہر شخص جانتا ہے۔ کہ انہیں ہر وقت ایسے وسیلے کی تلاش رہتی۔ جس سے موجودہ بے اطمینانی ختم ہو جائے۔ یا تخیل اور تخلیقی قوتوں کے امتزاج سے ایک ایسا جہان آباد ہو سکے۔ جہاں تخلیق سے بڑھ کر تخیل کی ثروت اور صلاحیتوں کی فراوانی ذہنی نشوونما کے سمجھنے اور پرکھنے کے کام آتی ہے۔ یہی ذہنی کشمکش انسان کو اپنی عظمت کا یقین دلاتی ہے۔ اور اس یقین کے بعد ہر طرف خود اعتمادی ہی خود اعتمادی نظر آتی ہے۔ ذہن کی وسعت ہی سے تخیل کے خدوخال نکھرتے ہیں۔ شعر، رنگ، الفاظ اور خط سب ذریعے ہیں۔ اس وجدان کو قریب تر لانے کے جو مذہب اور آرٹ دونوں کی جان ہے۔ الہامی کتابوں کے قصّے اور واقعات خواہ فن برائے فن یا فنِ محض کی تعریف پر پورے اتریں یا نہ اتریں۔ لیکن اُن کے سادہ الفاظ اور ان کا جامع اور بلیغ بیان اس طرح انسان کی ہدایت اور رہبری کا ذریعہ بنتا ہے۔ کہ ہزاروں سال گذر جانے پر بھی ان کی افادیت اور معنویت میں سرِ مو فرق

نہیں آیا۔ زندگی کے دوش بدوش آرٹ کو بھی اپنے ارتقاء کا جنون ہے مختلف ادوار میں یہ جنون مختلف شکلیں اختیار کرتا رہا ہے۔ اور یہ شکلیں تخلیق کے سانچوں میں ڈھل کر پہلے سے بھی زیادہ حسین اور زیادہ مقبول بن کر انسان کی طمانیت کا سامان مہیا کرتی رہی ہیں۔ صرف اس لئے نہیں کہ بربریت اور دہریت زندگی پر مسلط ہو کر نہ رہ جائے بلکہ اس لئے کہ انسانی اعتقاد و اعتماد اور زیادہ نکھر کر اور کشادہ تر اور وسیع تر سانچوں میں ڈھل کر انسان اور انسانیت کے لئے موجبِ تسکین بن سکیں۔ اور انسان جو ہزاروں سال گمراہی کی زندگی بسر کرتا رہا ہے پھر گمراہی کی طرف رُخ نہ کر سکے۔ اگر اقبالؔ اپنے مخصوص استدلال سے انسان کی زبوں حالی پر طنز و استہزا نہ کرتے تو عصرِ جدید کا انسان بدراہ ہو جاتا۔ اور خود اُس کا تصور اتنا دُھندلا پڑ جاتا۔ کہ ذہنی نشوونما اور ارتقاء کی راہیں محدود ہو جاتیں۔ ہر طرف ابہام چھا جاتا، انسان پھر طرح طرح کے گورکھ دھندوں میں اُلجھ کر رہ جاتا۔ اور زندگی کے استحکام کے امکانات ختم ہو جاتے۔

ہمارے فن کار کلاسیکی فن کی اصطلاح سے کچھ اس طرح گھبراتے ہیں جیسے دہریت مذہب سے لیکن کلاسیکی فن اور اس کی افادیت پر میرا ایمان ہے۔ اگرچہ میرے فن نے فن کی حیثیت سے ابھی وہ کلاسیکی رتبہ حاصل نہیں کیا جس کی نمائندگی کا میں متمنی ہوں۔ تاہم اس میں ہر جگہ ہماری اپنی شکل و صورت اور اپنے خدوخال کا عکس نمایاں دکھائی دیتا ہے اور کہا جا سکتا ہے کہ فرانسیسی چینی اور جاپانی آرٹ کی طرح میری تخلیق بھی اپنے معاشرے اور اپنی تہذیب کی ترجمان ہے۔ اور یہ میری خود اعتمادی کا کرشمہ ہے کہ میرا آرٹ اتنا ہی جدید اور جدید تر ہے جتنا کہ کسی اور قوم کے فن کو جدید یا تجریدی کہا جا سکتا ہے۔ میرے رنگ اور رنگوں کی ساخت میرے خط اور خطوں کا بناؤ اور میری تکنیک اور تکنیک کے طریق ایسے ہیں کہ اگر اُستاد بہزاد، میرک، گوردھن، انوپ چیتر، فرخ بیگ قلماق، رضا عباسی، خواجہ عبدالصمد، میر سیّد علی تبریزی جیسے باکمال لوگوں کو میرا آرٹ دیکھنے کا موقع ملے تو اُن کے لئے یہ کہنے کا محل نہیں ہوگا۔ کہ وُہ ایرانی اور مغل آرٹ کو جہاں چھوڑ گئے تھے، وُہ وہیں کا وہیں رُکا پڑا ہے۔ یا مشرقی آرٹ ترقی پذیر عناصر سے محرُوم ہے۔ یا ان تصویروں کے خالق نے معاشرے کی ضرورتوں سے فرار اختیار کر کے تخلیقی افکار سے مُنہ موڑا ہے۔ یا فن کے نئے تقاضوں اور نئی قدروں

کی طرف سے اپنی آنکھیں بند کر رکھی ہیں۔ مَیں نے جذبات کی توانائی اور مضامین کی فراوانی کے ساتھ ساتھ رنگوں خطوں اور تکنیک کے مُعاملے میں بھی رہبری کی ہر مُمکن خدمت انجام دی ہے۔ میرے فن کو کس کس نے دیکھا اور اس کا کس کس سے واسطہ پڑا۔ ہر مغربی جو آیا، سوزِ جگر، فروغِ نظر اور رموز و اسرار سے سرفراز نظر آیا میرا فن اندھی تقلید نہیں۔ خود فراموشی نہیں۔ یہ آزادیٔ فکر ہے۔ روشن ضمیری ہے۔ انفرادیت ہے۔ اس میں رُوحِ مشرق بیدار ہے۔ مَیں نے ذہن میں کبھی یہ تامّل پیدا نہیں ہونے دیا کہ کوئی قُوّت ان چشموں کو بند کر دے گی جن سے یہ روشنیاں پھُوٹ نکلی ہیں۔ اگر آج کے فنِ مطلق کو یا اس کے مجرّد آرٹسٹوں کو بائبل کے مذہبی کرداروں کو مصوّر کرنے کا حق حاصل ہے تو ہمیں بھی اپنے شاندار ماضی اور غیر فانی کرداروں کو فنی پیکر میں ڈھالنا جائز ہے۔

اقبالؒ نے جگہ جگہ عشق کے دوام اور ابدیّت اور وجدان کی ہمہ گیری اور جامعیّت کو کامرانی و سربلندی کا سرچشمہ بتایا ہے۔ لیکن ساتھ ساتھ اُنھوں نے عقل و شعور کی اہمیّت بھی تسلیم کی ہے۔ اُن کے نزدیک آرٹ محض جذبے اور تخیّل کے سہارے زندہ نہیں۔ اس کا تعلق براہِ راست عقل سے بھی رہا ہے۔ آرٹسٹ اپنی انفرادیت کا مالک ہے۔ مگر فرد کی حیثیت سے معاشرے کے مطالبات کو پُورا کرنا بھی اس کے فرض میں شامل ہے اس پر طرح طرح کی ذمّہ داریاں عائد ہوتی ہیں۔ اس کے لئے ممکن نہیں کہ وہ ان ذمہ داریوں سے بھاگے۔ اور ان فرائض سے چشم پوشی کرے۔ ان ذمّہ داریوں کو پُورا کرنے اور ان فرائض کو ادا کرنے سے اس کی صلاحیتیں اُجاگر ہوتی ہیں۔ اور اس کا عمل مُلک اور قوم کی خدمت کا ذریعہ بنتا ہے۔ فن اسی طرح پرورش پاتا ہے۔ اِسی طرح پروان چڑھتا ہے۔ اور اس طرح اپنے صحیح مقام اور مدارج سے دوچار ہوتا ہے۔ کہ پُوری قوم اس سے آشنا ہو۔ فرد کا فن اسی طرح زندہ رہتا ہے۔ کہ جماعت میں اسے پہچاننے اور اس کی داد دینے کی صلاحیت پیدا ہو۔

شاعرِ مشرق کی پُوری عُمر مغرب پرستی کے خلاف جہاد میں گذری۔ میرا جہاد بھی اسی بُت پرستی کے خلاف ہے۔ جس نے ہماری صلاحیتوں کا گلا گھونٹ کر رکھ دیا ہے۔ انھیں بے جان کر دیا ہے۔ مغرب پرستی نہ صرف ہماری قدروں کو مجروح کیا، اور نہ صرف نئے خد و خال کی تشکیل کے راستے مسدود کئے۔ بلکہ اُس نے

ہمارے ان نظریوں کو بھی بدل ڈالا ہے جو ہمارے معاشرے کی بقا کے ضامن تھے۔ ہم سمجھتے تھے کہ ہمیں چٹانوں سے ٹکرا کر اور پہاڑوں کو کاٹ کر اپنی راہیں نکالنی ہیں۔ اور جلالی اور جمالی اوصاف کو ملا کر اثر آفرینی کرنی ہے لیکن مغرب ہمارے ان تصورات کو بدل رہا ہے میرا جہاد مغرب کے اسی مُہلک اثر کے خلاف ہے میری مشرق پرستی اسی جہاد کا پر تو اور عکس ہے میری مشرقیت نے ایک ایسی انفرادیت کو جنم دیا ہے جس کا مرکزی تصور اپنی سلامتی کے علاوہ اپنے تقاضوں اور اپنی صلاحیتوں کو اپنے ہی خونِ حیات سے از سرِ نو سینچنا ہے اِسی لئے فطرت اپنے کرداروں اپنی طرزِ نگارش اور فنّی مسلک و مشرب میں مَیں مشرقی خصوصیات کا علمبردار ہُوں میرے کرداروں میں زندگی کا سوز و ساز، رمز شناسی، خون کی حدّت اور سخت کوشی مقدّم ہے۔ حیاتِ نو، ذِمہ دار مائیں، مجاہدوں کی بیٹیاں، شاہین صفت محبُوبائیں، جو میرے فن کا موضوع ہیں، زندگی کی اعلیٰ نعمتوں سے بہرہ وَر ہیں۔ جس طرح اقبالؔ کے نغموں میں مزدُوروں، سُلطانوں اور عام انسانوں کی آرزُوئیں سُنائی دیتی ہیں۔ یہی رُجحانات اور مسائل میری تصویروں کے سانچے میں ڈھلتے ہیں۔ اِنہی نے بخششوں اور صلاحیتوں کا سُراغ ملتا ہے۔ اور انہیں سے وہ خود آگاہی جنم پاتی ہے جو معاشرے کو اعتماد بخشتی ہے۔ اعصابی بیماریاں ہمیشہ جنسی کمزوریوں سے پھیلتی ہیں نسلیں کمزور ہوتی چلی جاتی ہیں۔ فرد اور افراد دونوں نسل کُشی کا شکار ہو کر سب کچھ کھو بیٹھتے ہیں۔ فنِ محض، جدید ہو یا قدیم ان تمام متعدّی بیماریوں کا واحد علاج ہے۔ اس سے تہذیب، تمدّن، اور انسانیت کی پرورش ہوتی ہے۔

فن کے لئے یہ بھی ایک اندوہناک تصور ہے کہ ہمارا ماضی اپنی روایات سمیت ہمارے تجریدی اور مجرّد آرٹ میں چُھپا بیٹھا ہے۔ فنِ مطلق میں ایرانی مغل اور کانگڑہ کی مصوّری کے نشانات اور اثرات موجود ہیں۔ یا یہ کہ ہمارا موجودہ آرٹ ہمارے ماضی اور اس کی روایات سے متاثر ہے جو صدیوں تک ہمارے دِلوں پر حکُومت کرتا رہا ہے۔ موجودہ انتشار ہمارے قومی کردار پر ایک ضرب کاری ہے۔ خام پیداوار کے زہریلے اثرات نے حُسن و قبح کی شناخت کی قوّتوں کو شل کر دیا ہے۔ اعتماد اور قوّتِ فیصلہ کو خود فریبی کے ایسے سانچوں میں ڈھال دیا ہے کہ انسان کی بصیرت خطرے میں پڑ گئی ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو ہر ذوقِ نظر انسانیت سے محروم رہتی۔ اور

زندگی خودکشی کے مترادف سمجھی جاتی۔

آرٹ انسانیت کے سامنے ایک مخلصانہ اپیل ہے میری یہ اپیل اجارہ داری نہیں متاع زندگی ہے اور یہ متاع زندگی ہی ایک ذریعہ ہے جس سے زندگی کو تسخیر کرنا ہے خونِ جگر کی آمیزش سے آج کے انسان کو مطلق العنانی سے بچانا ہے۔ اپنی انفرادیت اور اپنی مشرقیت کو اپنے تخیل اور تخلیق سے مستحکم کرنا ہے کہ کوئی طبقہ اس نعمت سے محروم نہ رہ جائے اور ہم انسان کہلائیں اور ایک زندہ قوم جس کے خزانے جمال و بصیرت کی دولت اور ثقافتی قدروں کے جواہر سے معمور ہیں۔

آرٹ ہمارا ورثہ بھی ہے اور ترکہ بھی۔ اور یہ ورثہ اور ترکہ اس قوم کا حصہ ہے جس کے افراد بیدار ہوں ؎

اے اہلِ نظر ذوقِ نظر خوب ہے لیکن
جو شے کی حقیقت کو نہ دیکھے وہ نظر کیا

مقصودِ ہنر سوزِ حیاتِ ابدی ہے
یہ ایک نفس یا دو نفس مثلِ شرر کیا

شاعر کی نوا ہو کہ مغنّی کا نفس ہو
جس سے چمن افسردہ ہو وہ بادِ سحر کیا

بے معجزہ دنیا میں اُبھرتی نہیں قومیں
جو ضربِ کلیمی نہیں رکھتا وہ ہنر کیا

محمد عبدالرحمٰن چغتائی ۵۵ء
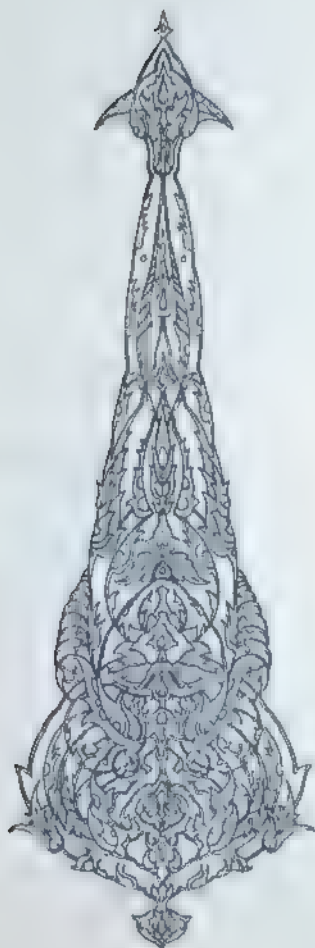
ACKNOWLEDGEMENT
PHOTOGRAVURE AND ALL COLOUR WORKS ENGRAVED AND PRINTED IN ENGLAND
ORIENTAL SCRIPT AND OTHER MATTER PRINTED WITH THE WHOLEHEARTED CO-OPERATION OF NISAR ART PRESS

بسم اللہ الرحمن الرحیم

دعای زبور

یارب درون سینه دلِ باخبر بده
در باده نشه را نگرم آن نظر بده

این بنده را که با نفس دیگران نزیست
یک آه خانه زاد مثالِ سحر بده

سیلم مرا بجوی تنک مایه مپیچ
جولانگهی بوادی و کوه و کمر بده

سازی اگر حریف یمِ بیکران مرا
با اضطرابِ موج سکونِ گهر بده

شاهینِ من بصیدِ پلنگان گذاشتی
همت بلند و چنگل ازین تیز تر بده

رفتم که طائرانِ حرم را کنم شکار
تیری که نافگنده فتد کارگر بده

خاکم بنورِ نغمهٔ داؤد برفروز
هر ذره مرا پر و بالِ شرر بده
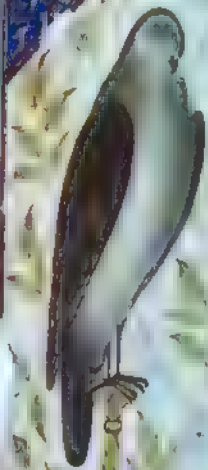
اقبال

عملِ چغتائی

علامہ اقبال کا مصوّر ایڈیشن

یہ تصویریں نہ محض ہنگامی ہیں اور نہ محض جذباتی ۔ یہ خونِ جگر اور جُوئے شیر کا کرشمہ ہیں۔ ان کے خدوخال ، بلند نگاہی سے حاصل کئے گئے ہیں ۔ ان میں جلال و جمال کی نمود بھی ہے ۔ حُسن وعشق کی جولانیاں بھی اور بصیرت اور خود نمائی کے جوہر بھی ۔

ہر مذہب و ملّت کے فن کاروں نے اپنے تہذیبی ورثے سے نشوونما کی نئی راہیں نکالی ہیں ۔ ان خطوں اور رنگوں کے حصول کے لئے جس سے ثقافت کی کہانی تکمیل پاتی ہے ۔ اضطراب انگیزی اور جستجوئے پیہم کی رہنمائی اور گرہ کشائی لازمی ہے ۔ رنگوں اور خطوں کا امتزاج فنّی شعور کا اظہار ہے ۔ اس فنّی شعور کے بعد جو فن کار اپنے نصب العین پر قائم رہا اور اس شعور کو خلوص اور دیانت کے ساتھ تجربے کی کسوٹی پر کستا رہا ۔ جو خود اعتمادی کے ساتھ زندگی کی الوہیّت کو نمایاں کرنے کے لئے ضروری ہے ۔ ثقافت کی اس کہانی کی تکمیل میں اس کا بڑا حصّہ اور اعلیٰ مقام ہے ۔

یہ تصویریں ورثہ بھی ہیں اور ترکہ بھی ۔ چغتائی کی تصویروں میں کبھی اس قدر اجنبیت تھی کہ دیکھنے والے دیکھتے اور اُن کے لبوں پر سکوت کی مُہر ہوتی ۔ جب وُہ گمنامی کے اندھیروں سے نکل کر شہرت کے زینوں پر چڑھنے لگا تو لوگ اس کی صداقت کی تلاش میں سرگرداں ہُوئے ۔ اس میں ہر مذہب و ملت کے لوگ شامل تھے شرُوع میں اس کے اپنے انتخاب میں دھندلکے تھے ۔ شروع میں اُس نے زیادہ حسین اور جامع بنانے کے لئے جن شکلوں اور کرداروں سے کام لیا وُہ خود اس کے سوچ بچار سے دُور تھیں ۔ اپنے جنون کی رَو میں دیکھتے ہی دیکھتے وُہ صحراؤں کے گرد وغبار میں جا پہنچا ۔ اور اس جستجو میں لگ گیا کہ جذبۂ شوق اس عمل کو پالے جس کا صحراؤں سے گُذرنا یقینی ہے ۔

موجودہ ایڈیشن میں جو راہیں اختیار کی گئی ہیں اُن کی رُو سے صرف اُن شعروں کو اشاعت کا حق پہنچتا تھا جو رنگوں اور خطوں کے سانچے میں ڈھل سکتے تھے۔ تصویروں پر نوٹ لکھے گئے ہیں۔ وُہ کچھ ایسی شکل اختیار کر گئے ہیں کہ چغتائی کے فن پر اچھا خاصا مواد جمع ہوگیا ہے۔ اور اُن کی روشنی میں نظرِ بصیرت کیلئے یہ دیکھنا آسان ہے کہ چغتائی اگر ہندوستان میں جدید ہندوستانی آرٹ کا نمائندہ تھا تو پاکستان میں وُہ پُورے مشرق کا نمائندہ ہے۔

ایک تصویر کئی شعروں، غزلوں اور نظموں کے پیمانے سے ناپی جاسکتی ہے۔ تصویر اور شعر کی خوبی یہی ہے کہ معیار پر پُورے اُتریں ؎

ہر چند کہ ایجادِ معانی ہے خدا داد
کوشش سے کہاں مردِ ہُنر مند ہے آزاد
خونِ رگِ معمار کی گرمی سے ہے تعمیر
مے خانۂ حافظ ہو کہ بُت خانۂ بہزاد
بے محنتِ پیہم کوئی جوہر نہیں کھلتا
روشن شررِ تیشہ سے ہے خانۂ فرہاد

دم چیست پیام است شنیدی نہ شنیدی
در خاک تو یک جلوۂ عام است نہ دیدی
دیدن دِگر آموز شنیدن دِگر آموز
چون شعلہ بہ خاشاک دو دیدن دِگر آموز

داستان گو

یک نظرہ آن گوہرِ نابے نگر
تاج را در زیرِ مہتابے نگر

اقبال

داستان گو

عظمتِ آدم خالق کی دین ہے اور یہ انسان کی سعادت ہے کہ وُہ رفعتِ تخیل اور کسبِ کمال سے اپنے آپ کو خالق کی بخششوں کا حقدار ثابت کرے۔ مُغلوں کے ذوقِ نظر اور شکوہِ فکر کی یادگار تاج محل اُن کے جمالیاتی تصور اور اقدارِ حیات کی درخشاں تعبیر ہے ؎

یک نظر آں گوہرِ نابے نگر
تاج را در زیرِ مہتابے نگر

چغتائی کی یہ تصویر علامہ اقبالؒ کی توجہ کا مرکز رہی ہے اور ان تصویروں میں سے ایک ہے جو چغتائی نے علامہ اقبال کی حیات میں تخلیق کیں۔ یہ داستان گو اسلاف کی داستانِ عظمت کو یُونہی دُہراتا اور اس بات کی یاد دلاتا رہیگا کہ یہ لازوال یادگار تاج محل ہماری جمالیاتی قدروں اور انسانی عظمت کا ایک ایسا آہنگ ہے جس سے فرد اور جماعت دونوں کا رتبہ بلند ہوتا ہے۔

تصویر کی رنگ آمیزی سے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے آرٹسٹ نے چاند کی چاندنی اور سنگِ مرمر کی سفیدی کے حسین امتزاج سے اس کی تشکیل و تکمیل کی ہے۔ اس میں لطافت اور دلکشی کو یوں سمو دیا گیا ہے کہ خطوں اور رنگوں میں حرکت و کیف کے علاوہ ذوقِ مخلصانہ ولولہ محسوس ہونے لگتا ہے کہ جس سے اس عظیم الشان عمارت کی بنا ڈالی گئی تھی۔ تصویر ستخواں بندی ترتیب اور طرزِ نگارش کی رُو سے مشرقی مصوری میں ایک عدیم النظیر حیثیت رکھتی ہے۔ سکون پرور کیفیت، رفعتِ تخیل، جلال و جمال کی تابندگی یہی مسحُور کُن ہے جیسے داستان گو بڑے اعتماد سے ایک نئے تاج محل اور اُس کے خالق کے فنی ادراک کی داستان سُنا رہا ہے اور یہ بھی کہہ رہا ہے کہ انفرادیت ہمیشہ منتہائے مقصود کا پیچھا کرتی ہے اور نئی نئی آرزوئیں اور راہیں پیدا کرکے اُن کیلئے سرگرمِ عمل ہوتی ہے۔

چغتائی نے یہ شاہکار ۱۹۲۷ء میں تخلیق کیا تھا۔ جب یہ تصویر ہندوستان کی مختلف نمائشوں میں پیش کی گئی تو اسے طلائی تمغہ جات اور گراں قدر انعامات سے نوازا گیا۔ نقادانِ فن نے اس کی توصیف و ستائش میں رطب اللسان ہوکر کہا کہ چغتائی کی اس تصویر نے ہندوستانی آرٹ میں ایک نئے دور کا آغاز کیا ہے۔ اس کے فنی انہماک اور اسلوب نے فن کی عظمت کے ساتھ آرٹسٹ کی شخصیت کو بھی ایک نئے انداز سے اُجاگر کیا ہے۔ یہ چغتائی کی امتیازی خصوصیت ہے کہ اُس نے مشرقی انا اور اپنی تہذیبی اقدار کا ساتھ کبھی نہیں چھوڑا۔

اقبالؒ کی شاعری میں انفرادیت اور کردار کی تشکیل کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ چغتائی کے فن کا پیغام اور نصب العین بھی یہی ہے کہ وہ اپنے سرکردار سے خودی کا وجود تیار کرے۔ اس کی انفرادیت مسلمہ ہے۔ وہ زندگی کی دُشواریوں سے عہدہ برآ ہونے کے لئے ایک موثر نظام کا حامی ہے۔ اس کی فنی صلاحیتوں سے پتہ چلتا ہے کہ وُہ کس حد تک اپنے موضوع پر قادر ہے۔

کہ کس حد تک اقبال اور اس کے نظریات میں اشتراک اور ہم آہنگی ہے۔ چغتائی اُن فن کاروں کے گروہ سے ہے جنھوں نے ساحل سے بے نیاز ہو کر گرداب کی متلاطم موجوں سے کھیل کر ساحل کا لطف اُٹھایا ہے۔ اُس کے اپنے الفاظ میں شاہجہان نے ممتاز محل کی یاد میں جس قدر آنسو بہائے تاج محل اُن آنسوؤں میں سے ایک آنسو ہے جو منجمد ہو کر رہ گیا ہے ؎

از محبّت جذبہ ہا گردد بلند
ارج می گیرد ازو نا ارجمند

تاج محل شاہجہان اور ممتاز محل کی داستانِ محبت کو یونہی دہراتا رہے گا۔ اس دردِ دل، آرزو اور پُرآشوب آنسوؤں کی سمت جن کو آرٹسٹ کے وارداتِ قلب نے رنگوں میں نمایاں کیا ہے جس کے پیچھے ہزاروں حقیقتیں کروٹیں لیتی اور اَن گنت دھڑکنوں کے سانس سُنائی دیتے ہیں۔ سنگِ مرمر کی سفید سفید سلوں کے گرداب میں اس کے خالق شاہجہان نے ایک فرد کی حیثیت سے یہ کہہ کر ہندوستان کو جنّت نشان بنا دیا تھا ؎

اگر فردوس بر رُوئے زمین است
ہمین است و ہمین است و ہمین است

فنِ تعمیر کا یہ معجزہ آج بھی اصحابِ نظر کی بلند نگاہی کا کرشمہ زندہ و تابندہ اور اس اضطراب اور سوز و ساز کا آئینہ دار ہے جن کی بدولت ہنر شناسی اور ہنر پروری اپنے عروج کی دعوے دار ہے۔ چغتائی نے رنگوں اور خطوں کی تسخیر کے ذریعے تہذیب و تمدّن کو افکار کی نئی راہ اور نیا سرچشمہ بنا دیا ہے ؎

ترا جلال و جمال مردِ خُدا کی دلیل
وُہ بھی جلیل و جمیل تُو بھی جلیل و جمیل

مردِ خُدا کا عمل عشق سے صاحبِ فروغ
عشق ہے اصلِ حیات موت ہے اس پر حرام

مرمرش ز آبِ روان گردندہ تر
یکدم آن جا از ابد پائندہ تر

عشقِ مردان سرِّ خود را گفتہ است | سنگ را با نوکِ مژگان سفتہ است

THE STORY TELLER

Observational contrast between history and imagination, the melody of silence encompasses the solitude of the Taj-Mahal.

There is an assurance of Chughtai's genius achieving a personal style and technique through which he expresses impressionistic form. This style is characterised by vigour of colouring and a new aesthetic.

Chughtai is the pioneer of this style in the East. People say, he is the master of colours and loves yellow colour immensely. As a matter of fact he loves neither red nor blue nor yellow. He treats all colours with the sense and strength of a master, for he has an extraordinary knowledge of colour scheme and its treatment. This has given him international fame.

His handling of the composition is particularly remarkable. The colour scheme is marvellous, fresh and unique.

"THE TAJ-AGLEAM IN THE LIGHT OF THE MOON,
ITS MARBLE RIPPLING LIKE A FLOWING STREAM,
EACH RIPPLE A WAVE OF ETERNITY.
A MAN'S LOVE HAS EXPRESSED ITSELF IN IT.
STRINGING THE STONES TOGETHER WITH THE THREAD
OF HIS EYELASHES AS IF THEY WERE PEARLS."

IQBAL

جہانِ رنگ و بُو

ریاضِ ہستی کے ذرے ذرے سے ہے محبت کا جلوہ پیدا
حقیقتِ گل کو تو جو سمجھے تو یہ بھی پیاں ہے رنگ و بو کا

اقبال

جہانِ رنگ و بو

نظریہ سے کہیں زیادہ صلاحیتوں کا اظہار اور عمل کی کارفرمائی فن کار کے کام آتی ہے۔ نظریہ کتنا ہی بلند اور اسکی اہمیت کتنی ہی اہم ہو فن کار کو ہر قیمت پر مواد کی اہمیت سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ ورنہ اُسے اس بات کے اظہار کی ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ اس نے اپنے نظریے کو سمجھنے اور پیش کرنے میں کہاں تک ہنرمندی سے کام لیا ہے۔ کہ تصویر، نظم اور غزل ہوتے ہوئے بھی مصور کی نئی زبان میں ڈھل گئی ہے۔ مترنم الفاظ کا تسلسل، رنگ آمیزی کا امتزاج خطوں کا سُلجھاؤ، ترتیبی اجزا کی کشش مضمون کی بندش ایک قوس قزح ہے تصویر مجموعی کیفیتوں کا ایک لامتناہی سلسلہ ہے۔ آرٹسٹ کو ان شاہراہوں سے گذرنا ہی پڑتا ہے۔ وہ کسی قیمت پر بھی ان سے پہلوتہی نہیں کرسکتا، کیونکہ یہی چیزیں ہیں جن سے تصویر کی تحریک تکمیل پاتی ہے۔

آج اگر پکاسو کی مثال لی جائے تو وہ سب سے بڑا بت شکن سمجھا جاتا ہے۔ مگر وہ بُت شکن ایک بُہت بڑا بُت بھی ہے کیونکہ اس کے مدعا کی پرستش ہر طرف کی جارہی ہے۔ اس کے مدعا و حقائق کی تلاش میں اس کے مقلدوں اور پیرودں نے پُوری دیوانگی اور ذہانت سے اس کا پیچھا کیا ہے اور سمجھنے کی کوشش کی ہے کہ مرشدِ مطلق نے اپنے ہتھیاروں کو کام میں لانے کے لئے کیا صُورتیں اختیار کی ہیں۔ اس کے برخلاف علّامہ اقبال نے وقت اور اس کی ضرورتوں کا جائزہ بڑی بلند نگاہی سے لیا ہے اور تقلید کرنے والوں سے کہا ہے کہ تقلید کی روش خودکشی کے مترادف ہے۔

مغرب پرستی نے محض ہمارے معاشرے اور اقتدار پر ہی قبضہ نہیں کیا بلکہ ہماری تقلیدی روش نے ان صلاحیتوں کو بھی جھٹلانے کی کوشش کی ہے جو ہمیں وراثتاً اور روایتاً حاصل ہیں۔ ہماری اِس بے راہ روی نے ہمیں اس طرح گرداب میں لے رکھا ہے کہ ہمارا شعور اور عشق متزلزل ہے۔ کورانہ تقلید ہمیں اس گمراہی پر تنقید کرنے کی اجازت نہیں دیتی۔ مجرد آرٹ اور اس کے زہر آلود اثرات نے اپنے حدُود سے اس قدر تجاوز کرلیا ہے کہ پود کی پود ان زہر آلود اثرات اور رجحانات کا لقمہ بن چکی ہے۔ ور معاشرے کا سیاہ و سفید ایک وبہ ایک ناقابلِ فہم گورکھ دھندا بن کر ہمارے لئے اُلجھن کا سبب بنا ہُوا ہے۔

چغتائی محض جدید طرزِ نگارش کا ہی علمبردار نہیں وہ نئی تکنیک کے تجربوں کا فن کار ہے۔ اس نے دورِ احیاء کے عظیم فن کاروں، مغل اور ایرانی اُستادوں سے بھی استفادہ کیا ہے۔ اُس نے مجرد اور تجریدی آرٹ کا بھی مطالعہ جی بھر کر کیا ہے اس نے جنتا کی انفرادیت کو خوب سمجھا ہے۔ اس کے شاہکاروں میں مشرقی مصوری کے ہر دور کی جھلک نظر آتی ہے۔ اسکی اُفتاد اور بیداری میں زندگی کا وہ سوز و ساز موجود ہے جس سے اسکے معاشرے کی نگہداشت ہوتی ہے۔ یہ تصویر مغل آرٹ نہیں بلکہ

مغل کلچر کا جائزہ، مغل تاثرات کا اثر ہے جس سے آرٹسٹ نے ایک ایسا جہان آباد کر دکھایا ہے جس میں آرزوئیں مچلتی اور پرورش پاتی ہیں۔ جہاں رنگ و بو ہے۔ اک نوخیز فضا ہے جس میں انفرادیت، پُر محبوبانہ زندگی اور انبساط و نشاط کا اظہار کر رہی ہے۔ چغتائی نے اپنے رنگ و بو اور اپنی تخلیق سے اسے وہ پُرکیف تکمیل بخشی ہے کہ یہ جستجوئے عشق اور حسن کی جستجو نظر آتی ہے نوخیز اور اچھوتے رنگ کہ تصویر کی سطح پہ نگاہ پڑتے ہی جہانِ رنگ و بو آباد ہو جاتا ہے۔ یہ جہانِ رنگ و بو اس قدر دلکش اور حسین ہے کہ نگاہ واپس لوٹنے کا نام نہیں لیتی۔ کلچر اور روایات کو نظر انداز کرتے ہوئے بھی فنی انہماک معطر اور شاداب کیفیتوں میں وہ کیف اور وہ آہنگ پیدا کر دیتا ہے کہ زندگی کے کسی اسلوب کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

دورِ حیات کے عظیم مصوروں نے جہاں مذہبی روایات کا تحفظ کیا اور ان میں زندگی کی روح بھری ہے۔ ان کے پہلو بہ پہلو وقت کی شخصیتوں اور بڑے بڑے اہم کرداروں کو بھی روشناس کرایا ہے جن کے تصور سے انسان کا قلب و جگر آج بھی گرما اٹھتا ہے۔ چغتائی آج کا انسان ہے۔ اس میں آج کے تقاضوں کو سمجھنے کی صلاحیتیں موجود ہیں۔ اسے بھی روزمرہ کے واقعات سے دوچار ہونے کا موقع ملتا ہے۔ اس کے افسانے اس کے مضمون اور تصویریں زندگی بہ زندگی پکارتی نظر آتی ہیں۔ میں نے کہا اس اشاعت میں ایک دو پنجابی تصویریں بھی نظر آ جاتیں تو اور بھی اچھا ہوتا۔ وہ مسکرایا، ہونی تو چاہئے تھیں مگر لے تو حجازی ہے مری ؎

در چمن قافلۂ لالہ و گل رخت کشود
از کجا آمد اند این خونین جگران

مثال لالہ فتادم بگوشۂ چمنے
مرا ز تیرِ نگاہے نشانہ بر جگر است

محفلِ قدرت ہے اک دریائے بے پایانِ حسن
آنکھ اگر دیکھے تو ہر قطرے میں ہے طوفانِ حسن
چشمۂ کہسار میں دریا کی آزادی میں حسن
شہر میں صحرا میں ویرانے میں آبادی میں حسن

THE FRAGRANCE

This picture is a fine and rare achievement of the artist. He has depicted the subject with exquisite success and mastery. It is an instance of Chughtai's artistic sense which enables him to produce colour harmony, rhythm of lines and tones. A subtle precision of design is the characteristic feature of all the paintings of Chughtai, but this painting is one of the best he has painted. It has been painted from an unusual angle and has essentially as its elements a mystical Eastern figure, pious, and sitting majestically alone in the calm atmosphere with the rosy pink drapery spreading over the space as a huge fan.

This is undoubtedly one of Chughtai's masterpieces.

"SHE TURNED INTO A WAVE OF FRAGRANCE AND SPROUTED FROM THE TWIG OF THE ROSE-PLANT,

AND SET FOOT IN THIS WISE INTO THE WORLD OF YESTERDAY AND TOMORROW.

SHE OPENED HER EYES, BECAME A ROSE-BUD AND SMILED A WHILE,

BECOME A FLOWER AND SHED ITS PETALS AND FELL TO THE EARTH.

THAT BEAUTIFUL ONE WHOSE FEET HAVE BEEN UNFET-TERED, HAS LEFT US A SIGH—WE CALL IT FRAGR-ANCE.

IQBAL

غلام لڑکی

من بسیائے غلاماں فرِ سلطاں دیدہ ام
شعلۂ محمودؔ از خاکِ ایازؔ آید بروں

اقبال
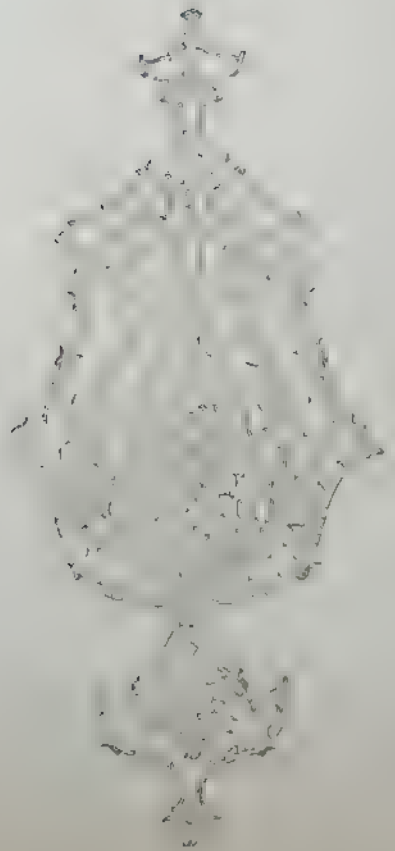
غلام لڑکی

چغتائی کی یہ تصویر اس دور کی یادگار ہے جب اس کے تجربے روز افزوں مطالعہ کی روشنی میں کروٹیں لے رہے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ چغتائی نے یہ تصویر بناتے وقت فنی انہماک اور تکنیک کی پختگی کے ساتھ ان تقاضوں کو بھی ہاتھ سے جانے نہیں دیا جن سے فن کا وقار اور افتخار ابھرتا ہے اور ذہنی وسعتوں کو اس بصیرت کا سامنا کرنا پڑتا ہے جس سے غلام کو اپنی غلامی میں شک کی گنجائش نہیں رہتی۔ مترنم رنگوں کی ہم آہنگی اور خطوں کے لوچ لچک سے توانائی پیدا کرنا آرٹ کا کرشمہ ہے۔ اس سے روح کو انبساط اور جذبات کو سہارا ملتا ہے۔ یہ غلام لڑکی جو چغتائی کی تخلیق ہے اس بصیرت سے مالا مال اور کلچر کا جزوِ عظیم ہے جس سے خود آگاہی اور عظمت کا اعتراف ہوتا ہے۔ روح کی پاکیزگی، صورت اور سیرت کا توازن اور رنگوں کی اجنبیت سازِ دلبری بن گئی ہے۔ یہ غلام لڑکی ان مہوش محبوب غلاموں کا تصور پیش کرتی ہے جن کا تعلق فراعنۂ مصر، خلفائے بغداد اور محمود جیسے عظیم سلطان سے رہا ہے۔

خوبصورت ہاتھوں سے پاپوش تھامے، لرزتے ہوئے ہونٹوں سے زیرِ لب کچھ کہتی، سرخ و سیاہ رنگ کی مٹی میں رنگی ہوئی، یہ پُرعظمت غلام لڑکی محبوبانہ انداز میں اپنی چہیتی ملکہ کے روبرو اپنی سنجیدگی کا تقاضا کر رہی ہے۔ اس کی صورت اور سیرت، نگاہ کی ہلکی سی جنبش ایوانوں میں ہیجان پیدا کر دیتی ہے۔ وہ اپنے گرمائے ہوئے قلب و جگر کی حدت میں اس قوم کی نمائندہ ہے جن کا سرمایۂ حیات ابھی خام ہے۔

یہ پیکر اگر غلام لڑکی کا ہے تو اس میں انا اور بیداری بھی ہے۔ وہ سنجیدگی اور متانت سے بھی بھرپور ہے۔ اس میں وہ مصلحت بھی ہے جن کی بناء پر وہ خوابِ گراں سے اٹھکر، ان تاریک راہوں سے گزر کر ایسی فضا میں آن کھڑی ہوئی ہے جہاں تمیزِ بندہ و آقا اور اسود و احمر کا امتیاز باقی نہیں رہا۔ حاکم اور محکوم دونوں ایک دوسرے میں مدغم ہو گئے ہیں۔

چغتائی نے اس غلام لڑکی کے چہرے کی تراش شبیہ نگاری کے کمالِ فن اور اس جذبے کے زیرِ اثر کی ہے۔ جو اس کے فن کا طرۂ امتیاز ہے۔ ایسا نظر آتا ہے چغتائی وہ واحد آرٹسٹ ہے جس نے ہربار اپنے کردار کی تلاش میں نئے چہروں، نئے خدوخال اور ایسے ماحول کی جستجو کی ہے کہ اس کی اپنی انفرادیت کے ساتھ کردار کی انفرادیت کی اہمیت بھی بڑھ جاتی ہے۔ جذبات کی توانائی، اور تخلیق کے جوہر نکھر آتے ہیں۔ زندگی کی تمناؤں کی ہمہ گیری کردار کا جزوِ اعظم بن جاتی ہے۔ اگر ہم چغتائی کی تصویروں کا جی بھر کر مطالعہ کریں تو ہمیں ایسے مختلف خدوخال، چہروں کی تراش اور کرداروں کے احساسات سے سابقہ پڑے گا جن کے تاثرات اور پیغام میں تڑپ اور شدت ہوگی، اور دل رنگ روپ اور فرحتِ انبساط کی دولت سے مالا مال ہوں گے۔

یہاں اکتا ہٹ کا شائبہ بھی نہیں ہوگا۔ برعکس اس کے مغرب کے عظیم آرٹسٹ ریمبراں۔ روبینز اور ال گریکو تک کے بنائے ہوئے چہروں میں اکثر اس درجہ مشابہت پائی جاتی ہے کہ رنگوں اور تکنیک کی جامعیت کے باوجود ایک چہرہ دوسرے چہرے کا دھوکا دینے لگتا ہے۔

غُلام لڑکی کے رُوپ میں چغتائی نے زندگی کے ایک ایسے اسلوب اور حُسن کی ترجمانی کی ہے جو سکے آہنگ میں رچا ہُوا ہے۔ یہ جذبہ ذرا سی جُنبش سے کئی معنی خیز تلاطم پیدا کر دیتا ہے۔ بالوں کی بندش اور تراش، زیور کا چناؤ، آنکھوں کی متانت، رُوح کی بالیدگی، جمالیاتی اضطراب، مرکزی نقطۂ نگاہ ایک حل طلب مسئلہ بن جاتا ہے۔ پاپوش غلامی کا وُہ استعارہ ہے جس پر مفکر اور شاعر ہمیشہ خلاقی اقدار کی پامالی کا نوحہ کرتا رہے گا۔ انسانی بصیرت اس غلامانہ عقیدت مندی کو اقدارِ حیات میں کبھی جگہ نہ دے گی۔ یہ غلام لڑکی اپنے سوزِ دُروں سے شعلۂ نور نظر آتی رہیگی۔ وہ زمان و مکاں کی روشنی میں اس منزل کی طرف چلتی رہے گی جہاں اس کی نجات ہے۔

چغتائی کی یہ تصویر رنگ روپ و سراپا کے لحاظ سے شبیہ نگاری کا کمال ہے خواہ یہ غلام لڑکی اپنی ملکہ کے حضور میں خوبصورت پاپوش اُٹھائے یُوں ہی کھڑی رہے ؎

جادُو ہے محمُود کی تاثیر سے چشمِ ایاز
دیکھتی ہے حلقۂ گردن میں سازِ دلبری

آدم از بے بصری بندگیٔ آدم کرد
گوہرے داشت ولے نذرِ قباد و جم کرد

من بسیمائے غلامان فرِ سلطان دیدہ ام
شعلۂ محمُود از خاکِ ایاز آید برون

نکتۂ می گویمت روشن چو دُر | تا شناسی امتیازِ عبد و حُر
عبد را تحصیلِ حاصل فطرت است | واردات جانِ اُو بے نُدرت است

THE SLAVE GIRL

His choice of the subject as well as the way in which he depicts it enables Chughtai to draw various unusual phases of life. Chughtai uses various hues and techniques to try new experiments, by which he gets excellent results.

Slave Girl, is an instance of Chughtai's refined sensibility. One can admire the plastic beauty of the figure and recognize the considerable success, the artist has achieved in painting the same.

Through the graceful posture of the figure of the Slave Girl, her vanity, and her personality the artist successfully reveals the depth of emotion and passion.

Figure is holding a pair of shoes of her mistress, symbolizing the characteristic charm of imperialism, a reminiscence of a past dynasty.

"IN SLAVERY THE HEART IS KILLED IN THE BODY.
IN SLAVERY THE SOUL BECOMES A BURDEN OF LIFE."

"THROUGH BLINDNESS MAN BECOME A SLAVE TO MAN;
HE HAD A PEARL BUT PRESENTED IT TO KAKUBAD
AND JAMSHID--
OWING TO HIS SLAVISH NATURE HE IS MORE MISERABLE THAN A DOG;
NEVER HAVE I SEEN A DOG BOWING HIS HEAD BEFORE
ANOTHER DOG.

IQBAL

زوالِ بغداد

نالہ کش شیراز کا بلبل ہوُا بغداد پر
داغ رویا خون کے آنسُو جہاں آباد پر

اقبال

زوالِ بغداد
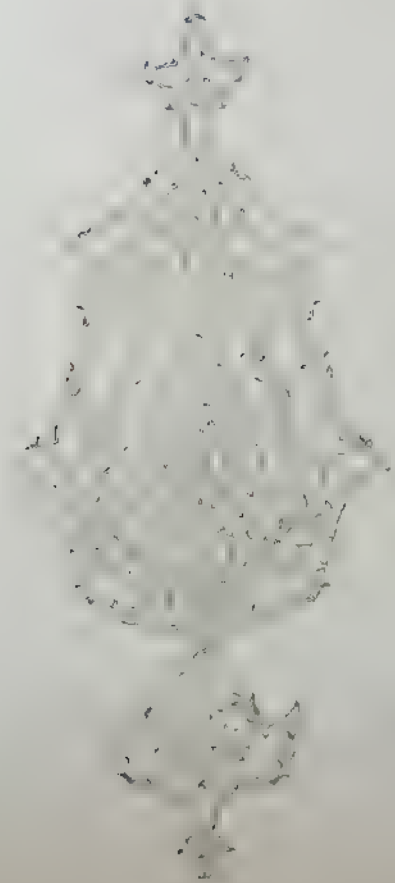
شہر آشوب ہر کس کا دل نہیں روتا، نہ کہ شاعر کا دل۔ اور خصوصیت سے اُس شاعر کا دل جو معاشرے، اور قوم کے تقاضوں کا ترجمان ہو، جس کے رگ و پے میں تہذیب و تمدّن کا خون موجزن ہو۔ وہ اپنے جذبات کے تلاطم سے دُوسروں کو خُون کے آنسو بہانے پر مجبور کر دیتا ہے۔ جو کیفیت شہر آشوب بغداد میں سعدی پر گُزری تھی سسلی اور قرطبہ کو دیکھ کر اقبال پر طاری ہوئی۔ سعدی نے مترنم زبان میں بغداد کو خطاب کیا تھا "میں تیری تباہی پر کیوں نہ روؤں۔ مَیں اپنی پلکوں میں آنے والے آنسوؤں کو روکتا ہُوں کہ وُہ بہنے نہ پائیں۔ مگر طُغیانی اور شدّت نے ہر بندھن کو توڑ ڈالا ہے۔ عزیزوں کی موت پر صبر ممکن ہے، مگر اے بغداد، تیری تباہی اور بربادی پر صبر اور ضبط سے کام لینا بس کی بات نہیں۔ کاش مَیں اس آشوب سے پہلے مر جاتا۔ اور دانش مندوں پر جاہلوں کا ظُلم و تشدّد نہ دیکھتا"

چغتائی نے زوالِ بغداد کی اس تصویر میں محض بغداد کی تباہی یا ان تاریک گھڑیوں کی مصوّری نہیں کی جن کے تصوّر سے دل خون کے آنسو روتا ہے، بلکہ اُس نے بغداد کے اُس جاہ و جلال اور عظمت و شکوہ کو بھی سامنے رکھا ہے جس نے اقبال اور سعدی جیسے بلند مقام شاعر اور مفکّروں کو آنسو بہانے پر مجبور کر دیا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے اس تصویر کی حد بندی کے وقت چغتائی کی نگاہوں کے سامنے بغداد کا وہ عدیم المثال عرُوج موجیں مار رہا تھا، جو مشرق سے مغرب اور مغرب سے مشرق تک کی تمام وسعتوں پر حاوی تھا۔ چغتائی خود اس بے پناہ عروج اور بیکراں زندگی کا ایک تماشائی بن کر رہ گیا ہے، اور اسے ایک زندہ قوم کی ابتدا اور انتہا ان کھنڈروں کی صورت میں دکھائی دے رہی ہے۔ جو کل تک اس زمین کے سینے پر جاہ و جلال اور شکوہ و عظمت کے ساتھ حکمران تھی۔ چغتائی نہیں چاہتا کہ مرگِ انبوہ کو موت کی صُورت میں مدغم کر دے۔ یہی ایک سبب ہے کہ اس کے ذہنی تسلسل کو ذاتی نظریوں سے ہٹ کر دیکھنے اور سمجھنے کی ضرورت ہے۔ اس کا فن، فنِ مطلق نہیں۔ ان تقاضوں کا ایک مجرّد پہلو ہے جو آج اور کل اپنی تہذیب سے وابستہ ہیں۔

اقبال نے آشوب کا ذکر بار بار کیا ہے۔ اے سسلی، دکن، دہلی، بنگال، قرطبہ اور بغداد سب اپنے اپنے زمانہ عروج پر نظر آتے ہیں، اور اس تہذیب و تمدّن کی یاد دلاتے ہیں جو تاباں و درخشاں زندگی کی مسرّتوں کے باعث ایک وقت میں دُنیا بھر کی نگاہوں کا مرکز تھے۔ اور دنیا ان کی شانِ رفعت کو ہر بار رشک کی نگاہوں سے دیکھتی تھی۔

تصویر زوالِ بغداد اس شکست و انتشام کی یاد دلاتی ہے جب ان پُرشکوہ اور پُر وقار لوگوں نے صحراؤں کو سبزہ زاروں میں بدل ڈالا تھا، زندگی کو آسمانوں میں کمندیں ڈالنے کے قابل بنا دیا تھا بحر و بر ان کے بازی گاہ تھے۔ وہ سُلطان

اور خلیفہ کہلاتے تھے۔ اُنھوں نے انسانیت کا سر بلند کیا۔ اسود و احمر اور مشرق و مغرب کا امتیاز جاتا رہا تھا وُہ قابلِ تحسین اور قابلِ قدر جذبہ ہے اور وہ ناقابلِ فراموش لمحے ہیں جنھیں چغتائی نے اپنے رنگوں کی حلاوت اور خطوں کی نوک پلک سے زندۂ جاوید کر دیا ہے۔ اس نے اُنھیں وُہ حیاتِ تازہ بخشی ہے جو تہذیبوں کے عروج و زوال کی داستانیں ہیں۔ اور ضبط و نظم کے فسانے ایک بار پھر کانوں میں گونجنے لگتے ہیں ؎

تھا یہاں ہنگامہ اُن صحرا نشینوں کا کبھی　　بحر بازی گاہ تھا جن کے سفینوں کا کبھی
زلزلے جن سے شہنشاہوں کے درباروں میں تھے　　بجلیوں کے آشیانے جن کی تلواروں میں تھے
مُردہ عالم زندہ جن کی شورشِ قُم سے ہُوا　　آدمی آزاد زنجیرِ توہّم سے ہُوا
غلغلوں سے جس کی لذّت گیر اَب تک گوش ہے
کیا وہ تکبیر اَب ہمیشہ کے لئے خاموش ہے

ہے زیارت گاہِ مُسلم گو جہانِ آباد بھی　　اِس کرامت کا مگر حقدار ہے بغداد بھی
یہ چمن وُہ ہے کہ تھا جس کیلئے سامانِ ناز　　لالۂ صحرا جسے کہتے ہیں تہذیبِ حجاز
خاک اِس بستی کی ہو کیونکر نہ ہمدوشِ ارم　　جس نے دیکھے جانشینانِ پیمبرؐ کے قدم
جس کے غنچے تھے چمن ساماں وُہ گلشن ہے یہی
کانپتا تھا جن سے روما اُن کا مدفن ہے یہی

چاندنی پھیکی ہے اس نظّارۂ خاموش میں
صبحِ صادق سو رہی ہے رات کے آغوش میں
رنگ و آبِ زندگی سے گُل بدامن ہے زمیں
سینکڑوں خُوں گشتہ تہذیبوں کا مدفن ہے زمیں
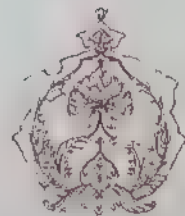
MOURNING FOR BAGHDAD

This picture shows the relationship between the charm and the revolutionary dignity of the past. Chughtai is unsurpassed in his expression and style. Sometime he desires to convey the message of God to man, who has forgotten all that is granted to him.

Chughtai, the really creative artist depicts Saadi, the spiritual and reformer poet, with profound devotion and observation, grieving over the fall of Baghdad, the centre of a glorious civilization, and longs for the glory of the past.

"WEEP ALL THY TEARS! O EYE WEEPING BLOOD.
YOUNDER LIES THE TOMB OF THE CIVILIZATION OF THE HEDJAZ.
ONCE THIS PALACE WAS THE TENT OF THOSE DWELLERS OF THE DESERT.
FOR WHOSE SHIP THE OCEAN WAS A PLAYGROUND;
WHO RAISED EARTHQUAKES IN THE PALACES OF THE KINGS OF KINGS,
IN WHOSE SWORDS LAY HIDDEN LIFESCORCHING FLAMES;
WHOSE ADVENT WAS THE DAWN OF A NEW ERA,
WHO SHOUTED: ARISE, AND A DEAD WORLD CAME TO LIFE,
AND MAN WAS SET FREE FROM THE BOUNDS OF SUPERSTITION.
IS THAT "TAKBIR" NOW STILLED FOR EVER,
WHOSE ECHO DELIGHTS EAR TO THIS DAY?

IQBAL
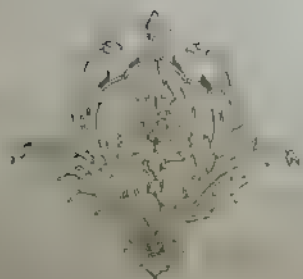
سیب کا درخت

بہ فغاں نہ لب کشودم کہ فغاں اثر نہ دارد
غمِ دل نگفتہ بہتر، بہمہ کس جگر نہ دارد

اقبال
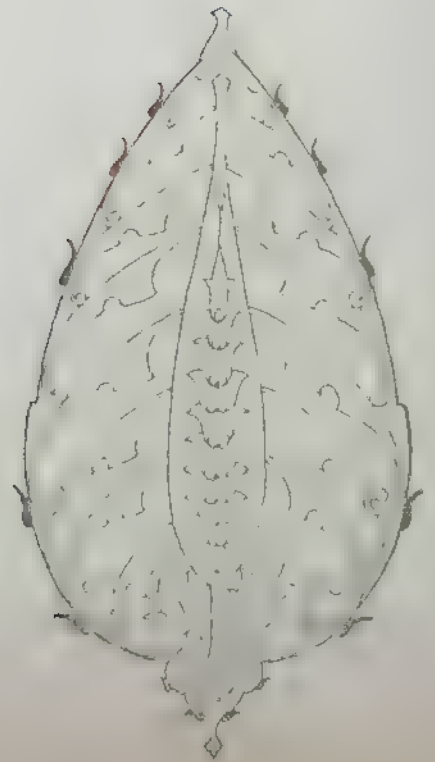
سیب کا درخت

چغتائی کا ایک خاص انداز ہے اور اس کی رومانیت بھی ایک مخصوص انداز سے اُبھرتی ہے۔ صُورت گری اور کردار کی باہمی کشمکش اس کے عمل کو تہذیبی ورثے کا متقلد بنا دیتی ہے۔ اور وہ زندگی کے ہر اس کردار کو جو جینے کا حق رکھتا ہے توانا اور صحت مند بنانے کا جواز تلاش کر لیتا ہے۔ اسے کلاسیکی جوہروں کی تلاش رہتی ہے تاکہ جمالیاتی حُسن کا سرمایہ ہاتھ آسکے۔

یہ تصویر تخلیق کرتے وقت فضا پیدا کرنے کے لئے اُسے اپنے گرد و پیش سے موضوع اور مواد حاصل کرنا تھا۔ وہ موضوع اور مواد کی تلاش میں کشمیر کی حکایات اور سماجی زندگی میں جا پہنچا۔ اُس نے موضوعات کی تلاش و جستجو میں ہمیشہ یہی کیا ہے۔ اُس نے زندگی کے ہر موضوع کو اپنے مُوقلم سے زندہ جاوید بنانے کی سعی کی ہے۔ نوجوان گھاٹن، بنجارن، تلنگن سنتال دُلہن، خود روپھول، اور میرے سیب اس کی بلند پایہ تصویریں ہیں۔ یہ اس آرٹسٹ کی تصویروں کے موضوع ہیں جس نے کبھی نیشاپور کی رات، عُمر خیام، محمل لیلے، صحرا نورد اور صحرا کی شہزادی کی تصویریں بنائی تھیں۔ جب وہ لندن سے پیرس پہنچا تو اتفاقیہ اس کی ملاقات ایک حبشی لڑکی سے ہوئی جو باکمال آرٹسٹ آگسٹس جون کی ماڈل بن چکی تھی۔ اور اُس نے اس کی کئی برہنہ تصویریں بنائی تھیں۔ وہ چاہتی تھی چغتائی آرٹسٹ بھی اس کے سیاہ فام خون کو غیر فانی بنا دے۔ اس نے باتوں باتوں میں بتایا کہ میرے جسم کی ساخت اور اس کی رعنائی میں اتنی پختگی اور نظر فریبی ہے کہ اس کی جو شبیہ جون نے بنائی تھی وہ تقریباً پندرہ ہزار پونڈ کو فروخت ہوئی تھی۔ اور آج اسے زندہ رہنے کے لئے پندرہ شلنگ کی ضرورت ہے۔

چغتائی نے اس نیگرو ماڈل کے سلسلے میں بیان کیا کہ مجھے وہ پانچ بوسے یاد ہیں جو چند لمحوں کی عُمر رکھنے کے باوجود دائمی ہیں اور ان کے دوام نے ہمیشہ میرے فن کا ہاتھ بٹایا ہے۔ اس میں اب بھی اس سیاہ خون کا لمس موجود ہے جسے مَیں نے والہانہ طور پر چوم لیا تھا۔

مَیں ریلوے کے ایک بند پھاٹک کے سامنے کھڑا تھا۔ ایک عورت بُرقع پوش عورت نے اپنے بچّے کو گود میں لے رکھا تھا۔ وہ بچّہ اس وقت مجھے اتنا اچھا لگا کہ مَیں نے آگے بڑھ کر اس کا مُنہ چوم لیا۔ علاّمہ اقبالؔ کو قبر میں اُتارتے وقت اکثر لوگوں نے خواہش ظاہر کی کہ ان کا چہرۂ مُبارک دکھایا جائے۔ مجھے اُس وقت اُن کی پیشانی پر ایک روشنی لرزتی ہوئی محسوس ہوئی۔ اور مَیں نے جی بھر کر اُن کی پیشانی کا بوسہ لیا۔ مَیں لندن میں تھا۔ ایک نمائش میں ایپسٹائن کا بنایا ہوا ایک مجسمہ بھی موجود تھا۔ وہ ایتھرا کا مجسمہ تھا۔ اور اس میں اس قدر کشش اور جاذبیت تھی کہ میں اسے چومنے پر مجبور ہو گیا۔ یہ کشمیری عورت تو لباس میں ملبوس ہے۔ مگر وہ نیگرو لڑکی جس کا مَیں ذکر کر رہا ہُوں میرے سامنے بالکل برہنہ بیٹھی تھی۔ جس کو آگسٹس جون کے بُرش، دو رنگوں نے

لافانی بنا دیا تھا۔ مَیں اور ایک جرمن لڑکی اسے دیکھ رہے تھے۔ وُہ اپنے بدن کی نمائش چاہتی تھی۔ مَیں نے اس کے سُرخ و سیاہ چہرے کو دونوں ہاتھوں میں لے لیا۔ اور بہ عقیدت تمام اُسے بوسہ دیا۔ ایسے ہی جیسے ایک پُجاری اپنے دیوتا کے قدم چُوم لے۔ آرٹسٹ مسکرایا اور کہا۔ یہ ماں اس وطن کی داستان ہے جہاں مائیں اپنے بچّوں کو بھی چُومنے کا حق نہیں رکھتیں۔

اقبال نے بھی کشمیر میں ایسی مائیں دیکھی ہوں گی۔ ان کی اس بے کسی پر آنسو بہائے ہونگے۔ وہ تاثر نظم بن کر لفظوں میں ڈھل گئے ہونگے۔ چغتائی اور اقبال کے تصور میں کوئی نمایاں فرق نہیں۔ سوائے رنگوں اور خطوں کے اور اس شکوہ کے جو ان وادیوں میں لالہ کی حیثیت رکھتا ہے

چغتائی نے اس سرزمین کو جس کی یہ تصویر ہے نسائیت کی سب سے بلند اور سب سے پست بستی پایا ہے۔ جس میں عملِ پیہم اور حیات دوام کا روگ پتھروں تک میں گھر کر گیا ہے جسے دیکھو یوں محسوس ہوتا ہے کہ وہ آج سے صدیوں پہلے کی سرگذشت بیان کر رہا ہے۔ یا مستقبل کے انسان نے حال اور ماضی دونوں کو اپنے اندر جذب کر لیا ہے۔ کاش میں اس وقت جذبات میں کھو جاتا۔ اور اس ماں کے چھٹا، ساتواں، آٹھواں بلکہ ان گنت بوسے لیتا جو ہر صبح اپنے بچّے کو لئے سیب کے درخت کے نیچے بیٹھی بغیر کسی آرزو کے بغیر کسی مستقبل کے اُن سیبوں کو دیکھتی ہے لیکن چھُوتی نہیں جن پر جانے کس کس کے نام لکھے ہوئے ہیں ماں ہوتے ہوئے بھی اس نے کبھی جی بھر کر اپنے بچّے کو بوسہ نہیں دیا کہ کہیں کوئی اس کی وارفتگی کی آواز سن نہ لے۔

چہ ندیدنی است اینجا کہ شررِ جہانِ مارا
نفسے نگاہ دارد نفسے دگر نہ دارد

تو ز راہِ دیدۂ بہ ضمیرِ ما گذشتی
مگر آنچنان گذشتی کہ نگہ خبر ندارد

این کوہ و صحرا این دشت دریا	نے رازداران نے غمگساران
بیگانۂ شوق بیگانۂ شوق	این جوئباران این آبشاران
داغے کہ سوزد در سینۂ من	آن داغ کم سوخت در لالہ زاران

UNDER THE APPLE TREE

Under the Apple Tree, comes memory of the artist's journey to the valley of Kashmir in 1929.

The green valley grows his mind as the apples grow in the valley. He has a vivid picture of the Kashmir landscape in his mind.

The Madonna of Kashmir, is looking towards the vast infinite distance, she lacks the power to give proper expression to the inner yearning of her heart.

In this picture the artist gives expression of his democratic conception of the valley which has become an eternal example of human suffering and of the tyranny of barbaric rulers.

"WHOSE FACES PUT THE TULIP AND THE ROSE
TO SHAME, MATURE AT WORK AND DILIGENT
AND KEEN OF EYE, THEIR VERY GLANCE COMMOVES
THE WEST. THEIR ORIGIN IS THIS OUR SOIL,
OUR CATCHING EARTH; IN KASHMIR'S SKY,
THESE STARS."

IQBAL.

اخترِ صُبح

گذشتی تیز گام اے اخترِ صُبح　　مگر از خوابِ ما بیزار رفتی
من از نا آگہی گُم کردہ راہم　　تُو بیدار آمدی بیدار رفتی

اقبال

اختر صبح

لق و دق صحراؤں کی بے پناہ وسعتیں، زندگی کا سوز و ساز اور وہ ربط و نظم جس میں حرارت، شدت اور حدت مضمر ہے۔ حدی خوانوں کے نغموں کا زیر و بم ہے۔ اونٹ کو صحراؤں اور صحرا نوردی سے ایک لگن ہے وہ محنت، مشقت، رفتار، بیداری، ذوقِ عمل اور جدوجہد کا لازوال نمونہ ہے۔ اپنے فرائض سے اس کی وابستگی اور ان فرائض کی ادائیگی کا نتیجہ وہ فطری اور ازلی رفاقت ہے جو اسے اپنے صحراؤں اور صحراؤں میں بسنے والوں سے ہے۔ جب کوئی روح پرور اور دلفگار نغمہ صحراؤں کی وسعتوں اور ان کے نخلستانوں سے بلند ہوتا ہے تو اس کی گونج سے اک جہان نو پیدا ہوتا ہے۔ یہ صدائے بازگشت اس وقت تک ان حدی خوانوں کا پیچھا نہیں چھوڑتی۔ جب تک کوئی دوسرا نغمہ ان کی زندگی کے تسلسل میں نہ سما جائے۔ اور یہ تسلسل زندگی کے نشیب و فراز کو حدود کی پابندی سے بے نیاز نہ کردے۔ حدی خوانوں کے نغمے منور آسمانوں کی بلندیوں میں یوں سما جاتے ہیں جیسے یہ آسمان اور یہ بلندیاں اُن کی اپنی ہیں۔ ان اسرار کی تلاش میں جن کو پالینے کی ہوس میں شتربانوں اور شتر سواروں کا یہ کبھی نہ تھمنے والا سفر جاری ہے صدائے جرس بلند ہو رہی ہے۔ یہ صدائے جرس تھکی ہے نہ تھمی ہے۔ اُمیدوں اور آرزوؤں کا یہ سفر یونہی جاری رہے گا اور یہ صدائے جرس یوں ہی بلند ہوتی رہے گی۔

شتربانوں کے قدم دھرتی کو سورج، چاند، ستاروں کی مانند ناپتے پھرتے ہیں۔ وہ اس منزل کا پیچھا کرتے چلے جا رہے ہیں جہاں آرزوئیں خدا کی خوشنودی سے ہمکنار ہیں۔ علامہ اقبال اپنے حکیمانہ انداز میں جب کبھی کسی ایسی آرزو کو آرزو کی شکل دیتے ہیں تو ایک کامل انسان اور اس کے کامل عشق کا تصور سامنے آن کھڑا ہوتا ہے۔ چغتائی بھی اپنی آرزوؤں اور اپنے مقاصد کے زیر اثر ہر تصویر کو فرد سے اور ہر فرد کو افراد کے رشتے سے ناپتا ہے۔ اسی مقصد کی استواری سے اس کے تخلیقی عناصر تکمیل پاتے ہیں۔ اس تصویر میں ایک اونٹ کھڑا ہے۔ وہ ان وسعتوں اور ان حدود سے ہمکنار ہے جن کا سلسلہ فطری بھی ہے اور لامتناہی بھی اور یہ بات بالکل واضح ہے کہ جب تک آرٹسٹ کو یہ سرفرازی بلا واسطہ حاصل نہ ہو وہ اس منزل کا ساتھ نہیں دے سکتا۔ جہاں یہ صحرا نورد اونٹ کھڑا اپنی انفرادیت کا مظاہرہ کرتا اور مسلسل جدوجہد کو وحی سمجھتا ہے۔ اونٹ کے اس پیکر میں مطالعے کی ایسی گہرائیاں شامل ہیں کہ معلوم ہوتا ہے وحی کا ظہور ہو رہا ہے اور بشارتیں نازل ہو رہی ہیں۔ اونٹ مائلِ پرواز ہے۔ اس کی نگاہیں اس افق پر لگی ہوئی ہیں جس کی نہ ابتدا ہے نہ انتہا۔

نیلگوں سماں، سکوتِ کامل، وسعتوں کا سلسلہ، اخترِ صبح کی دلکشی اور اس کا اور زندگی کا محکم رشتہ اپنے پورے جاہ و جلال کا مظہر ہے۔

زندگی کی کشمکش میں ابدی نجات کی تلاش کا راز مضمر ہے۔ یہ افشاں وخیزاں اونٹ، آرٹسٹ کی منشا، کا مظہر اور ہر نقطۂ نگاہ سے بھرپور کوششوں اور لامحدود آرزوؤں کا جویا ہے۔ وہ ان کامل قوتوں کا پیچھا کرتا ہوا نظر آتا ہے جن سے انسان نے زندہ رہنے کا علم حاصل کیا ہے۔ چغتائی کی مصوری کا نمایاں پہلو اس کے فن اور اس انفرادیت تک ہی محدود نہیں۔ وہ ان حقائق اور حقیقتوں کا بھی علمبردار ہے جن سے ان کے مذہبی عقائد اور دینداری پر پوری روشنی پڑتی ہے۔

چغتائی نے اپنے موقلم سے رنگوں کے بے پناہ امتزاج اور حدت سے فضاؤں کی پرسکوت کیفیتوں میں بغیر کسی مبالغے کے ان جذبات کی ترجمانی کی ہے جن سے وہ وابستہ ہے لمحہ بھر کے لئے بھی یہ گمان نہیں گذرتا کہ اس نے فنی انہماک سے گریز یا فرار کیا ہے۔ چغتائی ان حدی خوانوں کی طرح جو ان لق و دق صحراؤں میں اپنی منزل کی ٹوہ میں مارے مارے پھرتے ہیں فن کی بلوغت اور پختگی کے لئے سرگرداں رہتا ہے تاکہ اس کا فن بحرِ بیکراں بن جائے۔

اخترِ صبح کا سکوت کامل ان اتھاہ گہرائیوں کا گرد و غبار ہے جہاں فنی تحقیقات اور تخلیقات منزل مقصود سے بغل گیر ہیں ؎

چمکنے والے مسافر عجب یہ بستی ہے — جو اوج ایک کا ہے دوسرے کی پستی ہے
اجل ہے لاکھوں ستاروں کی اک ولادتِ مہر — فنا کی نیند مے زندگی کی مستی ہے

وہ نمود اخترِ سیماب پا ہنگامِ صبح
یا نمایاں بامِ گردوں سے جبینِ جبرئیل

من ہیچ نمی ترسم از حادثۂ شب ہا — نہ شناخت مقامِ خویش افتاد بدامِ خویش
شبہا کہ سحر گردد از گردشِ کوکب ہا — عشقے کہ نمودے خواست از شورشِ یارب ہا

غبارِ گشتہ ، آسودہ نتواں زیستن اینجا — بہ بادِ صبحدم درپیچ و منشیں بر سرِ راہے
زجوئے کہکشاں بگذر زنیلِ آسماں بگذر — زمنزل دل بمیرد گرچہ باشد منزلِ ماہے
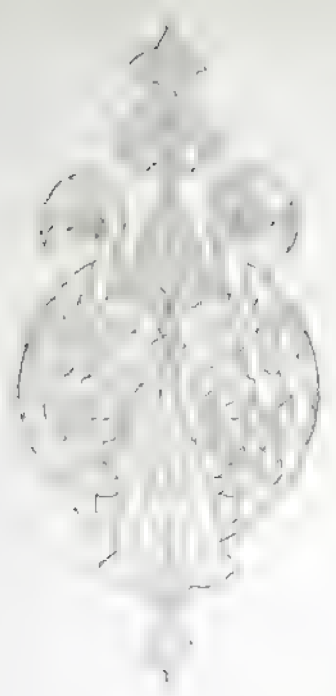
THE MORNING STAR

The depth of the limitless desert, depicted in colours, is a miracle of Chughtai. His imagination, owing to the emotional basis of his temperament and outlook on life is full of distortion of transient representations of man and his spirit on the earth.

The universal acceptance and achievement of arrangement of object and subject in a simple attitude, alongwith the creative imagination of the artist, invokes the authority of the master form his careful and constant observation of things that surround him, proceeds the conflict of reality.

The morning star is the symbol of the endless path in the desert. This picture is executed with emotion of great intensity and depth.

"O, SHINING TRAVELLER : THIS IS A STRANGE HABITATION—

THE RISE OF THE ONE IS THE FALL OF THE OTHER :

INACTIVITY IS IMPOSSIBLE IN SPHERE OF NATURE ;

CHANGE IS THE ONLY THING PERMANENT IN THIS WORLD.

IQBAL

جلال و جمال

مری نظر میں یہی ہے جمال و زیبائی
کہ سر بہ سجدہ ہیں قوّت کے سامنے افلاک

اقبال

جلال و جمال

ذوقِ جمال اور شانِ جلال دونوں صفات زندگی کو زندگی کی ابتیوں سے ہمکنار کرنے میں ایک دُوسرے کی مددگار ہیں۔ یہی وہ صفات ہیں جن سے حفظِ مراتب کا پتہ چلتا ہے۔ اقبال کے ہاں تہذیب و تمدن کے یہ عناصر ایک مخصوص انداز میں جلوہ گر ہیں۔ کسی فن کی رُوحانی اور وجدانی کیفیتوں سے نسان اُس وقت تک لُطف اندوز نہیں ہوسکتا جب تک اس کے پیچھے بلند نظری کا سہارا نہ ہو۔ چغتائی کا کہنا ہے کہ جب تک فن کار کو بخششوں کے ذرائع پُختہ طور پر ودیعت نہ کئے گئے ہوں۔ اسے مبلغ اور جامع شخصیت کا حامل نہیں ٹھہرایا جاسکتا۔ ترجمان فن کار انفرادی خصُوصیات کا علمبردار ہے۔ فنُونِ جمیلہ کے متعلق اسلامی نقطۂ نگاہ اتنا بے لگام نہیں کہ اس کو سامنے رکھ کر دُوسری قوموں کے مذہبی، ور روایتی فنون پر نکتہ چینی کریں۔ مغل اور ایرانی مصوّروں نے فن میں جو رواداری برتی ہے وہ ہمارے لئے نعمت غیر مترقبہ ہے۔ مگر اسے اسلامی مصوری یا اسلام کے نقطۂ نگاہ کا حامل نہیں کہا جاسکتا۔ اِس لئے کہ اس کا فن کارانہ انداز مذہبی اظہاریت پر اثر انداز ہوتا ہے۔

جمال و جلال یُوں تو یک مدبّر مجاہد اور ایک نیک سیرت دوشیزہ کی تصویر ہے۔ مراتب کے لحاظ سے باپ اور بیٹی کا سراپا ہے، جس میں ہیئت اور مواد دونوں کو ایک سا درجہ حاصل ہے۔ مواد ہیئت سے اور ہیئت مو د سے ہم آہنگ ہے۔ یہاں آرٹسٹ کے فن کارانہ تجربے کی وحدت اور تخلیقی رفعت ایک ایسے نقطے پر مرکوز ہے جس سے آرٹسٹ کی عظیم شخصیت کے ساتھ ساتھ ن ملی مقاصد کا اظہار بھی ہوتا ہے جو اقبال کی غرض و غایت تھے۔ آرٹسٹ کا مذہبی شعُور اور ثقافتی قدروں کا اظہار دورِ احیار کے مصوّروں سے ملتا جلتا ہے جنھوں نے قومیت اور وطنیت کے تصوّر میں مذہبی روایات کو اپنایا ہے۔ سپاہی کی مجاہدانہ توانائی اور فرض کے احساس کا تقاضا یہ ہے کہ وُہ اپنے آپکو مجاہد سمجھے اور بیٹی کو قوم کی امانت اور وہ مشعلِ راہ جس سے تعمیر خودی اور س کی نشوونما ہوتی ہے۔ یہ ہے وہ رمز شناسی جس کی آرٹسٹ نے اپنے کرداروں کے ذریعے وضاحت کی ہے۔ اس کی ایسی تصویروں میں یہ تصویر بڑی اہمیت رکھتی ہے۔

غلامی سے سیاسی قدریں اور مذہب کے ثقافتی تقاضے ان قیود سے آزاد ہیں جو حیاتِ ابدی کو پھُولنے پھلنے سے روکتے ہیں۔ ظہار کی کوئی صُورت اس وقت تک ہموار نہیں ہوسکتی جب تک ذہنی بلندی اور عمیق نگاہی کسی بیدار اور بلند انسان کی شکل میں ظاہر نہ ہو۔ چغتائی کی روشن ضمیری اور آزادیٔ فکر ہے کہ اُس نے اپنی جُستجو ور تلاش سے ایک سیدھے سادے جذبے کو ایسے رنگ میں رنگ دیا ہے کہ اس پر نکتہ چینی بھی کی جاسکتی ہے اور اس پر غور و فکر بھی کر سکتے ہیں۔

تصویر صورت گری اور ارادوں کی پختگی کا سرچشمہ ہے۔ فن کی افادیت کو نظر انداز کرتے ہوئے بھی اسے الوہیت کا درجہ حاصل ہے۔ رحل اور قرآن ہے۔ مجاہد اور دخترِ حرم بھی۔ ملی ضرورتوں کے مدنظر یہ تصویر عظیم آرٹسٹ کا عظیم شاہکار ہے۔

چغتائی کا عقیدہ ہے کہ آرٹ مفرد ہو یا تجریدی اس کا لازمی نتیجہ ملت اور ثقافت کے درمیان تعاون پیدا کرنا ہے کہ اس کی تخلیق بانجھ ہو کر نہ رہ جائے۔ یہی ایک حقیقت ہے کہ چغتائی نے اپنے فنی اسلوب اور شعور سے دیکھتے دیکھتے ذوقِ نظر کو بدل ڈالا۔ اور وہ دنیا جو جدید ہندوستانی آرٹ سے مسحور اور سحر زدہ ہو رہی تھی سے اپنی طرف متوجہ کیا۔ نئی افادیت کا یقین دلایا۔ اپنے مداح پیدا کیے۔ اپنے فن کے مطالعہ کا احساس دلایا۔ ایک نئے دورِ احیا کی بنیاد ڈالی اور کہا یہی وہ تریاق ہے جس سے فرسودگی جاتی رہے گی اور تقلید سے عقل کی روشنی میں چھٹکارا حاصل ہوگا ؎

نہ ہو جلال تو حسن و جمال بے تاثیر
نرا نفس ہے اگر نغمہ ہو نہ آتش ناک

مری نظر میں یہی ہے جمال و زیبائی
کہ سر بسجدہ ہیں قوت کے سامنے افلاک

نہ سوزد مومن از سوزِ وجودش
کشود ہر چہ بستند از کشودش
جلالِ کبریائی در قیامش
جمالِ بندگی اندر سجودش

JOB AND LEADERSHIP

Chughtai was born in a talented family, but he was not contented merely to carry on a tradition. Chughtai is the founder of a new school of painting which was entirely new in spirit.

The artist desires to establish a harmonious agreement between the conception and job with all glorious traditions. The time has not yet come to judge the spirit and work of the artist. What he likes to establish in form is not simply an organised protest against foreign influence but it is a passionate expression of devotion.

This painting of Chughtai expresses his will to power and his struggle for existence. Composition and colour scheme are remarkable.

"IMPATIENT LIKE MOSES HE WANTED A MANIFESTATION OF GLORIOUS,

SO HIS BRIGHT INTELLECT RESOLVED THE MYSTERIES OF LIGHT.

WHOSE FLIGHT FROM THE HEIGHTS OF THE SKY TO THE OBSERVER'S EYE TAKES BUT ONE INSTANT!

AND IS SO SWIFT THAT IT CANNOT EVEN BE CONCEIVED".

IQBAL

دیکھ آکر کوچۂ چاکِ گریباں میں کبھی
قیس تُو لیلیٰ بھی تُو صحرا بھی تُو محمل بھی تُو

اقبال

ناقۂ لیلےٰ

علامہ اقبال کے طفیل چغتائی کو بھی فطری طور پر صحرانوردوں اور حُدی خوانوں سے دِلی لگاؤ ہے۔ اسے چاندنی راتوں صحرائی دستوں اور ستاروں کی تنک تابی سے گوناگوں دلچسپی ہے۔ اور یہ دلچسپیاں اور جنُوں ایک ورثہ بھی ہے اس کی بلند نگاہی کا ان سے رشتہ بھی ہے۔ اس نے اپنی طرزِ نگارش کو اپنے خطوں اور رنگوں سے ایک ایسی ندرت بخشی ہے کہ اس سے ہماری ثقافتی قدریں بہرہ ور ہوتی ہیں۔ وہ اُفتاد اور پرواز پیدا ہوتی ہے جو ساربانوں کے بلند آہنگ نغموں اور صحرا کی دستوں میں آج بھی پوری توانائی اور دلآویزی سے رُوحوں کو گرماتی اور دلوں کو مسرور کرتی ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے۔ کہ وہ گونج وُہ دلخراش آہٹیں جوں کی توں ہی بازگشت کا تعاقب کر رہی ہیں جو اس بدویانہ زندگی کا طرۂ امتیاز تھا۔

شاعر اور ادیب صدیوں سے لیلےٰ اور مجنوں کے کردار اور ان کی نہ مٹنے والی داستانِ حیات پر مختلف پہلوؤں سے تبصرہ کرتے چلے آ رہے ہیں۔ اپنے فکر اور تخیل سے ہر ایک نے اپنے اپنے نظریے کے مطابق اس داستان کو دُہرایا ہے۔ چغتائی نے بھی اس موضوع پر کئی تصویریں بنائی ہیں۔ تاکہ وہ دئی جنوں کا یہ سلسلۂ حیات رنگوں اور خطوں میں ڈھل جائے۔ اسکے اظہار کا اچھوتا انداز موضوع کا سہارا لے کر جدت طراز ہوتا ہے۔ ایسے ہی کہ وہ خود بھی اس داستان لازوال کا ایک کردار ہے وہ صحرا کے گرد و غبار میں ناقۂ لیلےٰ کو دیکھ لیتا ہے۔ اس کے ہم رکاب ہو جاتا ہے اور چاہے وہ کتنا ہی پارینہ اور دور اُفتادہ قصہ کیوں نہ ہو وہ اس کا اپنا قصہ بن جاتا ہے۔

چغتائی نے جس تازگی و ربرجستگی سے اس موضوع کو رنگوں اور خطوط میں سمویا ہے۔ وہ شعر اور نظموں کا ایک بہتا ہوا دھارا ہے۔ اس میں مسرتیں ہمکراہٹیں، پھُول اور کانٹے سبھی کچھ ہے۔ یہی وُہ مقام ہے جہاں آنسو بھی رواں بن کر حقیقتوں کے نشان بن جاتے ہیں اور صحرا کی وسعتیں اپنی خون آشامی کا پتہ دیتی ہیں۔ محبوب اور محبوبہ کا سامنا یوں ہوتا ہے کہ تمام بھولی بھٹکی واردائیں نئی کروٹوں اور نئی تحریکوں میں تبدیل ہو کر نیا وجود اختیار کر لیتی ہیں۔ لیلےٰ ہو یا مجنوں، لق و دق صحرا، اونٹ اور لیلیٰ کی بے نیازیاں، قطار در قطار بیٹھے ہوئے غزال۔ وہ آہو چشم لیلیٰ، یک جنوں بپرو رساں اس خوں چکاں داستاں کے ورق ہیں جنہیں قُدرت نے ریت کے ٹیلوں اور صحراؤں کے سینوں پر اس طرح کندہ کیا ہے کہ وُہ کبھی مٹنے نہ پائیں۔ اس سکوت بردوساں میں کتنی ہمہ گیری اور کتنی یگانگت ہے۔ ناقہ سے نکل کر صحر کی حُور اپنے محبوب کے سامنے آ بیٹھی ہے۔

چغتائی کا فنی انہماک اور اُس کا یہ شاہکار ایک نئی تعمیر کا حامل ہے۔ جُوں جُوں وقت گذرتا چلا جائیگا یہ رشتہ مضبوط ہوتا چلا جائیگا اور تسلیم کرنا پڑیگا کہ یہ پس منظر جو آرٹسٹ نے اظہارِ خیال کے لئے چنا ہے کبھی نظرانداز نہ کیا جا سکے گا۔ صحرا

کی زندگی میں آج بھی وُہ وجدان اور جنوں پرور تان ہے جس سے داستان زندہ و تابندہ ہے۔ آرٹسٹ خود بھی اس رومان کا ہم سفر ہے وہ مُنہ موڑنے والا نہیں۔ دل ہارنے والا نہیں۔ چاہے اس کی منزل کتنی ہی دُور اُفتادہ کیوں نہ ہو اس کا جنوں بھی لیلیٰ کی صحرا نوردی سے کم نہیں۔

خُون اور تلوار سے کھیلنے والا سپاہی۔ علم و حکمت سے زندہ رہنے والا مفکّر اپنی عظمت کو برقرار رکھنے والا مجاہد۔ اپنی قُوّت فیصلہ پر بھروسا رکھنے والا سپاہی اپنے مقاصد سے وابستہ پیوستہ ہے۔ سب کُچھ ہوتا رہیگا مگر یہ صحرا اور اس کی وسعتیں اس وقت تک لالہ زار بنی رہیں گی جب تک یہ داستانِ محبّت اپنی اہمیت کا خراج اہل دل اور اہل نظر سے وصول کر رہی ہے۔

بعض اوقات ہم چغتائی کے متعلق اس غلط فہمی میں مُبتلا ہو جاتے ہیں کہ وہ ماضی پرست اور روایت کا ترجمان ہے۔ مگر وُہ برابر یہی کہے گا کہ ہمارا ماضی اور ہماری روایات جدید سے جدید تر ہیں۔ وُہ کبھی ہمارے تجریدی نظریوں میں حائل نہیں ہوتیں وُہ ہماری ایسی دولت ہے جو آج کے انسان کو کسی قیمت پر میسّر نہیں آتی۔ کھوئی ہوئی دُنیا آج کی دُنیا سے کہیں حسین کہیں پُرشکوہ ہے۔ اور یہی رمز آگاہی ہے کہ ہم اپنی کُہنہ داستانوں کے بُنیادی خدوخال کی تلاش میں سرگرداں ہیں جن سے آج کی زندگی محروم ہے۔

دیکھ آکر کوچۂ چاکِ گریباں میں کبھی
قیس تُو لیلیٰ بھی تُو صحرا بھی تُو محمل بھی تُو

قیس پیدا ہوں تری محفل میں یہ ممکن نہیں
تنگ ہے صحرا ترا محمل ہے بے لیلیٰ ترا

کوئی دِن اَور ابھی بادیہ پیمائی کر
مِل ہی جائیگی کبھی منزلِ لیلیٰ اقبالؔ

THE DESERT IN LOVE

This is a landmark in Chughtai's career and is a rare achievement in conception composition. It is really a great contribution to art. Chughtai has caught the romance and the tradition of this story in form and colour. He is a master of colour and a great draftsman. He brought about a revolutionary change of outlook in the art of East. As a creative artist he creates a new romance between the burning heart of two lovers—the feelings that the desert never felt and will never forget.

The perfect rhythm and melody in colours is mainly due to the inspiring mood of the lovers. According to Chughtai, a picture which can be called a work of art, should be a complete story of life in different phases of life.

"SEE THAT IN THE DESERT LAILA'S CAMEL HAS BECOME DECREPIT,

LET US KINDLE NEW DESIRES IN QAIS.

"O QAIS : HOW IS IT THAT THY INNER FLAME HAS GONE OUT,

WHILE LAILA YET RETAINS THE SAME GRACEFUL AIRS OF YOUTH."

IQBAL.

چشمۂ ارتقا

برون زین گنبد در بستہ پیدا کردہ ام راہے
کہ از اندیشہ برتر می پرد آہ سحرگاہے

اقبال
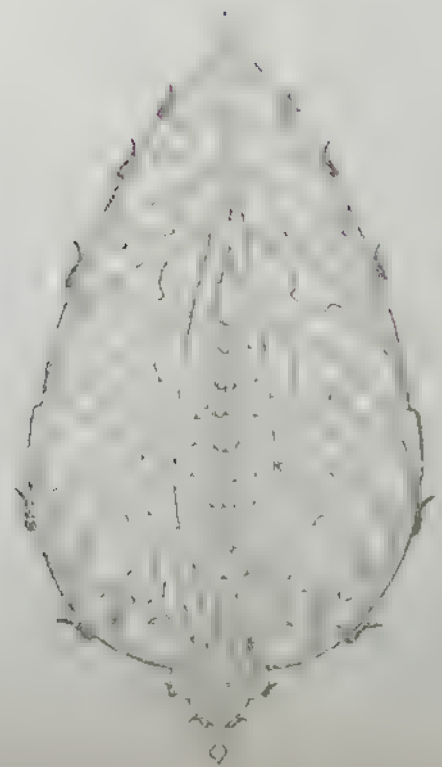
چشمۂ ارتقا

جوانِ تمنّا اور تازہ دم زندگی ان چہروں کی توانائی اور مسرّتوں سے ظاہر ہے جن میں بلند ہمّتی اور بلند آہنگی کے نشان ہوں۔ ان کا خیال آگ میں کُود جانے سے بھی پہلوتہی نہیں کرتا مستقبل کی بشارتوں کو قلب و جگر سے ارتقا کی راہ میں لُٹا دینا اور الہامی واردات قلب کو عشق کی نضیلت سمجھنا زندہ انسانوں کا شیوہ ہے۔ چغتائی کی شبیہ نگاری کو تنقید کے آئینہ میں دیکھا جائے تو اس کی یہ تصویر اس کے فن میں ایک نمایاں حیثیت رکھتی ہے سادہ اسلوب کی رُو سے اس کا انتخاب محض جذباتی اور وقتی طور پر نہیں کیا گیا۔ اس کے چٹان نما چہرے میں پختگی اور توانائی موجود ہے۔ شاہین زادہ زندگی کے سوز و ساز سے مالا مال اور کیف و انبساط سے بھرپور دکھائی دیتا ہے۔ آرٹسٹ کی یہ پیشکش فنی نقطۂ نگاہ سے بھی کردار کی نمائندگی کا صحیح حق ادا کرتی ہے، اور سوچ بچار کے باوجود کوئی دماغی الجھن پیدا نہیں ہونے دیتی۔ یُوں نظر آتا ہے جیسے وہ اور شاہین دو تراشی ہوئی چٹانیں ہیں۔ چغتائی خود بھی اپنے موضوع کی تکمیل اور تشکیل کے جنوں میں ہمیشہ ایسے موقعوں کا متلاشی رہتا ہے جن سے فن کی افادیت ہاتھ آئے، اور اخلاقی ذمّہ داری کا حق پُورا ہو سکے۔

چغتائی نے مشرقیت کے مفاد کو کبھی نظر انداز نہیں کیا۔ اس کی ہر تصویر میں اسکی یہ آرزو کارفرما ہے۔ اور اس کا یہ وصف علامہ اقبال کی غیر معمولی شخصیت سے ہر دم جوان اور تازہ ہے۔ کردار کی انفرادیت کا حامل خرقہ پوش ہوا مرد شاہین جوانِ تمنّا تازہ دم زندگی کا جویا ہے۔ وہ یہ شاہیں زادہ ان مجاہدوں کی اولاد ہے جنہوں نے خیابانِ چمن کو گرمیٔ عشق سے گرمایا اور زندگی کے مسائل سے آشنا کیا۔ مغل، ایرانی، بدھ اور چینی مصوروں نے وقت کی ضرورت کے مدِّنظر شبیہ نگاری کو بڑا فروغ دیا۔ اور بڑے بڑے عظیم شاہکار یادگار چھوڑے۔ جو رہتی دُنیا تک اپنے بنانے والوں کی ستائش کا دم بھرتے رہیں گے۔ چغتائی نے بھی مشرقی ہونے کی حیثیت سے کوشش کی ہے کہ اس کے ہاں بھی شبیہ نگاری کے محاسن اور اسلوب نظر آئیں تاکہ اس کی مصوری اس صنف سے محروم نہ رہ جائے اس کے رُجحانات اور محسوسات مشرق سے ملتے جُلتے مغرب کے ان اوصاف اور کیفیات کے بھی ترجمان ہیں جن سے انھیں برتری حاصل ہے۔ شبیہ نگاری کی رُو سے چغتائی کی مشرقیت کا مطالعہ کیا جائے تو مشرقی فن کا یہ خزاں رسیدہ چمن جدت پسندی اور تجریدی قوتوں کی خوشبوؤں سے مہکتا اور کھلتا ہوا نظر آئیگا کہ اس نے کس چابکدستی سے اپنے فن کی ترجمانی کی ہے۔ اس صنف کو نقشہ کشی، نگارہ سازی کو اس نے صحت اور ان کے قاعدوں سے سمو دیا ہے اور اپنی ثقافتی قدروں کو بڑے دانشورانہ طور پر اُجاگر کیا ہے۔ اس نے اس ابدیت اور انفرادیت کو واضح طور پر بڑی بصیرت کیساتھ پیش کیا ہے۔

چغتائی خواہ خود بھی مغرب سے متاثر ہو، اور خواہ وہ مغربی اثرات کو تعمیرِ نو کے لئے کام میں لایا ہو لیکن اس کی مشرقیت کی وضاحت اور اہمیت مشرق و مغرب دونوں کے لئے مطالعہ کی چیز ہے۔ کیونکہ اس کا بنیادی تصور اور مرکزی نقطۂ نگاہ اپنے خونِ جگر اور اپنے افکار کا خلق کردہ ہے۔ اُس نے اپنی اس سیدھی سادی تکنیک اور تصویر میں جلال و جمال کے علاوہ افتادِ پختگی کی رمز شناسی کو بھی جگہ دی ہے۔ یہ خوشتر جوان، اس کی جوان تمنا، زندہ تابندہ آرزوئیں ایک ایسی تہذیب و تمدن کیلئے سلامتی کے لئے وقف ہیں جس کی تقلید ایک دُنیا کو راس آگئی تھی۔

ہمارے آرٹسٹ کا ذہنی ارتقار رُوح کی بالیدگی کا سامان مہیا کرتا ہے۔ اُس نے شبیہ نگاری سے ان وسعتوں پر کمندیں ڈالی ہیں جن کا اس کے فن میں امکان نہ تھا۔ اس نے جگہ جگہ اپنی بلند نگاہی کا وہ ثبوت دیا ہے جو اس کے تدبّر اور اس کی جامع شخصیت پر دلالت کرتا ہے۔ اس نے اس ضمن میں بعض ایسی تصویریں تخلیق کی ہیں جن کا تصور بھی اجنبی معلوم ہوتا ہے، اس کی آزاد روی اور بلند نگاہی ایک سچے ہندوستانی کا حصہ ہے۔ اس کی بنائی ہوئی رتجن کی تصویر، امبا پالی اور بُدھا، کرشنا اور رادھا، گوتم، اور اس کی بیوی، نانک اور بالہ ایسی تصویریں ہیں جو اس کے شگفتہ ذہن، اس کے فنی وجدان اور اس کے ارتقا کا پتہ دیتی رہیں گی۔

زجُوئے کہکشاں بگذر زنیل آسماں بگذر
زمنزل دل بمیرد گرچہ باشد منزلِ ماہے

نہیں تیرا نشیمن قصرِ سُلطانی کے گُنبد پر
تُو شاہیں ہے بسیرا کر پہاڑوں کی چٹانوں میں

تُو شاہیں ہے پرواز ہے کام تیرا
ترے سامنے آسماں اَور بھی ہیں

اے طائرِ لاہُوتی اس رزق سے موت اچھی جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی

SELF REVELATION

Chughtai knows how to deal with subjects which express his love of humanity and gives lustre and lust to life. In his creative subjects he assimilates his theme to produce the character in his own style according to his, concept. A work of art, must be identified with the motive of the artist. This identification is evident in his art.

Though the picture is old, neverthcles, he tries to express the motive of a young man, who has vigour, vitality, self knowledge and infinite capacity to live and the will to power.

"GET FROM YOUR OWN DUST THE FIRE THAT IS NOT VISIBLE.
BECAUSE THE LIGHT OF OTHERS IS NOT WORTH HAVING.
DEMEAN NOT THE PERSONALITY BY IMITATION,
GUARD IT, AS IT IS A PRICELESS JEWEL.

IQBAL

دانائے راز

نہ اٹھا پھر کوئی رومی عجم کے لالہ زاروں سے
وہی آب و گل ایراں وہی تبریز ہے ساقی

اقبال

دانائے راز
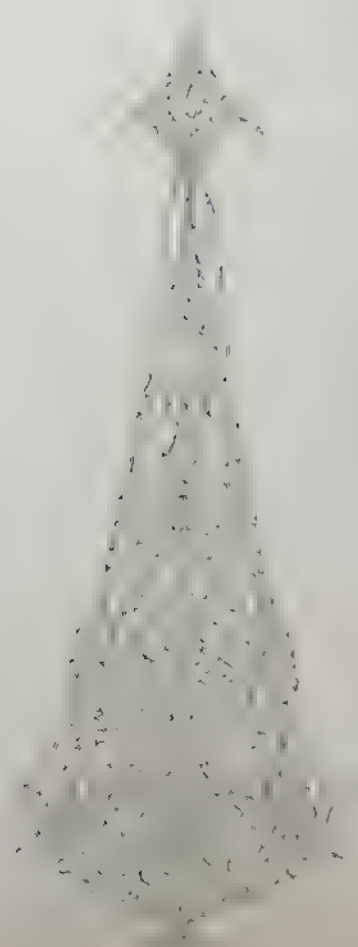
اقبالؒ نے جس بصیرت اور فکر و نظر سے انسانی کمزوریوں کی طرف توجہ دلائی ہے اس سے پہلے اس طرح انسانی اعمال پر تنقید نہیں کی گئی۔ یہ تصویر اس تخیل کی پیداوار ہے جس سے اقبالؒ جیسے دانائے راز کا رشتہ وابستہ ہے۔ دانائے راز روحی ہو یا اقبال اُن بیٹھا ہے۔ اسکی مجاہدانہ سرشت اور سربکف انداز اس کی نشست سے واضح ہے۔ تصویر کے رنگوں اور خطوں کا رشتہ ہمارے ماضی اور اس تقدس سے ہے جس سے ودیعت کی ہوئی صلاحیتیں خدا کی منشاء کے مطابق پروان چڑھتی ہیں۔ ان کا روحانی اور خدائی تعلق انسانی فطرت سے ہے اور اس عقیدے سے ہے جو فطری ہے۔

آرٹسٹ نے تصویر کے روپ میں کردار کی خودشناسی اور خودآگاہی کی ترجمانی کی ہے، جو اس کی بلند گردن اور کشادہ کندھوں سے واضح ہے۔ وُہ انسان اور انسانیت کا بوجھ اٹھائے ہوئے ہے، وہ کائنات کا پاسبان اور زندگی کی خوشحالی کا امین ہے۔ اس کی انانیت میں فوق البشری، فکر کی بلندی، رُوح کی پاکیزگی، شاعرانہ توانائی، غرض کیا ہے جو موجود نہیں۔ کوئی ایسا تذبذب نہیں کہ جس سے ترجمانِ حقیقت کا عزم اور اس کے شعار کی پختگی متزلزل ہو سکے یا حیات کا سلسلہ درہم برہم ہو جائے۔

چغتائی کی اس تصویر کو مختلف کرداروں سے منسوب کیا جا سکتا ہے۔ وُہ ایک شاعر ہے، مجاہد اور مردِ مومن ہے، کتاب اور تلوار کا مبصر ہے۔ وہ دانائے راز ہے۔ کائنات کے راز اس کی نظر کے سامنے ہیں۔ اسکی نگاہوں کے سامنے دونوں جہان کے در کھلے ہوئے اسکی بلندیٔ پرواز کا پتہ دے رہے ہیں۔ آرٹسٹ نے تلوار کا اشارہ بھی استعمال کیا ہے جس سے کامرانی کا آغاز اور محکومیت کا خاتمہ ہوتا ہے۔ زندگی کی ذمہ داریاں اُجاگر ہوتی ہیں۔ شاعر ہو یا سپاہی فکر و عمل سے انقلاب آفرین صلاحیتوں کا پیچھا کرتا ہے۔ اس لئے بھی کہ فکر کی راہیں تنگ و تاریک نہ ہو جائیں اور عشقِ مردِ ل خود اپنے درد کا درماں ڈھونڈ نکالے اور زمان و مکاں کو پا سکے۔

چغتائی نے نئے نئے تجربے بھی کئے ہیں۔ اس پر مغرب کے مطالعہ کا گہرا اثر ہے اس نے مطالعہ کی ضرورتوں کے مدنظر چین اور جاپان کو بھی نظر انداز نہیں کیا۔ جہاں تک رمز و رموز کا تعلق ہے وہ ذہنی طور پر طبقاتی سیاست کو بھی ہاتھ سے نہیں دیتا۔ وہ حد درجے کا کٹر اور مشرق زدہ ہونے کی بنا پر اُن آلائشوں سے دامن بچاتا چلا جاتا ہے جس سے اس کا مدعا فوت ہو۔ وہ کبھی شعوری طور پر مغرب کے نقشِ قدم پر چلنے کے لئے رضامند نہیں ہوتا۔ بلکہ اُسے جب بھی موقع ملتا ہے وُہ مشرق کی انفرادیت کو سراہتا ہے ہمارے ہاں ایسے ایسے جوہر اور امکانات موجود ہیں کہ خود مغرب ہماری اختراعوں اور جدت طرازیوں

کی طرف نگراں اور اُن کا محتاج ہے۔ اس بنا پر اس نے بار بار اپنے فن کاروں اور دانشوروں کی توجہ اس طرف مبذول کرائی ہے۔ اسلئے بھی کہ تہذیبی مسائل کے پیشِ نظر دورِ حاضر کی سیاست اجازت نہیں دیتی کہ ہم اپنی انفرادی خوبیوں کی طرف سے آنکھیں بند کریں۔ اِقبالؔ کا نظریۂ حیات یہ ہے کہ زندگی کے متعلق ہمارا شعور بیدار ہو، سماجی رشتوں کی اہمیت ہم پر زیادہ سے زیادہ واضح ہو اور ہم حیات و کائنات کی بلندیوں کو چھو سکیں۔

دانائے راز کی تصویر دیکھنے سے اور اس کے مطالعہ سے اِس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ وُہ تہذیبی، سماجی، تاریخی، فکری، اور رُوحانی طور پر زندگی کے کس مقام پر کھڑا ہے۔ اس کے تصویری عناصر میں انفرادیت نمایاں ہے۔ اک نیا انداز ہے اور ایک نئی سُوجھ بُوجھ۔ اس بات سے کبھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اقبال نے کبھی اپنے فنی خلوص، نیک نیتی اور احساسِ نفس سے رشتہ نہیں توڑا۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے اپنے مقصدوں کو کبھی نظر انداز نہیں کیا۔

چغتائیؔ ایک فن کار کی حیثیت سے ورثے، روایات اور اخلاقیات کا علمبردار ہے۔ وُہ بھی ایک دانائے راز ہے جس کی یگانگت اس کے فن کے رُوپ میں اس بات کی وضاحت کرتی ہے کہ اس کے سوچنے سمجھنے کا انداز اپنا ہے اور اسی پر اس کے فن اور زندگی کا انحصار ہے ؎

عُمرہا در کعبہ و بُت خانہ می نالد حیات
تا ز بزمِ عشق یک دانائے راز آید برون

ہو بندۂ آزاد اگر صاحبِ الہام
ہے اس کی نگہ فکر و عمل کے لئے مہمیز

اُس مردِ خود آگاہ و خُدا مست کی صُحبت
دیتی ہے گداؤں کو شکوہِ جم و پرویز

ز رُومی گیر اسرارِ فقیری — کہ آن فقر است محسُود امیری
حذر زان فقر و درویشی کہ زِ وے — رسیدی بر مقامِ سربزیری

WISDOM AND THE WISE

The genius fully knows that the work of art not only lives through the ages but through the deeper speculations of the artist. The task of self-purification and enthusiasm for art is not an easy task. Chughtai complains against those who are unable to follow the spirit, aroused in the process of progressive disintegration of his art. He, however, does not content himself, creating some pattern of art, emotionally satisfying himself by the self of man, providing a correct basis for the integration of human personality.

"THE SPIRITUAL SAINT RUMI, THE PHILOSOPHER OF HOLY ORIGIN,
OPENED THE HIDDEN SECRET OF LIFE AND DEATH TO US ALL.
LIFE CRIES IN KAABA AND IDOL-HOUSE FOR MANY AGES.
TILL, FROM THE ASSEMBLY OF LOVE COMES OUT A WISE-ONE.

IQBAL

جہانگیر اور نور جہان

چہ خواہم درین گلستان گر نہ خواہم
شرابے ، کتابے ، ربابے ، نگارے

اقبال

جہانگیر اور نور جہاں

چغتائی ایک آرٹسٹ ہونے کی حیثیت سے شاداب زندگی کا مقلد اور توانائی کا قائل ہے۔ چغتائی کو اپنی اس تصویر سے ایک ایسا رومانی تجربہ منظور تھا جس کے کردار پُر وقار اور پر شکوہ ہوں۔ زندگی روایات سے معمور ہو اور ماضی بڑی بڑی آرزوؤں سے گزر کر چٹان کی مانند اٹل نظر آئے۔ اُس نے اس سچے رومان کا محض اچھوتے انداز ہی میں اظہار نہیں کیا بلکہ اس نے وہ انداز بھی بخشا ہے جو اس کی عمر خیامی تصویروں میں اس کے پیش نظر رہا ہے۔ اس نے ہمیشہ خیام کے اس محبوب کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے جس کا وہ تصور کرتا رہا ہے۔ زندگی کی برتری بس شہنشاہ کا نظریہ ہے جس نے حکومت کی اور محبوبانہ حکومت کی۔ چغتائی نے اپنی مصوری کا بہترین وقت عمر خیام کے مطالعہ اور اس کے نظریات کی نذر کیا ہے۔ ایک باہوش زندگی جو جاہ و حشمت کی حامل ہو تُزکِ جہانگیری سے موسوم ہے۔ اس کے مطالعہ سے ان آرزوؤں کی تکمیل ہوتی ہے جو ایک بادشاہ سے وابستہ کی جاسکتی ہیں۔

جہانگیر ہندوستان کا وہ بے مثل بادشاہ گزرا ہے جس کی ثقافتی قدروں، آرٹ اور ادب سے والہانہ محبت، اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ اسے خونِ تیموری کا وہ جانشین کہا جائے جو شمشیر و سناں کا حامل اور طاؤس و رباب کی عملی صورت تھا۔ جس نے سلطنت کے شکوہ کے ساتھ زندگی کی توانائی اور ہمہ گیری کو اُجاگر کیا، اور اس بات کا ثبوت دیا کہ بلند نگاہی، قلب و جگر کی توانائی، فرض شناسی اور دلوں کی تسخیر پُشت ہا پُشت کے بعد میسّر آتی ہے۔

نور جہاں حکمت ہے وہ چبوترے پر یوں استادہ ہے جیسے مملکت کا ایک ستون ہے اس کے محبوب شہنشاہ نے اپنا شاہین شکار پر جھپٹنے کے لئے چھوڑا ہے جہانگیر مطمئن ہے، اُسے اعتماد ہے کہ اس کا وار خالی نہ جائے گا اور اُس کا شاہین کامیاب لوٹے گا۔ آرٹسٹ نے ان دونوں پیکروں کو بڑے انہماک اور کچھ اس انداز سے تکمیل دیا ہے کہ زندگی کی تہذیبی نشو و نما اپنے ہر پہلو سے واضح ہے۔ فنِ تعمیر مغلوں کا خاصہ رہا ہے اقبال نے اسے اسلام کی عظمت کا سرچشمہ قرار دیا ہے۔ اس میں وسعتیں توانائی اور آزاد روی پائی جاتی ہے۔ چغتائی نے اس مختصر سی جگہ میں تعمیر کے نظریہ کو وہ جمالیاتی حُسن عطا کیا ہے جیسے فنِ تعمیر کا نظریہ شمشیر و سناں کا حامل ہے۔ پھر ان دستوں میں دو محبت بھرے دلوں کو اس حُسنِ کمال سے لاکھڑا کیا ہے کہ وارفتگی، شگفتگی اور مسرتیں باہم والہانہ طور پر بغل گیر ہیں ایک غیر فانی محبت ہی ایسا کھیل کھیلنے کی راہیں پیدا کردیتی ہے جو مغلوں کے ایوانوں اور املاک کے ذرّے ذرّے سے عیاں ہے۔

نئی قدریں وقت کی ضرورت اور وقت کی نزاکتوں کے مطابق بنتی اور سنورتی ہیں۔ پھر ہر دور جس سے فن کار گزرتا ہے

اس کے اپنے مقاصد ہوتے ہیں۔ تکنیک، وضع قطع، خدوخال اور اس کا معیار اس دور کی نمائندگی کا حق رکھتا ہے جن کی ترجمانی کرتے وقت محسوسات کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ فن کار کو اپنی مصلحت کے مطابق اس ہیئت اور مواد کو دیکھنا پڑتا ہے وہ یہی وجہ ہے کہ ایسے اظہار میں روایات کی اہمیت بڑھ جاتی ہے۔ اور فن کار کے لئے امکانات کا ساتھ دینا ضروری ہو جاتا ہے۔

چغتائی نے اس تصویر میں مغل فن کی نقالی نہیں کی۔ اس نے اپنے مُوقلم اور رنگوں سے اپنی انفرادیت کا اور اپنی جامع تکنیک کا ثبوت دیا ہے جو اس کے فنی محاسن کا شیوہ رہا ہے۔ فضا اور ماحول کا رشتہ مُستحکم ہے۔ وُہ اپنی صلاحیتوں سے ایک جست میں اس مقام تک پہنچ جاتا ہے جو اسے تہذیب و تمدن کے بڑے عمیق مطالعہ سے حاصل ہوا ہے۔

انفرادیت اور اس کی اہمیت، مشرقی مصوری کے کلاسیکی رجحانات اور کلاسیکی اثرات ہمیشہ ایک ہی اصول پر مبنی رہے ہیں۔ چغتائی نے ان حقیقتوں کو کچھ اس طور پر اپنے فن میں جگہ دی ہے کہ وُہ آج کا انسان ہونے کے باوجود گذشتہ نادرہ کاری اور سحر نگاری کا علمبردار معلوم ہوتا ہے۔ اس کا فن، اس کا ہُنر چغتائی اسکول اور چغتائی طرز نگارش سے موسوم کیا جائیگا وہ زندہ تابندہ کہلائے گا۔ کیونکہ اس نے مشرق کو مشرقی طرزِ نگارش، مشرقی شکوہ، مشرقی غنا اور اس کی انفرادیت سے مالا مال کیا ہے۔ جہاں تک ریاضت اور ذمہ داریوں سے عُہدہ برآ ہونے کا تعلق ہے وُہ اپنے اصلی مقصد میں کامیاب ہے انتہائی درجہ کامیاب ہے۔ اس کے فن میں اس کا فکر، اُس کا ذہنی شعور، نظریۂ حیات، مواد و ہیئت اس درجہ پایۂ تکمیل کو پہنچ چکا ہے کہ وُہ بین الاقوامی شُہرت سے ہمکنار ہے ؎

چنگ تیموری شکست آہنگِ تیموری بجاست
سر برون می آرد از سازِ سمرقندے دِگر

از بزمِ جہان خوشتر از حُور و جنان خوشتر
یک ہمدمِ فرزانہ وز بادہ و پیمانہ
در دشت جنونِ من جبریل زبُون صیدے
یزدان بہ کمند آور اے ہمتِ مردانہ

چہ خواہم درین گُلستان گر نہ خواہم شرابے، کتابے، رُبابے، نگارے

JAHANGIR AND NURJAHAN

Chughtai, the idealist, always likes to depict his theme with symbolic and characteristic idealization. This historical pair is representative of our culture and our will to maintain our distinct identity. Chughtai created dignity and personalities of the superior race in a new form. The painting stands alone for "the case of development and rebirth" the glorious tradition of art and culture. This outlook enables Chughtai to find the external evidence and composition with meditative approach. The colourful past expresses the feelings with all strange lines and harmony of the generation. The composition shows the new form of thinking, it is undoubtedly impressive and lovely.

"LOVE SUFFICES MEN, ANIMALS, AND INSECTS;
LOVE ALONE SUFFICES THE TWO WORLDS".
LOVE WITHOUT POWER IS MAGIC,
LOVE WITH POWER IS PROPHECY.
LOVE COMBINED BOTH IN ITS MANIFESTATIONS,
LOVE THUS CREATED A WORLD OUT OF A WORLD.

IQBAL.

برقِ نگاہ

ملے گا منزلِ مقصود کا اُسی کو سُراغ
اندھیری شب میں ہے چیتے کی آنکھ جس کا چراغ

اقبال
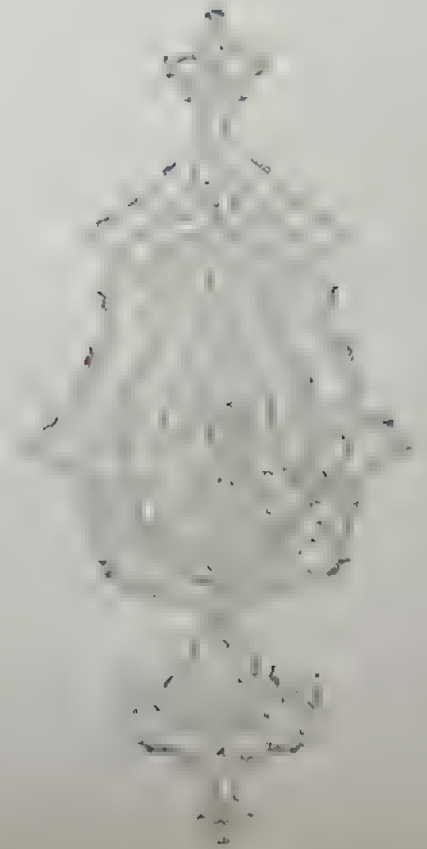
برقِ نگاہ

یہ تصویر محض سیاہ چیتے کی یا ایک خونخوار درندے کی نہیں یہ اس سرشت کی ترجمان ہے، جو اس درندے کی فطرت ہے جو برق نگاہ اور ہمتِ بلند کے ساتھ ساتھ بے خوف جست اور مضبوط گرفت رکھتا ہے۔ اسے اپنی سرشت کی بناء پر ہی دوسروں پر فوقیت حاصل ہے۔ اقبالؔ ہو یا حافظؔ ہر برق نگاہ اپنے فطری رجحانات کے زیرِ اثر اپنی طرف کھینچتی ہے۔ نگاہ کی کشش اور حسن کا سحر محبوب میں ہو یا مارِ سیاہ میں، اپنی دلکشی سے مسحور کر لیتا ہے، اور نگاہ کی یہ برق اور حسن کا یہ سحر ایک عام انسان یا ایک عام درندے میں تلاش نہیں کیا جا سکتا۔ یہ دلکشی آرٹسٹ اور شاعر کے تخیل، اور فنی جوہر سے سنورتی اور نکھرتی اور سحر بنتی ہے۔ حافظؔ بھی جو بقول علامہ اقبال کے قنوطیت کا سالار سہی جب اس سرخوشی میں ڈوب کر کچھ کہتا ہے تو اس کی رجائیت کا مقابلہ دشوار ہو جاتا ہے ؎

زخانقاہ بہ مے خانہ زدو حافظؔ
مگر ز مستی زہدِ ریا بہوش آمد

یوں تو چغتائی نے قالین کی گلکاریاں، گل و غنچہ، محبوب و حسنِ محبوب، شاہ و گدا، امیر و دریوزہ گر، مزدور، اور کسان، غرض کسی چیز کو رنگ و خط کے سانچے میں ڈھالنے میں کمی نہیں کی۔ مگر اس نے چرند، پرند اور درندوں کی طرف بھی کم توجہ نہیں کی انسان کو گھلو زندگی میں بلبل کی سحر بیانی، کبوتر کے تنِ نازک اور طوطے کی چشمِ بے مروت سے سابقہ پڑتا ہے لیکن اسکی بے نیازی اسے ان کی سرشت کی طرف توجہ کرنے کا موقع نہیں دیتی۔ مگر اقبالؔ کی برق نگاہ کرگس و شاہین، ممولے و شہباز، بلبل و زاغ اور شیر و چنگ کو نظر انداز نہیں کرتی۔ وہ ہر ایک سے اسکی فطرت کے مطابق زیادہ سے زیادہ متاثر ہوتا ہے۔ اور ان کے رجحانات کو انسان کی نجات کا ذریعہ خیال کرتا ہے۔

چغتائی کا سیاہ چیتا زندگی کے ان مسائل پر کھلا تبصرہ ہے جس میں ترغیبات جستجو، جرأت اور رعنائی سبھی کچھ ہے مطالعہ بتاتا ہے کہ انسان ازل سے ان برق رفتار قوتوں کا پیچھا کرتا چلا آیا ہے اور ان بے پناہ خصلتوں سے نبرد آزما رہا ہے۔ اور یہ ہنگامہ آرائیاں مختلف پیرایوں میں اس کا مستاح بھی ہیں۔ چغتائی نے اپنی مصوری کی وسعتوں کو پھیلانے میں فیضان کی کیا کیا راہیں پیدا کی ہیں۔ اور وہ موضوع کن کن گوشوں سے گذرا ہے۔ اس درندے اور اس خوں خوار سیاہ چیتے کی شخصیت اس کی مظہر ہے۔ اس میں خوف و ہراس نہیں اضطراب اور بے چینی نہیں۔ ایک ولولہ اٹھتا ہے۔ ایک جذبہ اندر ہی اندر کروٹ لیتا ہے۔ اسکے قریب جانے کے لئے، اس کا قرب حاصل کرنے کے لئے اسکی نرم و نازک جلد کو مس کرنے کی لذت حاصل

کرنے کی ترغیب پیدا ہوتی ہے اور یہ محسوس ہونے لگتا ہے کہ ہم بلاخوف وخطر اس کے قریب تر ہوتے جا رہے ہیں۔ اس لگاؤ اور کشش کی بنا پر جو کشاں کشاں ہمیں اس کی طرف کھینچے لئے جا رہا ہے۔ یہ یگانگت اور ہم آہنگی آرٹسٹ کے کمال فن اور جمالیاتی حسن کا سحر ہے اس ہیئت کا کرشمہ ہے جسے اس کے فنی محاسن اور انہماک نے اپنے مقاصد کو کامیاب بنانے میں استعمال کیا ہے۔ اقبال کے ہاں ایسے پُراسرار گوشے جابجا ملتے ہیں جہاں خود اعتمادی اور خودداری کو اُجاگر کرنے کے لئے جامع تشبیہوں کو کام میں لایا گیا ہے۔ ان کا مقصد یہ ہے کہ عقل کی حیلہ سازیوں کے مقابل عشق کی جست بیکراں اور کامران نظر آئے۔ دل چاہتا ہے کہ دیکھتے رہیں۔ یک زندہ شکارگاہ ہو، چیتے ہوں، شیر ہوں، اور ہم بلاخوف وخطر ان قوتوں سے نبرد آزما ہوں جن سے زندگی قدم قدم پر اپنی بقا کے لئے برسرِ پیکار رہی ہے۔

جب یہ تصویر یورپ اور ہندوستان کی مختلف نمائشوں میں پیش ہوئی تو اس پر بڑے مبصرانہ ذہین تبصرے کئے گئے۔ ایک مغربی عورت نے جو ذہین ہونے کے علاوہ بڑی ژرف بین بھی تھی بڑے مؤثر الفاظ میں کہا تھا کہ چغتائی خود بھی تو ایک خونخوار چیتا ہے جو دوسروں پر حملہ آور ہوتا ہے اور وار کرتے وقت اسے یہ احساس نہیں رہتا کہ اسکے لگائے ہوئے زخم مندمل بھی ہو سکیں گے یا نہیں۔

علامہ اقبال نے تصویر دیکھی تو فرمایا، چیتے کی نگہ کسی ترک کی نگہ ہے۔ تاثیر نے دیکھی تو بولے کتنا بھی کہوں کہ یہ تصویر چغتائی کی نہیں۔ مگر اس کے فن کی گہرائیوں کو کون چھپا سکے گا۔ چیتے کی نشست، اسکی انفرادیت، رنگوں کی آمیزش۔ پس منظر کی جھلکیاں، یہ ملکہ کسے حاصل ہوگا۔

شاہین من بصید پلنگان گذاشتی
ہمت بلند چنگل و زین تیز تر بدہ

دلِ بیدار پیدا کر کہ دل خوابیدہ ہے جب تک — نہ تیری ضرب ہے کاری نہ میری ضرب ہے کاری
مشامِ تیز سے ملتا ہے صحرا میں نشاں اس کا — ظن و تخمیں سے ہاتھ آتا نہیں آہوئے تاتاری

شاہیں کا جگر پیدا کر چیتے کا تجسس۔ اے مردِ مسلماں!

THE BLACK PANTHER

The chief characteristic of Chughtai as an artist, is his representation of unusual subjects. This fact is the utmost importance for an artist, without it all other endowments are almost useless.

In this painting, Chughtai, ventures supreme harmony and powerful representation of colours in red, green and dominating black, with unexpected muscial rhythm and intensity of observation.

The Black Panther is constantly seeking the bush. This unique approach of the animal is depicted by the artist, reveals his master attitude of creating things.

"COME INTO CONFLICT WITH SEA AND GET ENTANGLED WITH ITS WAVES,
FOR ETERNAL LIFE IS IN CONFLICT AND STRIFE TO BE SURE!
"LIFE IN THIS WORLD DEPENDS ON MOTION,
IT IS AN OLD CUSTOM OF THIS SCENE OF EXISTENCE.

IQBAL
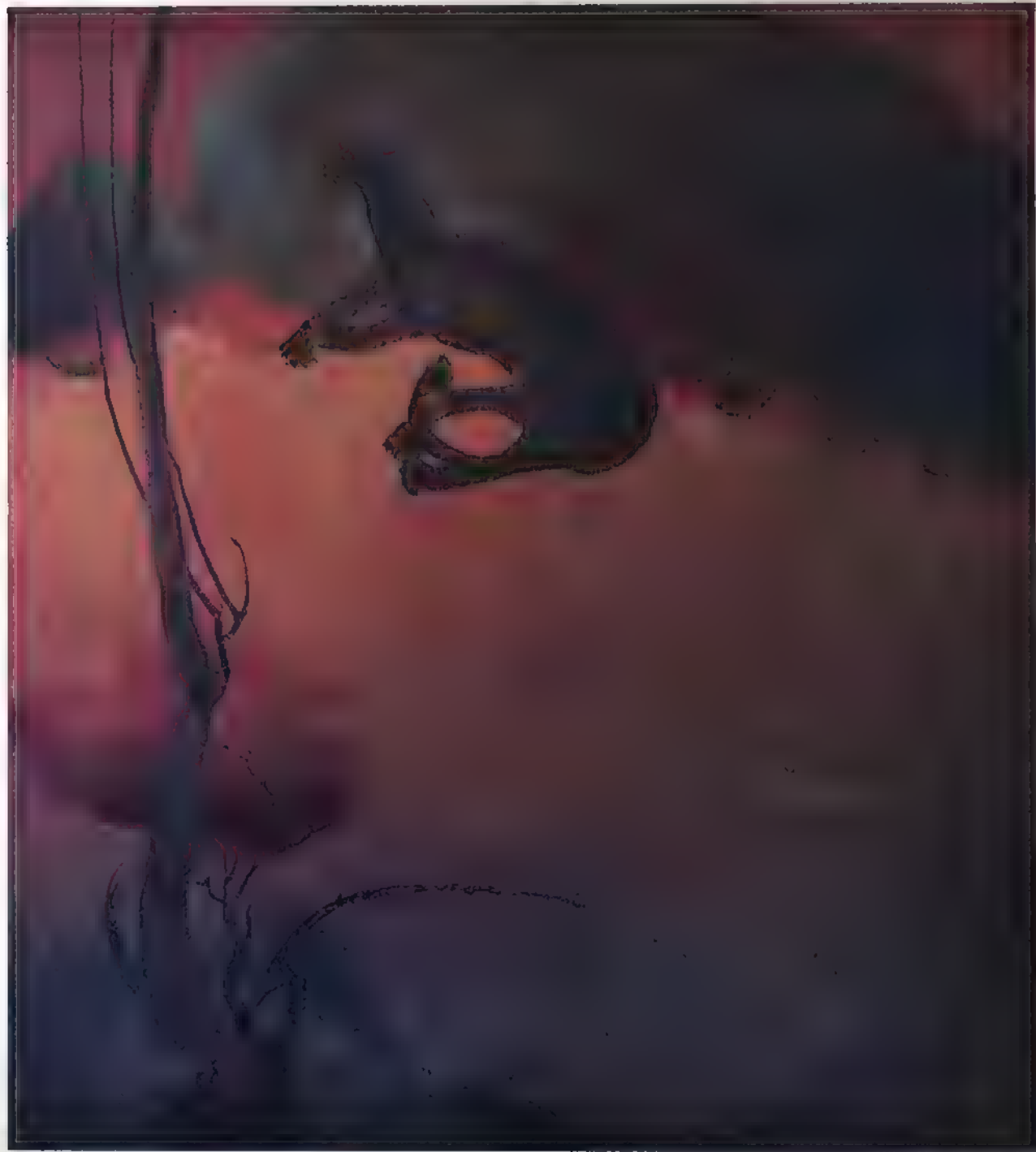
سوزِ درُوں

یوں تو روشن ہے مگر سوزِ درُوں رکھتا نہیں
شعلہ ہے مثلِ چراغِ لالۂ صحرا ترا

اقبال
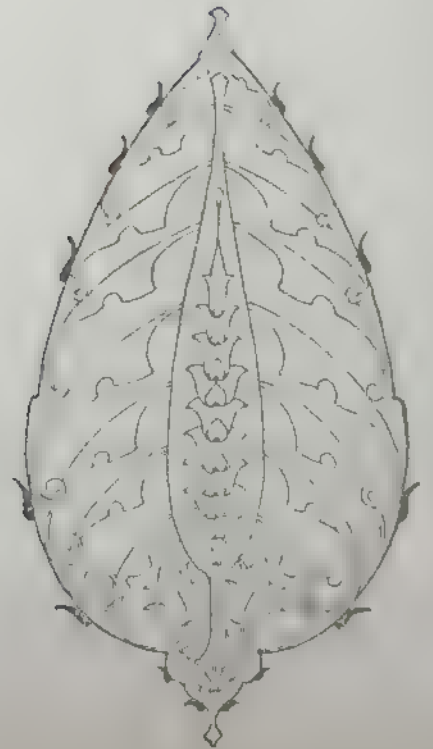
سوزِ دُروں

چغتائی کے بیان کے مطابق اس کی مصوری میں شمع اور پروانوں کو بڑی اہمیت حاصل رہی ہے۔ اور اس نے اس موضوع پر بڑی دلچسپ اور انفرادی تصویریں تخلیق کی ہیں۔ یہ ایک واقعہ ہے کہ اس کی رنگ آمیزی نے جدید ہندوستانی مصوری کو نیا رُخ دیا۔ اور اس موضوع سے اس کا گہرا تعلق رہا ہے۔ وُہ اس تخیل کی دُھن میں بہت سی ایسی منزلیں طے کرتا چلا گیا جو آگے چل کر فن کی پختگی میں اس کے بہت کام آئیں۔ شمع اور پروانوں کی کوئی تصویر ہو سوزِ دروں کا درجہ رکھتی ہے۔ اس موضوع کی ترجمانی کے لئے راہیں بھی کچھ ایسی کشادہ ہیں کہ ان پر جی بھر کر طبع آزمائی کی جا سکتی ہے۔ کل کی بات ہے ہماری زندگی میں شمع کو بڑی اہمیت حاصل تھی۔ شمع اور پروانوں کا تماشا روز و شب کا افسانہ تھا۔ اس میں کچھ عبادت اور خلوص کی عقیدت مندی تھی اور کچھ روایات کی تاثیر۔ یہی شمع تھی جس سے غریب کے جھونپڑے میں بھی اُجالا تھا اور بادشاہ کے محل میں بھی۔

ہر شب تاریکی کی تہوں میں مندروں، معبد خانوں اور مسجدوں میں یہی احساس کروٹیں لیتا رہتا تھا۔ شام ہوتے ہی بقول بعض روحیں شمعوں کی تلاش میں جمع ہو جاتی ہیں اور ہمارے اعمال کی نگہداشت کرنے میں ہمارے ساتھ ساتھ رہتی ہیں۔ اس تصویر سے آرٹسٹ کا مقصد خواہ کتنا ہی جذباتی ہو وہ ان حقیقتوں کا آئینہ دار ہے جن کے وجود سے قربانیاں ظہور میں آتی ہیں اور زندگی کا سوز و ساز عملی صُورت اختیار کر لیتا ہے۔ چغتائی کی یہ تصویر اقبال کے اس فکر کی آئینہ دار ہے جس سے سوز و سوزِ دروں زندگی کی لذتوں سے مالا مال نظر آتا ہے۔ مضمون آفرینی اور فنی انہماک کا امتزاج ان جذبات کو اُبھارتا ہے جو عورت کے خد و خال سے نمایاں ہے۔ یہ تاثر، یہ ولولے صرف عشق و محبت کے جنوں سے پیدا ہوتے ہیں۔ یہ عمیق اور جامع تصویر فنکار کے تاثر کو مؤثر بناتی ہے۔ تصویر سراپا وجدان اور والہانہ احساس بن گئی ہے۔ اس کے متوالے جھوم جھوم کر جانیں دے رہے ہیں۔ اقبال نے ان عمیق اور پیچیدہ مسائل پر بڑے فکر اور وضاحت سے روشنی ڈالی ہے۔ پروانوں کی تڑپ اور جگر سوزی زندگی کے نظریوں اور قدروں کو بلند کرنے کی دعوے دار ہے۔

چغتائی کے ہاں تشبیہوں اور استعاروں کی کمی نہیں۔ وہ ہر بار اپنے تخیل کو ایک نیا رُوپ دیتا ہے۔ اور اس رُوپ میں کئی دھارے مل جاتے ہیں۔ وُہ ایک شاعر کی طرح اپنے موضوع کی وحدت کو شمع اور پروانوں سے، پھولوں اور پھولوں کے رنگوں سے، رحل اور کتاب سے، تلوار اور ڈھال سے، کھجور اور اُونٹ سے گہری تاثیر کا حامل بنا دیتا ہے۔ عورت کے چہرے پر اثر آفرینی، تاثر اور یک سُوئی ہے۔ اندرونِ سینہ مُسکراہٹ کروٹ لینے کو ہے، اور وہ اس ہیجان میں خود محوِ تماشا ہے۔ آرزوؤں کی کشمکش ہے اور قربانی کا جذبہ کارفرما ہے۔ ہر پروانہ عشق کی قربان گاہ پر قربان ہو جانے کو مقدم سمجھتا ہے۔ بغیر آرزوؤں کے

اور بغیر آواز کے نغموں کا ارتعاش زندگی کے انگ انگ میں سمائے جا رہا ہے۔ تصویر وجدانی کیفیات اور سوز و ساز کی ایک ابدی داستان ہے۔

چغتائی کی مصوری کے ابتدائی دور میں شمع اور پروانوں کو بڑی اہمیت حاصل تھی۔ اس کے موضوع کی مختلف شکلیں تھیں۔ ان میں رُوحانی اور رومانی کشمکش اور وہ جوش و خروش بھی تھا جو اس عمر کا حصّہ تھا۔ اس نے اُن دنوں ایک تصویر دسی کی بنائی جو بدھ کے چرنوں میں دیا جلائے بدھ سے لو لگائے، بدھ کے کارن بدھ بنی بیٹھی تھی۔ اس نے ایک تصویر ایک اُجڑی ہوئی درگاہ اور شمع کے نام سے تخلیق کی جو دائسرائے ہند نے خرید کی تھی۔ اس کی تصویر شمع و چاند، جنگ اور کھلا دروازہ، بچہ اور شمع، رحل، قرآن اور شمع اسی طرح کی تصویریں ہیں۔ اس کی ان تصویروں کی شہرت نے بڑے بڑے نقادوں کو اپنی طرف متوجہ کیا۔ اس کی اتھاہ گہرائیوں اور اس کی فضا بندی اور کیفیات سے وہ لوگ بھی چشم پوشی نہ کر سکے جو چاہتے تھے کہ چغتائی کا آرٹ پھلنے پھولنے نہ پائے ؎

یہ آگہی مری مجھے رکھتی ہے بے قرار
خوابیدہ اس شرر میں ہیں آتشکدے ہزار

دلا نارائی پروانہ تا کے
نگیری شیوۂ مردانہ تا کے
یکے خود را بسوزِ خویشتن سوز
طوافِ آتشِ ہنگامہ تا کے
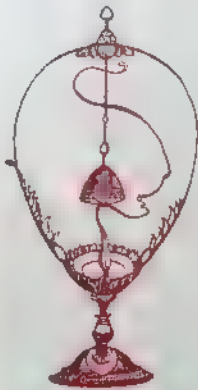
یہ امتیازِ رفعت و پستی اسی سے ہے
گُل میں مہک شراب میں مستی اسی سے ہے

THE FLAME OF LOVE

This picture shows the expression of love. It is a contribution in art as well as in the literature. Here growth of the flame of love is expressing unique beauty. Chughtai's ideal of culture and his poetic sensibility is of supreme importance for the burning heart. Composition of painting and his endless observation are remarkable. Here the preference of the artist lies in the warm tone of colours. Chughtai got international fame in the history of Modern movement of Indian Art, for having luminous intensity unsurpassed.

"A MOTH, AND WHAT A YEARNING FOR THE SIGHT OF LIGHT:
A TINY INSECT, AND WHAT A CONSUMING DESIRE FOR LIGHT!
"FOR LONG, I HAVE BEEN BURNING MY BREATH LIKE THEE;
NOT A SINGLE MOTH FLUTTERED IN GOING ROUND MY FLAME.
WHENCE HAST THOU GATHERED THIS WORLD-ILLUMINATING FIRE?
THOU HAST TAUGHT THE POOR MOTH THE 'BURNING OF MOSES'.

IQBAL

مردِ حُرّ

کم نگاہاں فتنہ ہا انگیختند
بندۂ حق را بدار آویختند

اقبال
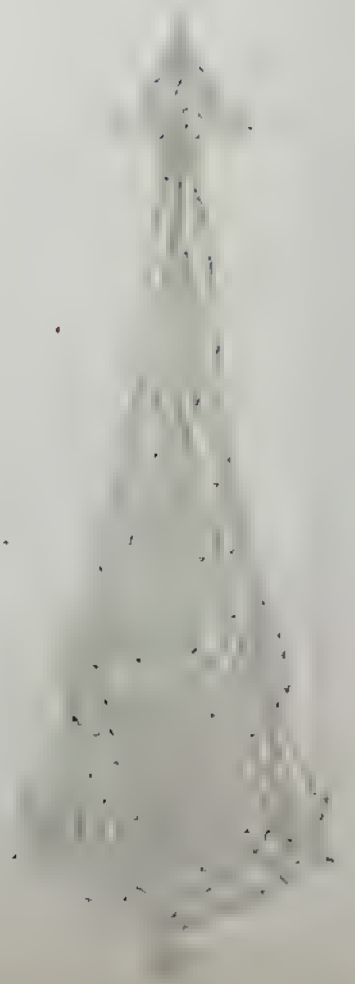
ایچنگ کا یہ شاہکار چغتائی کی کندہ کاری کا ایک اعلیٰ نمونہ ہے۔ یہ فن ہمارے ہاں صدیوں سے مفقود چلا آتا ہے۔ آہستہ آہستہ اس صنعت کے گم ہوجانے کا احساس بھی جاتا رہا۔ جب اس نے جنم لیا تھا تو اس کی شکل و صورت یہ نہ تھی۔ اس سے خنجروں اور تلواروں پر نقش نگار کیے جاتے تھے۔ توپوں پر نشانہ ہی اور گل کاری کی جاتی تھی۔ کندہ کاری کی صنعت سے اور بھی ضرورتیں پوری ہوتی تھیں۔ مگر اس کی نہ تو یہ شکل صورت ہوتی تھی اور نہ یہ مدعا۔ چغتائی نے اپنی انفرادیت سے اس آرٹ کو بڑے شعور اور انہماک سے اپنے آرٹ میں جگہ دی ہے۔ مغرب کے اس آرٹ کو ایسے مشرقی سانچوں میں ڈھالا کہ مقبولیت کے ساتھ ساتھ اس کی قدر و منزلت کی راہیں بھی نکل آئیں۔ مغرب کے بڑے بڑے مبصروں نے اسے سراہا اور چغتائی کی انفرادیت کا اعتراف کیا۔ ویسے یہ آرٹ مغرب میں خصوصیت سے جرمنی میں تیرھویں اور چودھویں صدی عیسوی میں رواج پا گیا تھا اور تکمیل کی منزلیں طے کرتے کرتے یہ آگے بڑھا اور دیکھتے دیکھتے سارے یورپ پر چھا گیا تھا۔ اس میں ایسے ایسے باکمال آرٹسٹ پیدا ہوئے ہیں کہ ان کی کندہ کاری کے اکثر نمونوں کے کاغذی چھاپے نے کئی کئی لاکھ روپے قیمت وصول کی۔ کندہ کاری کے فن کاروں میں ڈیوڈر، اَسٹڈلے اور ریمبراں خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ ان کے بعد وسلر، مارٹن، زورن، فورین، برینگ وِن، بانز اور پکاسو نے اپنی زندگیوں میں اس قدر شہرت حاصل کی کہ عقل حیران رہ جاتی ہے۔

اقبال کا نظریۂ فن جلال و جمال، قوت اور عظمت پر منحصر ہے۔ چغتائی کی یہ تصویر اقبال کے نظریۂ فن پر کچھ اس طرح پوری اترتی ہے کہ اس کا ایک ایک خط اور نقش زندگی کے جلال و جمال اور عظمتِ آدم کا سراپا ہے۔ تصویر کا موضوع ان وسعتوں کا پتہ دیتا ہے جو اقبال کے مردِ مجاہد اور مردِ حُر کے ساتھ وابستہ ہیں۔ اقبال کا نظریۂ فن برائے فن یا فن برائے زندگی سے کتنا ہی مختلف ہو اس سے ان کی عظمت اور نظریۂ فن پر کوئی حرف نہیں آتا۔ ایسے ہی جیسے چغتائی کے نزدیک فراعنۂ مصر کے معبد خانوں میں جدھر نظر اٹھاؤ آرٹ فرعونوں پر بھی غالب نظر آتا ہے۔ وہ انسانی عظمت کا یقین دلاتا ہے اور تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ خدا کی خدائی میں وہ فن کار جلال و جمال کے زندہ خدا تھے۔ ان کی فطرت اور روح کی بالیدگی نے ہمیشہ ان کا ساتھ دیا۔ اور ایسا نظر آتا ہے کہ آخیر دم تک ان کے قوار اور حواس شل نہ ہوئے تھے۔ وہ بڑے اعتماد سے اپنی قوتِ ارادی کا مظاہرہ کرتے رہے۔ اور ان پر ان بخششوں کا دروازہ بند نہ ہوا جو انہیں ودیعت کی گئی تھیں۔ چغتائی نے فراعنۂ مصر کے مجسموں اور آرٹ پر کئی مضمون لکھے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ ان خالق فن کاروں نے اپنے خداؤں کے جلال و جمال کو پتھروں میں سمو کر زندۂ جاوید بنا دیا ہے۔ جہاں تک فن اور زندگی کے رشتہ کا تعلق ہے فن کو فن کی رو سے کسی ایک دائرے میں مقید نہیں کیا جا سکتا۔ آخر نظریہ کچھ ہی ہو علامہ اقبال

خود بھی ان کی عظمت و جلال و جمال سے متاثر تھے۔ اور ان کے نزدیک فراعنۂ مصر کے فن میں زندگی پرور صلاحیتیں و اوصاف بدرجۂ اتم موجود تھے۔ چغتائی نے مردِ حُر کے چھلکتے ہوئے پیمانہ میں زندگی کی کیفیتیں اور ارادوں کی وسعتیں بھر دی ہیں۔ اس کی خودی اور انا ایک ایک خط سے پُورے طور پر جلوہ گر ہے۔

چغتائی کی یہ کندہ کاری محض اختراع نہیں۔ اس نے اپنے آہنی قلم سے اور اعتمادِ عمل سے ہر خط میں ایسی کیف پرور کیفیت بھر دی ہے کہ مردِ حر مصر کے معبد خانوں سے چٹان کی طرح اس خدا کی تلاش میں نکل آیا ہے جس نے اُسے بنایا ہے۔ رحمتیں اور برکتیں اس کے ساتھ ہیں، اور وہ لوگ بھی جو اس پر ایمان رکھتے ہیں۔ ہمتوں کا جوش اور دلوں کا سیلاب سرگرم زندگی ہے تخلیقی اقدار کے نشوونما کا سلسلہ ذہنی فضا میں پھیلتے پھیلتے حدِ نگاہ سے جا ٹکرایا ہے۔ مردِ حُر کی شخصیت اور آلام سے اس کی بے نیازی اس کی برتری کو اور نمایاں کر رہی ہے۔ اس کے والہانہ عشق نے عقل کی ہمدمی سے نجات حاصل کر لی ہے۔ مردِ حُر کی آواز، اس کی پکار اور لَے نے آسمانوں میں شگاف ڈالنے کی قوت پائی ہے۔

تیری زندگی اسی سے تیری آبرو اسی سے
جو رہی خودی تو شاہی نہ رہی تو رُوسیاہی

ازل سے فطرتِ احرار میں ہیں دوش بدوش
قلندری و قبا پوشی و کلہ داری

زمانہ لے کے جسے آفتاب کرتا ہے
اُنہیں کی خاک میں پوشیدہ ہے وُہ چنگاری

کافر کی یہ پہچان کہ آفاق میں گم ہے
مومن کی یہ پہچان کہ گم اُس میں ہیں آفاق
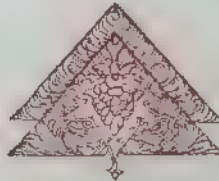
HIS OWN PASSION

Chughtai is very much inspired by this original theme. He puts it in a new light with his masterly skill, designing power, the sensibility of drawing, great draftsmanship and composition to reveal something new of the tender heart and understand the fascinating mystic touch and glamour of divine subject. His impression in green is definately an important design and tallies with the subject. By employing romanticism and classicism, Chughtai is not a confusion but a synthesis. There is a good deal of mystery in the colours of human faces which he tries to reveal in his pictures.

"WHAT IS A MOMIN'S FAQR? CONQUEST OF TIME AND SPACE;
IT ENDOWS A SLAVE WITH THE ATTRIBUTES OF THE MASTER!
"THE CODE OF MEN OF COURAGE IS TRUTH AND FEARLESSNESS,
GOD'S LIONS KNOW NOT THE CUNNING OF A FOX.

IQBAL

زبیدہ خاتون

غرض میں کیا کہوں تجھ سے کہ وہ صحرا نشیں کیا تھے
جہاں گیر و جہاں دار و جہانبان و جہاں آرا

اقبال

زبیدہ خاتون
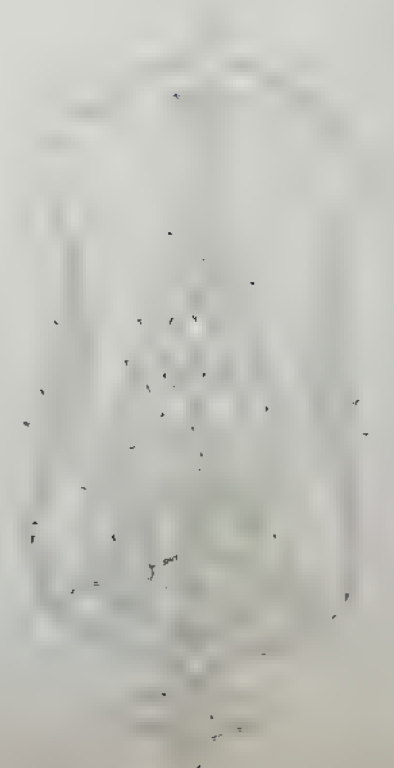
زبیدہ خاتون کا نام آتے ہی عورت کے وقار اور عظمت کا مجسمہ سامنے آن کھڑا ہوتا ہے۔ وقار اور عظمت کا یہ تصور اس خاتون کی جامع شخصیت سے ابھرتا ہے جسے خلیفہ ہارون الرشید کی چہیتی اور دل نواز ملکہ ہونے کا فخر حاصل ہے۔ تاریخ بار بار اس خاتون کے کردار کی اہمیت کو دُہراتی ہے۔ اسی معزز نام سے خلفائے عباسیہ کا خاندانی سلسلۂ نسب و نسل قائم ہے۔ اور اُن کی خاندانی روایات محفوظ ہیں۔ یہ روایات اس ثقافتی نظام کی ضامن ہیں جس نے فکر کے خزانوں کو اپنی دریا دلی سے حیاتِ نو بخشی تھی۔ اور ایک ایسا اثر آفرین انداز پیش کیا تھا کہ زمانہ اُسے مٹا نہیں سکا۔ زندگی کی ہما ہمی اور جاہ و جلال ان کے ساتھ زندہ تابندہ ہے۔

چغتائی نے زبیدہ خاتون کے کردار کی اہمیت کو اس خوبصورتی سے تصویر کے پیکر میں اُتارا ہے۔ کہ اس کا سراپا اس عورت کا سراپا ہے جس نے اپنے وقت میں ہزاروں اور لاکھوں دلوں پر حکومت کی تھی۔ آرٹسٹ ہو یا شاعر دونوں کو کسی فکری نتیجے پر پہنچنے کے لئے کردار ہی کی مدد سے اجتماعی زندگی کا جائزہ لینا پڑتا ہے۔ کردار ہی سے تخلیق کے جوہر نکھرتے اور ابھرتے ہیں۔ اور حسن و جمال اور جاہ و جلال کا یہ پیکر مصور کے رنگوں اور خطوں کے انداز میں اس طور پر مصور ہوا ہے کہ اگر اس تخلیقی پیکر کے کھڑے ہونے کے انداز اور فنی شعور اور اسلوب کی حدبندی کی طرف توجہ دی جائے تو پتہ چلتا ہے کہ آرٹسٹ نے اس زندہ کردار کو ثقافت اور تہذیب کا نمائندہ کیوں منتخب کیا ہے۔ اور کیوں اس کردار کی اس اہمیت سے کام لیا ہے جس سے بقول علامہ اقبالؒ خودی، انانیت اور جلال و جمال کی تشکیل ہوتی ہے۔

تصویر سے ملکہ کے جاہ و جلال کا اور اُس کے پُروقار اور معزز چہرے پر ان تمام صلاحیتوں اور ان بشارتوں کا اظہار ہوتا ہے جو فطرت نے اُسے عطا کی تھیں۔ یہ تصویر فن کا ایک معجزہ ہے۔ ہاتھوں کی ترتیب و بندش اور اسکی مخروطی انگلیاں عمل کی اس فطری بلندی کی مظہر ہیں جو ملکہ کا کردار تھا۔ اس کے انداز و اطوار میں خلفاء کے زمانے کی معزز عورتوں کی زیبائش اور لباس کا نقشہ آنکھوں کے سامنے پھر جاتا ہے۔ چغتائیؒ کو شبیہ نگاری اور کردار سے گہرا لگاؤ ہے۔ وہ اپنے رنگوں کے امتزاج اور اُن کی حلاوت سے ایک سحر پیدا کر دیتا ہے۔ اس کی طرز نگارش میں استعاروں اور نازک نازک لطافتوں سے اتنی مناسبت اور گہرائی اُتر آتی ہے کہ ہر پیکر ایک دلکش اور رُوح پرور شاہکار بن جاتا ہے۔ تصویر کے مطالعہ سے اس کی شخصیت اور اس کے فن کی خوبیوں کا اعتراف کرنا ہی پڑتا ہے۔ زبیدہ خاتون کا سراپا زندگی کے جوہروں کا مجموعہ، گہرا بسیط اور پُراسرار ہے۔ تصویر میں رنگوں کا اسلوب اور انتخاب اس درجہ جاذبِ نظر اور خوش آہنگ ہے کہ تصویر ایک نگاہ میں دل و دیدہ کی توجہ کا مرکز بن جاتی ہے

سیاہ لبادہ، تدبّر، حشمت اور وقار کا ایک ایسا نشان ہے جس سے جمالیاتی حُسن کا ہر پہلو اجاگر اور نمایاں ہوتا ہے۔ یہ سلطنت عباسیہ کا طرۂ امتیاز تھی کہ وہ سیاہ لباس پہنتے اور اس جمالیاتی وقار میں دربار کی عظمت سمجھتے۔

یہ تصویر چغتائی کا ایک ایسا نادر شاہکار ہے جس کا بنیادی تصور اور مقصد مُنہ بغیر مطالعہ اور فکری مشاہدہ کے حاصل نہیں ہو سکتا۔ حقائق اور تدبّر کا یہ انداز ان پیکر مستوں کا جویا ہے۔ تصویر کے پس منظر میں آرٹسٹ نے علامت کے طور پر ایک اونٹنی سے کام لیا ہے جس کے بچے ماں کا دُودھ منہ سے لے لے کر پی رہے ہیں۔ یہ تزئین و ترتیب اس نہرِ زبیدہ کی یاد دلاتی ہے جو آج حجاز کے صحراؤں کو اپنے آبِ حیات سے سیراب کرتی ہے۔ اور یہ نہ ختم ہونے والا تسلسل اس خواب کی تعبیر ہے جسے خلیفہ ہارون الرشید کی چہیتی ملکہ **زبیدہ خاتون** نے عالمِ جوانی میں دیکھا تھا۔ نہرِ زبیدہ مست خرام صحرا کے سینے پر روتی بہتی اِن جھلسی ہوئی چٹانوں سے ٹکراتی گرمی کی شدت میں زائرینِ حجاز کو پانی کی قلت سے نجات دلاتی ہے اور صدیوں سے تسکین کی یہ خدمت اس کے ذمّے ہے ؎

تمدّن آفریں خلّاقِ آئینِ جہاں داری
وُہ صحرائے عرب یعنی شُتربانوں کا گہوارا

سماں اَلفقر فخری کا رہا شانِ امارت میں
بآب و رنگ و خال و خط چہ حاجت رُوئے زیبا را

جہاں را محکمے از اُمّہات است
نہادِ شان امینِ ممکنات است
اگر ایں نکتہ را قومے نداند
نظامِ کاروبارش بے ثبات است
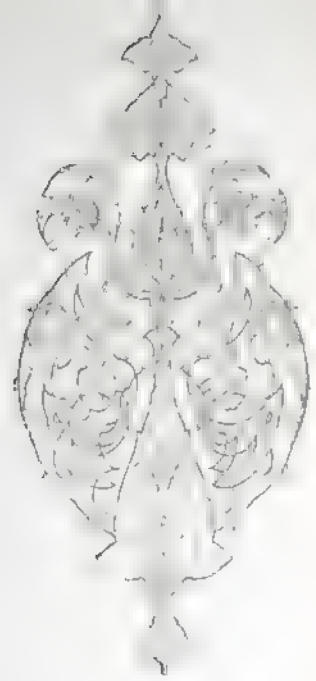
ZABEDA KHATUN

The artistically elevated standing figure of the gentle lady presented at a charming angle, recalls the manner of a Madonna of the Haram.

Chughtai created this masterpiece long ago. In the history of his art he showed characteristics of striking vivid composition and a well composed, dignity of a graceful Royal Lady named "Zabeda Khatun" the beloved wife of the great Khalifa Haroon-Rashid. She is endowed with a charming personality and is still great in the living history of the infinite desert where a canal is named "Zabeda Canal". This Painting is a complete form of grace and dignity and represents the conception of the self in colours. This is one of the most successful painting of Chughtai which won him world wide fame.

"OWING TO MOTHERHOOD, THE SPEED OF LIFE IS HOT, MOTHERHOOD DISPLAYS THE SECRETS OF LIFE TO SHINE!

IQBAL

خرقہ پوش

عالم ہے فقط مومنِ جاں باز کی میراث
مومن نہیں جو صاحبِ لولاک نہیں ہے

اقبال
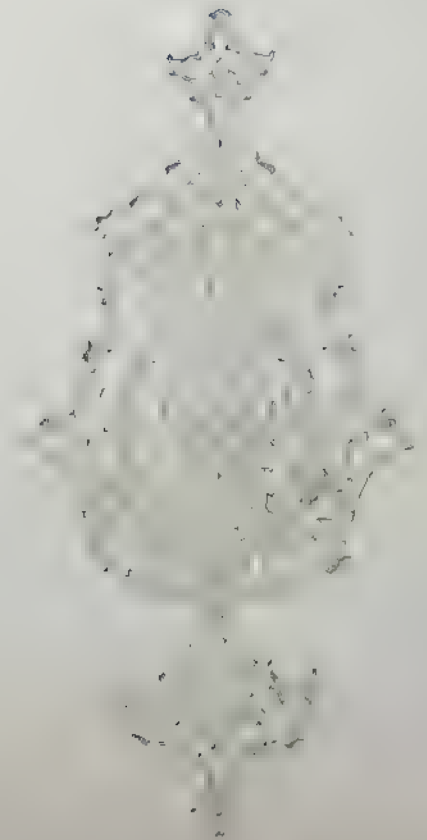
خرقہ پوش

جب سے دُنیا بنی ہے ذاتِ باری کے تصوّر میں غرق رہنا انسان کی زندگی کا مقصد رہا ہے۔ اقبال جب مردِ مومن مردِ مجاہد اور مردِ حُر یا خرقہ پوش کا ذکر کرتا ہے تو مطالعہ نگار کے دل و دماغ میں آگے بڑھنے اور انقلاب بپا کرنے کی تحریک پیدا ہوتی ہے۔ اور یُوں محسوس ہوتا ہے کہ ہم جانی پہچانی منزل کی طرف چل رہے ہیں۔ اور یہ کامل لوگ اور ان کے کردار ہمارا سہارا ہیں۔ دائمی نارسائی اور کمزوری کی بدولت زندگی کی جدّوجہد میں یہ کردار دوسروں پر شرف رکھتے ہیں۔ ہم ہر لمحہ انکے متعلق یہ سوچنے پر مجبور ہوتے ہیں کہ انسان کے تنزّل اور انتشار کا علاج ان ہمہ گیر شخصیتوں کے سوا اور کہیں نہیں چغتائی کی یہ تصویر اُن حقائق اور اس ارتقار کی طرف اشارا کرتی ہے جس کا حل سوائے ایک مُرشدِ کامل کے اور کچھ نہیں۔

آرٹسٹ نے اپنی اس تخلیق میں اپنے فن کا مظاہرہ بالکل اچھوتے انداز میں کیا ہے۔ اسے رنگوں کیساتھ ساتھ اپنے برش اور اپنے خطوط پر اس قدر قدرت حاصل ہے کہ وہ تلوار کی سی تیز دھار کے وہ تمام امکانات خطوں میں پیدا کرلیتا ہے جن کا اظہار رنگوں میں بھی کم نظر آتا ہے۔ مشرق کی فنّی برتری میں خطوط کا بہت بڑا حصّہ ہے۔ اس فن کی پختگی کی اس جامعیت اور تکنیک سے متاثر ہوکر ایک موقع پر ایک مغربی مبصّر نے بڑے شوق سے لکھا تھا کہ چغتائی کا برش خطوط کی روانی اور لوچ لچک پر بڑا قابو رکھتا ہے۔ وُہ اس خود اعتمادی سے اپنے بُرش کو دائیں سے بائیں اور بائیں سے دائیں گُھماتا ہے جیسے ایک ماہر شمشیر زن اپنی تلوار سے کھیلتا ہے۔ یہ خطوں سے تخلیق کی ہوئی تصویر اختصار کے باوجود اتنی مفصّل ہے کہ اس کی بڑی بڑی رنگین تصویروں پر سبقت لے جاتی ہے۔ جب ایک جاپانی آرٹسٹ نے سُنا کہ وہ اپنی اس طرزِ نگارش کی تصویروں کو اپنے مُوقلم سے تکمیل دیتا ہے تو متاثر ہوکر بولا۔ آرٹسٹک جاپان میں چغتائی کا مقام پرستش کئے جانے کے قابل ہے۔ جب اس طرزِ نگارش کی ایک تصویر رائل اکیڈمی لنڈن میں پیش ہوئی تو آرٹ کے مبصّروں نے طالب علموں کو توجّہ دلاتے ہوئے کہا۔ یہ انفرادیت قابلِ دید ہے۔

چغتائی کی یہ تصویر اس کے فن کا ایک زائچہ ہے جس میں اس کے فن کا حال و مستقبل دونوں روشن ہیں دونوں پر اس کی خود اعتمادی اثر انداز ہے۔ چغتائی نے اپنے فن کے ارتقا کے لئے کون کون سے راستے تلاش کئے اور کس عزم سے وُہ آگے بڑھا اور ان پر گامزن رہا۔ یہ بات اِس تصویر سے بخوبی واضح ہے۔ خرقہ پوشی کے رُوپ میں ایک درویش رُوحانی قوتوں اور اپنی قلندرانہ سرمستیوں کے ساتھ اقدارِ حیات کا بڑا اچھا جائزہ ہے۔ یہاں انسانی فطرت اور اسرارِ خودی ضربِ کلیمی کا کام کر رہی ہے۔ چغتائی نے درویش کی بے نیازی اور خود اعتمادی کو خطوں کے تناؤ اور رچاؤ میں یوں سمو دیا ہے کہ ہر بلندی اور پستی اور ہر موج اور ساحل اسکے خرقے کے دامن میں پوشیدہ نظر آتی ہے۔

تصویر کی نگارش اور ترتیب آرٹسٹ کے پیغام اور انفرادیت کی ضامن ہے۔ اور اس کی یہ اختراع مشرق کے فن میں ایک ناقابلِ فراموش ترکہ ہے۔ ہلکے بادامی کاغذ پر مختلف رنگوں کا اختلاط آرٹسٹ کے مرکزی تصور کی رفعت کا مظہر ہے۔ اس نے اپنے موضوع کے لئے جو پس منظر چُنا ہے وُہ استعارات اور فنی اسلوب کا جامع نقشہ ہے۔ اُس نے ایسا ماحول پیدا کیا ہے کہ باوجود ہر نشاط اور عشرت کے خرقہ پوش کا رُتبہ بلند ہے۔ تصویر فنی محاسن کے اعتبار سے ایک قابلِ قدر تخلیق اور ایک قابلِ قدر استدلال ہے۔

آرٹسٹ کے مُوقلم کی قوتیں اور اسکی فنی اُفتاد ان اوصاف کی شاہد ہے جن کی بدولت آرٹسٹ اپنی انفرادیت کا دعوے دار ہے۔ یہ بات چغتائی کے فنی عمل اور کاوشوں کا نتیجہ ہے کہ اس نے اپنی روایات کے تسلسل اور ماضی کی دولت کو زیادہ سے زیادہ روشناس کرایا اور اس میں ایسی چیزوں کا اضافہ کیا کہ ہمارا آرٹ کہیں سے کہیں پہنچ گیا اور ہم ایک نئے فن اور نئی طرزِ نگارش کو نشو و نما پاتے ہوئے دیکھ رہے ہیں اور ہم میں سربلند کرنے کی جرأت پیدا ہو رہی ہے ؎

مہر و مہ و انجم کا محاسب ہے قلندر
ایّام کا مرکب نہیں راکب ہے قلندر

من از بود نبودِ خود خموشم
اگر گویم کہ ہستم خود پرستم

ولیکن این نوائے سادۂ کیست
کسے در سینہ می گوید کہ ہستم

عالم ہے فقط مومنِ جانباز کی میراث
مومن نہیں جو صاحبِ لولاک نہیں ہے

MORE THAN SHADOW

Chughtai's greatest cause of success is his characteristic drawing and force of lines. He has a great command on his pencil and brush. The perfection of the subject which consists of "Like waves" and like edge of sword, is due to his masterly and powerful command of draftsmanship, when he uses the brush in his own way, his tinted lines, bring out more than the meanings and suggestion of sharper lines. They look brighter and the moulding of lines become explicitly tragic.

Like every great artist Chughtai, builds-up his own style. He uses lines to produce different effects to work out the problem. Although, he is influenced by the Mughal and the Persian masters, but he never loses his originality and individuality in his painting. "More than Shadow" is one of his masterpieces.

"THE FORM OF EXISTENCE IS AN EFFECT OF THE SELF,
WHATSOEVER THOU SEEST IS A SECRET OF THE SELF,
WHEN THE SELF AWOKE TO CONSCIOUSNESS,
IT REVEALED THE UNIVERSE OF THOUGHT.

IQBAL

اقبال و رومیؒ

بہ گیر از ساغرش آن لالہ رنگے
کہ تاثیرش دہد لعلے بہ سنگے

اقبال

اقبال و رومی

چغتائی نے جس قدر تصویریں علامہ اقبالؒ کے مصور اڈیشن میں دی ہیں حقیقت میں وُہ سب کی سب آزاد ترجمہ ہیں۔ ایسا ترجمہ جس سے ثقافتی رشتہ مستحکم ہوتا ہے۔ شعر اور تصویر حسبِ مراتب اس منزل کا پتہ دیتے ہیں جہاں جلال و جمال ہم رکاب ذہنی نشوونما کا سہارا ہیں۔ اقبال کی شاعرانہ عظمت اور لازوال شخصیت آرٹسٹ کے رُوئیں رُوئیں میں کچھ اس طرح رچ گئی ہے کہ تصویر کوئی ہو تخیل نگر جب کاغذ پر اُترتی ہے تو وُہ کسی نہ کسی رنگ میں اقبال کی ہوتی ہے۔ پھر وُہ آرٹسٹ جس نے اقبال کو دیکھا ہو کُچھ وقت نشستوں اور محفلوں سے فیض بھی حاصل کیا ہو۔ ہمعصری کا دعویٰ رکھتے ہوئے بھی حاصل نہ ہو سکتیں تو وُہ کیا کرتا پھر وُہ آرٹسٹ جس نے اپنے معاشرے میں مومن قسم کے لوگوں کی سرپرستی میں پرورش پائی ہو۔ جس نے سلطانوں بادشاہوں، ایوانوں، نخلستانوں اور صحرا نوردوں کی داستانیں سُنی ہوں، ایسی تصویریں نہ بنائے تو کیا بنائے گا۔

اقبال اور رُومی متاع کی تلاش میں زمانے کے اُونچ نیچ سے گذر کر زمان و مکان کی حصار بندی کو توڑ کر، ہر بلند و پست کو پھاند کر ایک ایسے اُفق، ایسے لامحدود مقام پر کھڑے ہیں، جہاں عشق کی ایک ہی جست نے اُنھیں مُدعا سے دوچار کر دیا ہے۔ یہ رہبری تخیل اور ذہنی صلاحیتوں سے حاصل ہے۔ جولانیاں پَر تولتی رہیں گی، توانائیاں امکانات کی دیکھ بھال میں جست پر جست لگاتی رہیں گی۔ انسان ان امکانات کی تلاش میں اس وقت تک کوشاں رہیگا جب تک وہ اپنی عظمت کے مطابق معراج حاصل نہیں کر لیتا۔

چغتائی کی تصویر نے مرشدِ رُومی اور علامہ اقبال کو چوٹیاں پھاندتے، جست پر جست لگاتے، زمان و مکان کی حصار بندی توڑتے اور ان بلندیوں کی طرف پرواز کرتے دیکھا ہے جہاں عقل و فراست کا دائرہ ختم ہو جاتا ہے اور عشق چاک گریباں ہو کر اپنے وجُود میں انسان کو اس کا روشن مستقبل دکھا دیتا ہے۔ اسرار و رموز کھل جاتے ہیں۔ اور انسان اپنے آپ سے اور اپنی عظمت سے دوچار ہو جاتا ہے۔ وُہ ان مسرتوں کو پالیتا ہے جن کا تصور بے وجود نہیں۔ یہ ساری کائنات اس تعلا کی رازدار ہے جس میں انسان نے پرورش پائی ہے۔ وہ، مکانات ہی امکانات دیکھتا ہے جو مُرشدِ کامل کے بغیر ہاتھ نہیں آتے۔

آرٹسٹ نے تصویر کی فضا اور اُس کے سماں میں رنگوں کا جو ملاپ اور امتزاج کیا ہے۔ وُہ ان راستوں اور منزلوں کا تعین بھی ہے جن کی مشکلات کا تصور انسان ہمیشہ سے کرتا چلا آیا ہے۔ اس نامعلوم اسرار کا بھی اور اس رازداری کا بھی جو قدرت اور اس کے درمیان دیواروں سے کہیں بلند، پہاڑوں سے کہیں زیادہ اٹل ہو کر اپنا مقام چھپائے ہوئے ہے۔ تصویر میں فاصلوں، منزلوں اور حدوں کا رشتہ ایک مقام سے دوسرے مقام کی حد بندی اور مناظر کی وجد آفرینی بڑے مؤثر طریق پر ظاہر

کی گئی ہے۔ اس تصویر کے تخیل اور بندشوں کا تعلق قاری کے ان رجحانات سے ہے کہ اُفق سے دوسرا اُفق انسان کے وجود کا نامۂ ہے جو ذاتِ باری سے کبھی بے تعلق نہیں رہا اور یہ لامتناہی سلسلہ ایسے جواز کی تلاش میں ہے جس کی غرض و غایت خودی کو بیدار کرنا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہم ایک اُفق سے دوسرے اُفق پر کمندیں ڈال کر پھاندتے، بس پھاندتے چلے جائینگے۔

جہاں اقبالؔ اور مرشد رُومیؔ کھڑے ہیں۔ جہاں وہ امکانات کی ٹوہ میں جا پہنچے ہیں وہاں روشنیاں اور تجلیات بغل گیر ہیں۔ انسان دُور کھڑا اس نزدیکی کا تصوّر کر رہا ہے جو انسان اور خدا کے درمیان اسرار ہی اسرار ہے، اور عشق کا والہانہ نذ اس بات پر منحصر ہے کہ وُہ نجات کا سرچشمۂ حیات ہے۔

ہر گہرائی، ہر وسعت، سے کے تاثرات مضمون کی تفصیلت، تصوّرات کا جائزہ، فن کار کی عظمت کا اعتراف کیا ہے جو اس کے نوک پلک سے واضح نہیں، آرٹسٹ ہمیشہ سے اپنی کوششوں سے مطمئن رہا ہے۔ کوئی تذبذب اور شک نہیں کہ وُہ حقیقتوں سے دُور، ذہنی بے چینی سے بے چین ہے ؎

ستاروں سے آگے جہاں اَور بھی ہیں
ابھی عشق کے امتحاں اَور بھی ہیں

تہی زندگی سے نہیں یہ فضائیں
یہاں سینکڑوں کارواں اَور بھی ہیں

قناعت نہ کر عالمِ رنگ و بُو پر
چمن اور بھی آشیاں اَور بھی ہیں

زِ رُومی گیر اسرارِ فقیری
کہ آں فقر است محسود امیری

IQBAL AND RUMI

Chughtai, the leading artist of this country, is very close to Iqbal in his illustrations of his poetry in colour and lines. His original and distinctive approach sets him out in search of a new vision, in the present and the past, and it is this search which carried him across the gulf between the cosmopolitan modern civilization and the traditions of his own culture. While, depicting Rumi and Iqbal, the thinker and philosophers, Chughtai combined the values of the present and the past. This he does with perfection and full realisation of God as he absorbed and assimilated the creative value, in the highest form.

"THE OLD MAN OF RUM TURNED MY DUST INTO ELIXIR;
FROM MY DUST HE RAISED THE LIGHTS;
I AM A WAVE AND TAKE MY ABODE IN HIS SEA
SO THAT I MAY OBTAIN A LUSTROUS PEARL AT LAST.
I, WHO DERIVE INTOXICATION FROM HIS WINE,
LIVE A LIFE THROUGH HIS BREATH, SO FAST AND WARM!

IQBAL.

معمارِ حرم

معمارِ حرم باز بہ تعمیرِ جہاں خیز
از خوابِ گراں خوابِ گراں
خوابِ گراں خیز

اقبال

معمارِ حرم
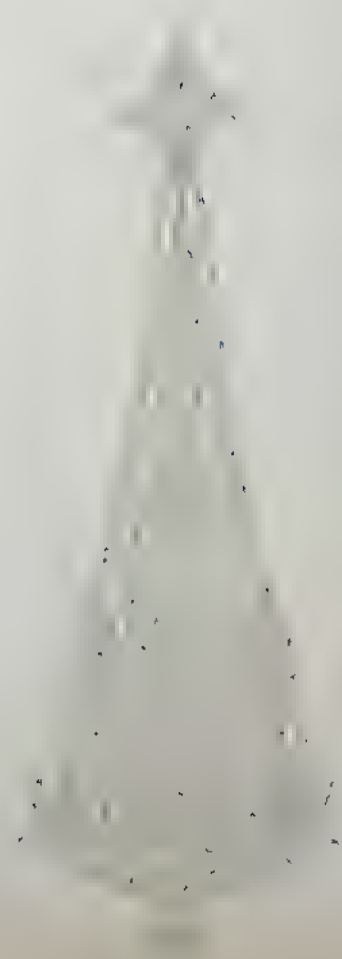
تین مختلف چہرے بہ یک وقت ہمارے سامنے اس طرح گھومتے ہیں جیسے ایک عظیم داستان کے تین مستقل باب ہوں۔ چغتائی نے یہ تکون بڑی ذہانت سے ترتیب دی ہے اور اس سے اپنے فنی انہاک کو اُبھارنے کی کوشش کی ہے۔ یہ مختلف چہرے اس کے فنی شعور پر تبصرہ ہیں۔ اس کے رُجحانات اور بصیرت، اس کے مطالعۂ تہذیب اور ذوقِ نظر کا حصہ ہیں۔ تصویر میں عالمِ طفلی کو مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ شباب کو اس کے سہارے کے لئے منتخب کیا گیا ہے۔ داستان کا تیسرا باب مجاہد کے جذبات کی اہمیت کا زیادہ سے زیادہ احساس دلاتا ہے۔ یہ ارتعاشِ نور بتدریج روشن ہوتا چلا جاتا ہے۔ معمارِ حرم کے چہرے پر سے تعمیر کے وہ تمام پُرشکوہ اور پُروقار اوصاف نمایاں ہیں جن کا تاثر داستان کے ساتھ ساتھ چلتا ہے۔ ہر باب مکمل بصیرت ہے۔ اور زندگی کے مسائل سے اس کا گہرا تعلق ہے۔ مجاہد کی شخصیت محض تلوار اور احکام نہیں اس کے اندر عمل کا تجربہ ہیں جس سے اس کی عظمت، خود اعتمادی اور تدبر نمایاں ہے۔ اور اس سے اس کے تدبر کا بھی انکشاف ہوتا ہے۔ یہ منفرد شخصیت، یہ سخت کوش سپاہی اپنے فرائض سے پوری طرح آشنا ہے۔ وہ اپنے مضبوط قدموں پر کھڑا ہے۔ وہ اعلیٰ مقاصد کے زیرِ اثر اُن شاہراہوں کو دیکھ رہا ہے جن پر اُس کے آبا و اجداد کا خون رواں دواں رہا ہے۔

چغتائی کا بیان ہے اُس نے یہ تصویر اپنے آبائی مکان میں تخلیق کی تھی، اور یہ مشرقی اقوام کی غلامی کا وہ مدوجزر تھا جو آہستہ آہستہ ختم ہو رہا تھا۔ آج بھی وہ اپنی اس تصویر کو دیکھ کر مسکرا دیتا ہے۔ یہ جو یہ بخششوں کا کرشمہ ہے۔ ایسی تصویریں جب بھی دیکھو کچھ آپ تازہ دم، اور کچھ تصویریں تازہ دم نظر آتی ہیں۔ ایسی تصویروں سے محض قوت اور عظمت ہی کا احساس نہیں ہوتا۔ بلکہ یہ جوہر انسان اور انسانیت کی نمائندگی کے ذمّہ دار ہیں۔

چغتائی انسان دوست اور انسانیت پرست بھی ہے۔ وہ عقیدت کے طور پر بھی ایسے کردار تخلیق کرنے کا ذریعہ بن جاتا ہے جنھوں نے دُنیا کو امن اور اطمینان کا سانس لینے کا موقعہ بہم پہنچایا۔ اس تصویر سے بھی واضح ہے کہ ایک مستعد شخصیت کردار کی نمائندگی کے لئے کمربستہ ہے جس سے تہذیب و تمدن کی عمارت استوار کھڑی ہے۔ چغتائی نے اقبالؒ کے اعلیٰ مقاصد کی حمایت کی ہے۔ اور وطنیت کی مذمت کی ہے۔ جو آہستہ آہستہ سیاسی ریشہ دوانیوں سے زندگی کے مقاصد کو بڑی بے دردی سے کچل رہا تھا۔

اقبال نے زندگی کی ضرورتوں اور رُوح کی بالیدگی کے امکانات کو پھلنے پھولنے کے ذرائع عطا کئے ہیں۔ اور ایسے مراحل بیان کئے ہیں کہ ہر قلب میں ایک تازگی اور بیداری پیدا ہوتی ہے۔ چغتائی کے فن کا یہ طرۂ امتیاز ہے کہ جذبات میں

تازگی اور دماغی توازن ہاتھ آئے، غور و فکر بڑھے، مطالعہ کے چشمے ابل پڑیں۔ مجاہد کی اولوالعزمی، یقین محکم اور عمل پیہم ماں اور بچے سے مکمل ہوتا ہے۔ اور تصویر میں یہ تاثر اس قدر نمایاں ہے کہ ہر صنعت ابھر کر سامنے آجاتی ہے۔ اور ہم سے ہمکلام ہوتی ہے۔ تصویر میں بچے کا کردار ردِ عمل کا درجہ رکھتا ہے۔ مجاہد کی تلوار، کتاب، اس کا تدبر، اس کا اعتماد اسے اس منزل مقصود تک پہنچائے گا جس تک پہنچنے کے لئے وہ کمربستہ ہے۔ چغتائی کے اظہار کی ندرت مطالعہ نگار کو کبھی مایوس ہونے نہیں دیتی۔ اسے اپنے موضوعات سے والہانہ عشق ہے جو اس کی زندگی کے جزو بن چکے ہیں۔

چغتائی کی مشرقیت ایک جہاد ہے اور یہ جہاد اسے تصویروں کی شکل میں اپنے کلچر کو سنوارنے کا موقع دیتا ہے اس کا یقین محکم ہے کہ ایک دن دنیا بھی مانے گی کہ اس کی آواز بلند سے بلند ہو کر اس کے نظریئے کی پوری حمایت کرے گی ؎

ہے یاد مجھے نکتۂ سلمانِ خوش آہنگ
دنیا نہیں مردانِ جفاکش کے لئے تنگ
چیتے کا جگر چاہیے شاہیں کا تجسس
جی سکتے ہیں بے روشنیٔ دانشِ افرنگ

برون از ورطۂ بود و عدم شو
فزون تر زین جہانِ کیف و کم شو
خودی تعمیر کن در پیکرِ خویش
چو ابراہیم معمارِ حرم شو

معمارِ حرم باز بہ تعمیرِ جہان خیز — از خوابِ گران خوابِ گران خوابِ گران خیز

WILL AND THE WAY

His work questions about and offers comments as to how the transient representation of man's power is growing in the different aspects of life. In old days, man was represented as a spiritual as well as a temporal being. This reminds us of the inexhaustible fountain of life of the self. The self while attaining freedom and immortality conquers space and time and thus approaches God, is the infinite self.

This painting is obviously a masterpiece in conception and composition. It is a fine example of the synthesis of romanticism and classicism and shows a remarkable correspondence between the aim and the theme. Chughtai indicate all this with a will to power.

"ITMAKES FROM ITSELF TO BE OTHER THAN ITSELF,
IT MAKES FROM ITSELF THE FORMS OF OTHER,
IN ORDER TO MULTIPLY THE PLEASURE OF STRIFE.
INASMUCH AS THE LIFE OF THE UNIVERSE COMES FROM
THE LIFE IS IN PROPORTION TO THIS POWER (POWER OF
THE SELF).

IQBAL

شرف النّساء

آن فروغ دیدۂ عبد الصمد
فقر او نقشے کہ ما بندد تا ابد

اقبال

شرف النساء

چغتائی کی یہ تصویر جب علامہ اقبال نے دیکھی تو فرمایا! ایسا محسوس ہوتا ہے کہ نظم کہتے وقت یہی پیکر میرے پیش نظر تھا۔ آرٹسٹ اپنے موضوع کی مناسبت و اہمیت کے زیرِ اثر اپنے ذہنی رجحانات اور تخیل کو رنگوں اور خطوں کی گہرائیوں میں سمو دیتا ہے اپنے فکر کو ترغیبات سے بچاتا ہے۔ اور اس وقت تک اپنی تخلیق سے مطمئن نہیں ہوتا جب تک اپنے اعلیٰ مقصد کی ترجمانی میں نئی تکنیک اور فنی انہاک سے اپنے معیار پر پورا نہیں اترتا۔ چغتائی کی کوئی تصویر خواہ وہ کسی محبوبہ کی ہو یا محبوب کی، مومن کی ہو یا مجاہد کی، مزدور کی ہو یا کسان کی، مشاہدے اور مطالعے کی مرہونِ منت ہے۔ وہ اپنی خصوصیات اور اپنے کردار کی مظہر ہوتی ہے۔ شاہین صفت پیکر، روشن ضمیر لوگ آرزوؤں کی کسک سے ہم کنار، سوز دروں سے مالا مال، زندگی کے تقاضوں سے گرمائے ہوئے دل، رنگوں اور خطوں کی بے ساختگی میں رواں دواں، اپنے حال اور مستقبل سے باخبر اپنے مقاصد کا پیچھا کرتے رہیں گے۔ عالم رعنائی بلند نگاہی، زندگی کا کون سا کیف اور سرمستی ہے جو آرٹسٹ نے اپنے محبوب کردار کے ذریعے بے نقاب کرنے کی کوشش نہیں کی۔ شرف النساء کے روپ میں چغتائی نے ایک ایسے بلند آہنگ کردار کی تخلیق کی ہے جو اپنے عزم اور بصیرت سے ہماری ذہنی نشو و نما کے لئے کلچر کا اعلیٰ ترین مظہر ہے۔ اسکے انسانی کردار میں جلال و جمال کی تکمیل ہوئی ہے۔

شاعر نے شرف النساء کے کردار کو ابدیت بخشنے اور اس کے کردار کو نظم کے سانچے میں ڈھالنے کے لئے کیا کچھ سوچا ہوگا اور آرٹسٹ کن وجوہ کی بنا پر متاثر ہوا ہوگا۔ کہ یہ کاغذی پیرہن تاریخ کا ایک حصہ بن سکا۔ آرٹسٹ کے بیان کے مطابق فرد کے کردار میں روشنی اس وقت نظر آتی ہے جب وہ انفرادیت کے جلال و جمال میں ڈھل کر سامنے آتا ہے لیکن ایسے ناقابلِ فراموش لمحے بہت کم آتے ہیں جب آرٹسٹ معاشرے کے لئے ذہنی غذا فراہم کرنے میں اپنی بصیرت اور شعور کو انسانی زندگی میں سمو دیتا ہے۔

خود اعتمادی اور مجاہدانہ صفات کی رو سے شرف النساء ایک ایسا بے مثل پیکر ہے کہ نہ اسکے استدلال کو چھپایا جا سکتا ہے نہ اس کی قوتِ باliدگی کو نظر انداز کیا جا سکتا ہے۔ اس نے زندگی کی نشو و نما کے لئے ایک ایسے نظریئے کی وضاحت کی وضاحت کی ہے جو دنیا بھر کے زندہ فنون اور اس کی تخلیق کا انفرادی پہلو ہے۔ ذہنی آزادی کا لازوال تخیل فن کے بناؤ میں نظر آتا ہے۔ جب تک علم و ادب اور فن کارانہ صلاحیتیں زندہ ہیں یہ تخلیقی کردار بھی اپنی سلامتی کا یقین دلاتے ہوئے زندۂ جاوید نظر آئے گا۔

علامہ اقبال نے بارہا انفرادیت کو برقرار رکھنے کی تلقین کی ہے۔ تہذیبی معاملات میں گہرا شعور پیدا کرنے کو انھوں

نے اپنی شاعری کا مقصد بنایا۔ وہ سوزِ حیات اور رموزِ زندگی کو تقلید کی روش سے بچانے میں تلوار کے استعمال کو بھی حق بجانب سمجھتے تھے تاکہ انسان قنوطیت کا شکار نہ ہوجائے اور اس پر افسردگی طاری نہ ہوجائے۔ آرٹسٹ نے شرف النساء کے کردار کو اس بلند مقام پر دیکھاہے جہاں انفرادیت اور کردار رفیع تر ہوکر ضربِ کلیمی پیدا کرتے ہیں۔ شرف النساء کی یہ تصویر ہمیشہ ہمارے اس کلچر کی نمائندگی کرتی رہیگی جس سے قومیں اُبھرتی ہیں، تہذیب کروٹ لیتی ہے اور کتاب اور تلوار کو جزوِ زندگی سمجھا جاتا ہے۔

تصویر کی نشست لباس، رنگوں کا انتخاب جیسے پس منظر، استخوان بندی، ترکیبی اجزاء اور شرف النساء کے خد و خال آرٹسٹ نے اپنی ذہانت و کمالِ فن سے کام لیکر یہ سب چیزیں اس خوش اسلوبی سے ترتیب دی ہیں کہ شاعر کا مفہوم اور مقصد ایک نئے ولولے اور نئے شعور سے رنگ کے نئے سانچوں میں ڈھل کر صورت پذیر ہوا ہے **چغتائی** میں حُسن کی دریافت کا ایک قوی جذبہ ہے۔ جس کی کیفیتوں میں ڈوب کر اس نے اپنے موضوع کی طرف توجہ دی ہے۔ روحانی اور مادی اقدار کی نشان دہی میں محض اشاروں سے کام نہیں لیا گیا بلکہ عمل کی ابدیت کا تجزیہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ تاکہ تصویر کا ہر وہ رُخ جس کی ترجمانی مقصود ہے زیادہ سے زیادہ واضح ہوجائے۔

شرف النساء اس سرزمین کی داستانِ حیات ہے جہاں اقبال و چغتائی نے جنم لیا اور انسانی ذمہ داریوں کو اپنے اپنے قلم سے پہچانا، اور کہیں اپنے نصب العین کو ٹھیس نہیں لگنے دی۔ اُنھوں نے انسانی شخصیت کو مؤثر ہونے کا موقع بہم پہنچایا ہے کہ آزمائش کے موقعوں پر اسکا قدم ڈگمگا نہ سکے ؎

یہ کلی بھی اس گلستانِ خزاں منظر میں تھی
ایسی چنگاری بھی یارب اپنی خاکستر میں تھی

آن فروغِ دیدۂ عبدالصمد
فقرِ او نقشے کہ ماند تا ابد

قلزمِ ما این چنین گوہر نزاد
ہیچ مادر این چنین دختر نزاد

بر لبِ او چون دمِ آخر رسید
سُوئے مادر دید و مشتاقانہ دید

جس سے دلِ دریا متلاطم نہیں ہوتا
اے قطرۂ نیساں وہ صدف کیا وہ گہر کیا

SHARFUN-NISA

Sharfun-Nisa the most striking pose of a super personality. Seems to be the highest scale of being in the evolution of human ego. The mood, and the majestic sitting of the figure can be regarded a characteristic study. The artist knows the tendencies of the subject and produces a significant expression of historical fact.

Sharfun-Nisa revolts against the National life and thus transforms human outlook.

Chughtai depicts the principles of political solidarity along with a calm depth of faith in a beautiful and glorious colour scheme. He also depicts immortality presenting Sharfun-Nisa's character.

"OUR SEA PRODUCED NO PEARL, NO MOTHER SUCKLED
A DAUGHTER WHO COULD BE HER EQUAL.
AND AS DEATH CAME, SHE CAST A WISTFUL GLANCE
AND TO HER MOTHER SAID, "IF THOU MAYEST KNOW
MY SECRET, THEN THIS QURAN AND THIS SWORD
BEHOLD. CONJOINED THESE TWO POWERS ARE :
PROTECTORS MUTUAL, THEY CONSTITUTE
THE PIVOT OF THE UNIVERSE OF LIFE."

IQBAL

فکرِ فردا

دمید آن لالہ از مشتِ غبارم
کہ خونش می تراود از کنارم

اقبال

فکرِ فردا
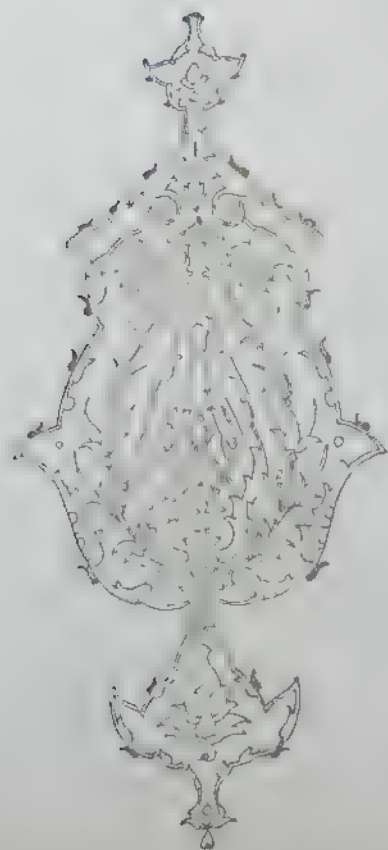
یہ کھیت، یہ پھل، یہ پھول، یہ بہار، یہ رنگینی، یہ وسعتیں اس زمین کا حصہ ہیں جہاں محنت و مشقت و مزدور کی حکومت ہے۔ جہاں ُن لوگوں کی جہاں بانی ہے جن کی نگہداشت زندگی کی مسلسل جدو جہد سے بروئے کار آتی ہے کہ انہیں زندہ رہنے کے لئے سامانِ زندگی میسر آتا رہے۔ وہ خدا کی نعمتوں سے محروم نہ رہیں یہی احساس فن کار کی توجہ کا مرکز رہا ہے۔ اور موضوع کے لحاظ سے ان امکانات میں ڈھل گیا ہے جو زندگی کے نشیب و فراز اور انسان کے امروز و فردا سے کبھی الگ نہیں ہیں۔ مسلسل حرکت اور ان تھک عمل نے ہمیشہ کسان اور زمیندار کا ساتھ دیا ہے۔ زمین کی بھی یہ فطرت ہے کہ وہ اپنے چاہنے والوں کیلئے ان گنت جوہر اگلتی رہے۔ یہ چیز اس کی اپنی نشو و نما کے لئے بھی ضروری ہے اور اس پر بسنے والوں کی پرورش کے لئے بھی

چغتائی کو زرد رنگ سے دلی لگاؤ ہے۔ مگر آرٹ کے مبصرین کا کہنا ہے کہ رنگ لال ہو یا پیلا، سرخ ہو یا نیلا چغتائی ہر رنگ پر قدرت رکھتا ہے، اور جب موقع آتا ہے تو ضرورت کے مطابق رنگوں سے جو کام چاہتا ہے لیتا ہے۔ جن دنوں وہ فن کار بننے اور فن کے میدان میں جوہر دکھانے کے لئے پر تول رہا تھا ہندوستان بھر میں قنوطیت کا دور دورہ تھا۔ بدھ کی تعلیم اثر انداز تھی۔ رہبانیت اپنے فلسفے سے دوچار تھی۔ انہی تصورات کے زیر اثر اس کی تصویریں تخلیق ہوتی تھیں۔ وہ اپنے موضوع کے لحاظ سے خطوں اور رنگوں کی سج دھج سے ہندوستانی آرٹسٹوں میں اجنبی اجنبی معلوم ہوتا تھا۔ چاہے اس نے اپنے چاؤ اور فراخدلی سے بدھ، ارجن اور کرشن کی تصویریں ہی کیوں نہ بنائی ہوں۔ اپنے طرزِ نگارش میں اس نے اپنی انفرادیت اور خود پسندی قائم رکھی اس میں اجنبیت اور انفرادیت کیساتھ ساتھ موضوع اور زندگی کے دوسرے گوشوں کی دیکھ بھال بھی موجود تھی۔

یہ تصویر "فکرِ فردا" چغتائی کو خود کہاں سے کہاں بہا کر لے گئی ہے۔ نہ ان مناظر میں اس کی مغل اور ایرانی روایات ہیں اور نہ بدھ کی جھلکی ہوئی تمنا۔ اس کی نگاہ ان ضرورتوں کے احساس میں وہ عالی ہمتی اور تڑپ لئے ہوئے ہے جس نے **اقبالؔ** کو گوشۂ گندم کے مشاہدے سے تڑپا دیا تھا۔ قیصر و کسریٰ کے محل تہ و بالا نظر آتے تھے۔ اور اسے زمین کے وارثوں کی نیابت مقصود تھی۔ آرٹسٹ کی کامیابی اسی میں ہے کہ دوست دشمن سب اس کا اعتراف کریں۔ **چغتائی** ماحول سے نہیں زمانے بھر کے افکار سے متاثر رہتا ہے۔ اور وقت کی ضرورتوں کو الٹ پلٹ کر دیکھنے میں جدید سے جدید تر نظر آتا ہے۔ یہ اسکے فن کا بہت اہم باب ہے۔ اسی سے اس کے دماغی توازن اور سچے فن کار ہونے کا ثبوت ملتا ہے۔ کہ وہ بھی جدید ہندوستانی مصوری کے دور میں اپنے ہمعصروں کے دوش بدوش رواں دواں اپنے مقصد کے حصول کے لئے برسرِکار رہا ہے۔

فکرِ فردا میں نہ ختم ہونے والی کیفیتیں اور وسعتیں ہیں۔ کھیت اور کسانوں کے اسرار و رموز محسوس ہوتے ہیں سبزہ

،ور سبزے کی پیداوار کے امکانات کیا ہیں۔ ہل اور مویشی کیا ہے جو یہ زمین نہیں اُگلتی اور زمان و مکان کی حُدود توڑتی ہوئی نظر نہیں آتی۔ درخت ان لامحدود فضاؤں اور وُسعتوں میں آسمان کی بلندیوں کو ناپ رہے ہیں۔ ایک مدبّر اور مُطمئن بُوڑھا اور اسکی اولاد ن دُور اُفتادہ رشتوں سے وابستہ ہیں جو نسان کی متاع کے ذمّہ دار ہیں۔ یہ تصویر ان عالمگیر تقاضوں کی ترجمان اور اس انسانیت کی حصّہ دار ہے جن کی حیثیت عالمگیر ہے۔ یہ سلسلہ کبھی ختم ہونے میں نہ آئیگا۔ زندگی کا یہ پرچم یُوں ہی لہراتا رہے گا۔ کائنات کو اس پرچم کے نیچے انسانی برتری کے لئے اُس کی ہم نوائی کا دم بھرنا پڑیگا۔ زمین جوہر اُگلتی رہے گی۔ نادار اور سرمایہ دار کی کشمکش اس کی اَن گِنت رحمتوں سے ہم کنار ہوتی رہے گی۔

یہ کُھلے کُھلے شانوں والا بُوڑھا، یہ کسان، یہ دھرتی کے بیٹے، یہ سخت کوش زمین کی تہوں کو اُلٹتے پلٹتے رہینگے ان کی چپ اور لب کُشائی ان کے امروز و فردا کی ضامن ان کو جینے کا حق دلاتی رہے گی۔ چغتائی نے جس محبّت اور خلوص سے اس تصویر کو مکمّل کیا ہے اس سے کہیں زیادہ اس کا وُہ عمل ولولہ خیز ہے، اس سے کہیں زیادہ اس کا وُہ مدّعا اُجاگر ہے جس سے تصویر کی انتہا اور ابتدا ہوتی ہے ؎

خورشیدِ جہاں تاب کی ضو تیرے شرر میں
آباد ہے اک تازہ جہاں تیرے ہُنر میں

جچتے نہیں بخشے ہوئے فردوس نظر میں
جنّت تری پنہاں ہے ترے خونِ جگر میں

اے پیکرِ گِل کوششِ پیہم کی جزا دیکھ

این خاک و آنچہ در شکم او از آن من
وز خاک تا بہ عرشِ معلّٰے از آن تو

دمید آن لالہ از مُشتِ غُبارم
کہ خونش می تراود از کنارم

THE GREEN FIELD

Chughtai is a man of fully devotional love with soil and the spirit of soil, where he lives, spends his life, developed his genius and expressed himself. It was painted even across the sky when the artist was devoted to realism and impressionism. The remarkable achievement of Chughtai, therefore is that he paints a new conception of life of the land, with the brilliant tropical colours. Chughtai puts forth the work of art which sweeps the passions of the people, with definite suggestion and imaginative conception of the fields that illustrate mostly the impression of growing man with restless spirit. This type of painting made him internationally famous.

"GOD STYLED THE EARTH OUR SOURCE OF LIVELIHOOD,
WHICH HAS BEEN GIFTED FREE, NOW LEARN THIS POINT
FROM ME, O LANDLORD TAKE THY BREAD AND TAKE
A SPACE ENOUGH FOR BURIAL FROM THY LAND,
BUT DO NOT CLAIM IT AS THY OWN.

IQBAL

صدیقؓ
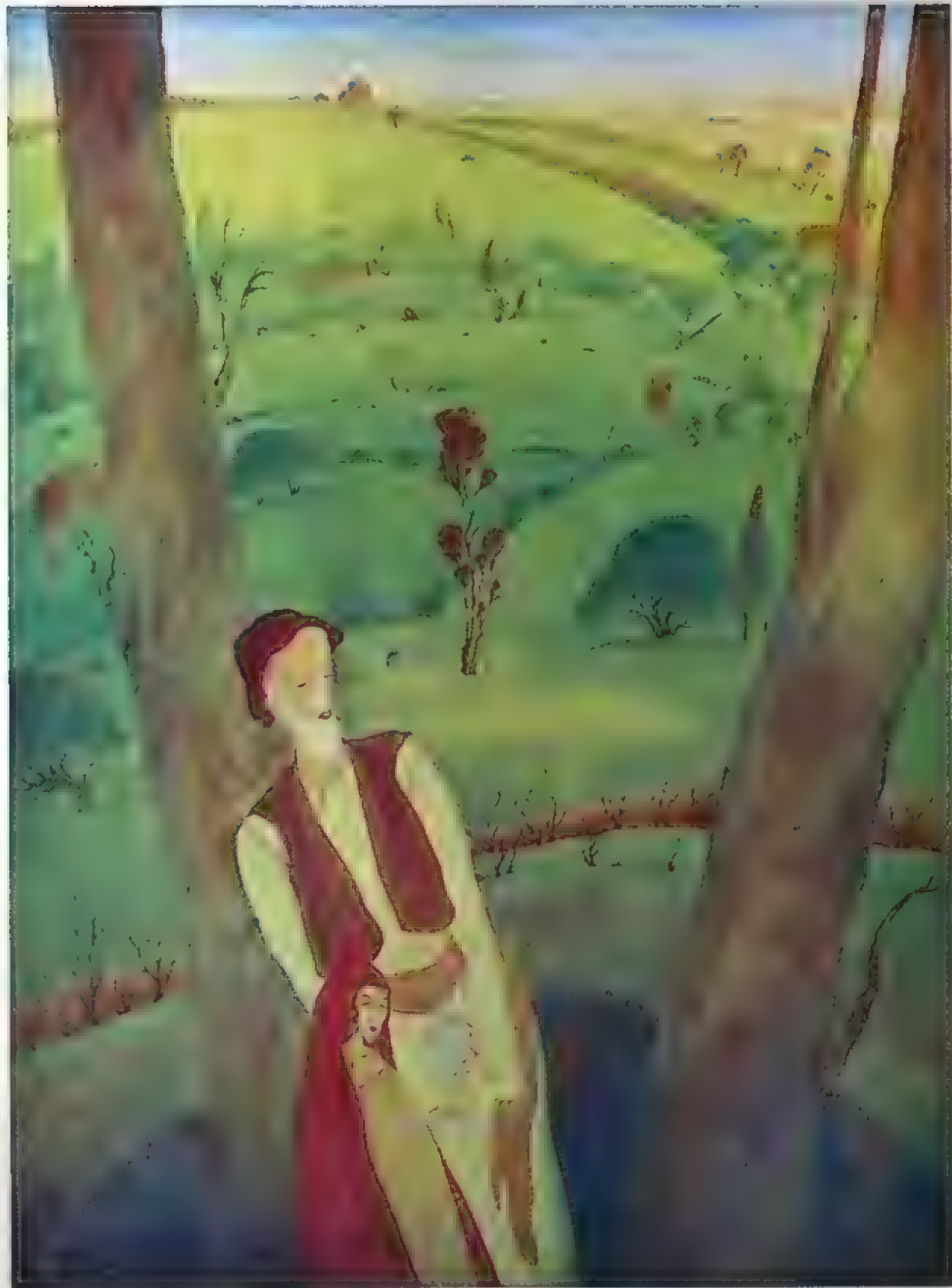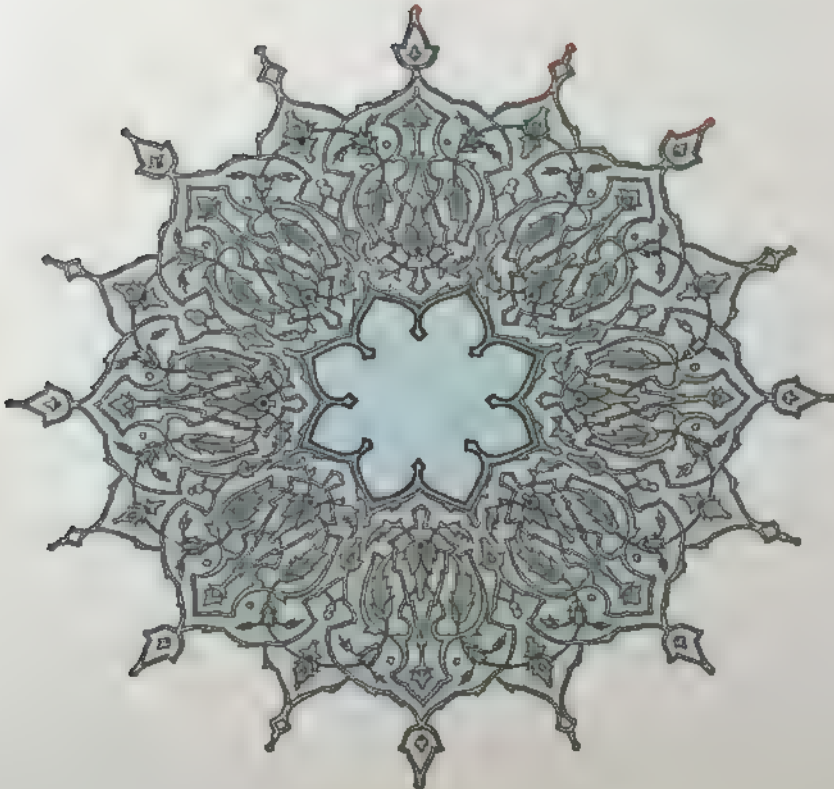
شرف النسا

گفتم این کاشانۂ از لعلِ ناب — آنکہ می گیرد خراج از آفتاب

این مقام این منزل این کاخِ بلند — حوریان بر درگہش احرام بند

اے تو دادی سالکان را جستجوے — صاحبِ او کیست؟ با من باز گوے

گفت "این کاشانۂ شرف النساست — مرغِ بامش با ملائک ہم نواست

قلزمِ ما این چنین گوہر نزاد — ہیچ مادر این چنین دختر نزاد

خاکِ لاہور از مزارش آسمان! — کس نداند رازِ اُو را در جہان!

آن سراپا ذوق و شوق و درد و داغ — حاکمِ پنجاب را چشم و چراغ!

آن فروغِ دودۂ عبد الصمد — فقرِ اُو نقشے کہ ماند تا ابد!

تا ز قرآن پاک می سوزد وجُود — از تلاوت یک نفس فارغ نبود

در کمر تیغ دو رُو قرآن بدست — تن بدن ہوش و حواس اللہ مست

خلوت و شمشیر و قرآن و نماز — اے خوش آن عمرے کہ رفت اندر نیاز

بر لبِ او چون دمِ آخر رسید — سوئے مادر دید و مشتاقانہ دید

گفت اگر از رازِ من داری خبر سوئے این شمشیر و این قرآن نگر

این دو قوت حافظِ یک دیگر اند کائناتِ زندگی را محور اند!

اندرین عالم که میرد هر نفس دخترت را این دو محرم بود و بس

وقتِ رخصت با تو دارم این سخن! تیغ و قرآن را جُدا از من مکن!

دل بآن حرفے که می گویم بنه! قبرِ من بے گنبد و قندیل به!

مومنان را تیغ با قرآن بس است
تربتِ ما را همین سامان بس است

عُمر ها در زیرِ این زرّین قباب بر مزارش بود شمشیر و کتاب

مرقدش اندر جهانِ بے ثبات اہلِ حق را داد پیغامِ حیات

تا مسلمان کرد با خود آنچه کرد گردشِ دوران بساطش در نورد

مردِ حق از غیرِ حق اندیشه کرد! شیرِ مولا روبهی را پیشه کرد

از دلش تاب و تبِ سیماب رفت خود بدانی آنچه بر پنجاب رفت

خالصه شمشیر و قرآن را بُبرد!
اندران کشور مسلمانی بمُرد"

صدیقؓ

اِک دن رسُولِ پاکؐ نے اصحابؓ سے کہا
دیں مال راہِ حق میں جو ہوں تم میں مالدار

ارشاد سُن کے فرطِ طرب سے عمرؓ اٹھے
اُس روز اُن کے پاس تھے درہم کئی ہزار

دل میں یہ کہہ رہے تھے کہ صدیقؓ سے ضرور
بڑھ کر رکھے گا آج قدم میرا راہوار

لائے غرض کہ مال رسُولِ امیںؐ کے پاس
ایثار کی ہے دست نگر ابتدائے کار

پوچھا حضور سرورِ عالمؐ نے اے عمرؓ!
اے وہ کہ جوشِ حق سے ترے دل کو ہے قرار

رکھا ہے کچھ عیال کی خاطر بھی تو نے کیا
مُسلم ہے اپنے خویش و اقارب کا حق گزار

کی عرض نصف مال ہے فرزند و زن کا حق
باقی جو ہے وہ ملتِ بیضا پہ ہے نثار

اِتنے میں وہ رفیقِ نبوت بھی آگیا
جس سے بنائے عشق و محبت ہے استوار

لے آیا اپنے ساتھ وہ مردِ وفا سرشت
ہر چیز، جس سے چشمِ جہاں میں ہو اعتبار

ملکِ یمین و درہم و دینار و رخت و جنس!
اسپِ قمر سم و شتر و قاطر و حمار

بولے حضورؐ چاہیے فکرِ عیال بھی
کہنے لگا وہ عشق و محبت کا رازدار

"اے تجھ سے دیدۂ مہ و انجم فروغ گیر
اے تیری ذات باعثِ تکوینِ روزگار

پروانے کو چراغ ہے بلبل کو پھول بس
صدیقؓ کے لئے ہے خدا کا رسُولؐ بس"

عزم

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

اقبال

عزم

جنگ ہو یا امن یہ اضطراب ہر بار نئے نئے اختراعوں اور نئی نئی اُمنگوں میں بدل جاتا ہے۔ ور آج کا انسان اپنے نئے عزم اور نئے ارادوں کی ترغیب سے ایک نئی دُنیا کی تعمیر میں لگ جاتا ہے۔ جنگ آج کی ہو یا کل کی اس کا واحد مقصد یہ ہے کہ انسانی جدوجہد کا سلسلہ کبھی ختم ہونے میں نہ آئے، اور انسان اپنے شعور کی فطرت اور ذہنی اختراعوں کے چکّر میں اُلجھا رہے۔ چغتائی نے اپنی اس تصویر میں ایک ایسے دور کی ترجمانی کی ہے جس کا تعلق محض اقتدار سے نہ تھا۔ اس کا پس منظر وُہ احکام بھی تھے جن سے یہ دُنیا پھلتی پھُولتی چلی آتی ہے۔ اقبال چاہتے تھے، وہ آرزومند تھے کہ میری دُنیا کے لوگوں میں وُہ عزم وُہ ولولے، وُہ ارادے کروٹیں لیں، وہ آرزوئیں پیدا ہوں جن سے زندگی بر سرِ عمل اور مسلسل جدوجہد نظر آتی ہے، عقل بیدار رہے اور عشق مردانِ حُر کی آنکھ سے منزلیں طے کرتا رہے۔

یہ تصویر اس عزم کا تصور ہے جسے اقبال مردِ حُر کے عمل میں دیکھنے کا متمنّی تھا۔ سلطان، بادشاہ، خلفاء اور سالارِ دین جب عزم باندھتے ہیں اور کمربستہ ہو کر آگ میں کُود جانے سے بھی دریغ نہیں کرتے، تو خودی جاگ اُٹھتی ہے اور انسان کے رجحانات کا پھیلاؤ عالمگیر ہو جاتا ہے۔ لامتناہی کیفیتیں ربط و ضبط کے ساتھ وقت کی تابع ہو جاتی ہیں۔ جس نقطۂ نگاہ سے علّامہ نے اپنی میراث اور ماضی کا ذکر کیا ہے۔ اور اس تڑپ کو دوبارہ گرفت میں لانے کی آرزو کی ہے، چغتائی نے اپنے فن کے ذریعے اس کو ایک جامع شکل دینے کی کوشش کی ہے۔ اس کو بھی اس کے ماضی نے جھنجوڑا ہے اور وارداتِ قلب کا وہ پُرشکوہ تصور پیش کیا ہے جس سے وُہ ذہنی پیچ و تاب میں مبتلا ہو کر تمد اُٹھا تھا۔ سلطانوں اور مجاہدوں کا عزم اسے یُوں نظر آتا ہے۔ جیسے وُہ مستعد، سراپا یقین محکم سے کتابِ الٰہی کے احکام پر عمل پیرا ہیں۔ تصویر کے دیکھنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ آرٹسٹ کی آنکھوں کے سامنے ایک سیلِ رواں ہے۔ ان فتوحات کا تسلسل ختم ہونے میں نہیں آتا۔ جو مجاہدوں کے عزم اور تسخیری عناصر کو حاصل تھے۔

عزم کی یہ تصویر تقویٰ اور بلند ہمتی سے استوار ہے۔ یہ ایک آزاد قوم کے زندہ فرد کی ذہنی کیفیتوں کی وضاحت ہے۔ اگر چغتائی کی اِس تصویر کو دیکھ کر کہا جائے کہ یہ عزم اور کردار آج بھی حاصل ہو سکے تو مشرق بدعتوں اور بدعنوانیوں کو ختم کر سکتا ہے۔ جن کے کھو جانے سے مشرق مشرق نہیں رہا۔ مشرق کو مشرق کے آغوش میں وُہ رُوحانی سکُون مل سکتا ہے جس کی علامہ اقبالؔ نے بار بار آرزو کی ہے۔ تصویر کا مواد اور جامع ہیئت اور تکنیک جو آرٹسٹ نے استعمال کی ہے اس کے وسیع مطالعہ کا عکس ہے۔ سُلطان ہو یا مجاہد اس کے وسیع مطالعہ کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ ذہنی بیداری، حُسن و عشق کا سوز، عزم کی تکمیل کی سادگی میں کون سی گہرائی ہے، جسے آرٹسٹ کے سوچ و بچار، اور کمالِ فن نے اس کردار میں سمو نہیں دیا۔ زرد رنگ اس کا چہیتا اور من بھاتا

رنگ ہے۔ جب وُہ اپنے اس مقبوں رنگ میں دُوسرے رنگ، سُرخ اور نیلا ملا دیتا ہے، تو رنگوں کی دُنیا اُور ہی رُوپ اختیار کرلیتی ہے۔ پھر رنگوں کے تغیر سے مضمون آفرینی میں نیا اسلوب نیا انہاک اور نئی کیفیت اُبھر آتی ہے اور یُوں محسوس ہوتا ہے کہ اسے اپنی فنی صلاحیتوں پر کس قدر قُدرت حاصل ہے۔ چغتائی کی یہ طبع آزمائی اُس کی فن کارانہ شان ہے، اور ان رموز کی نشینیگی اسے ان عظیم اُستادوں کے دوش بدوش کھڑا کر دیتی ہے جنھوں نے ہمارے لئے لافانی شاہکار تخلیق کئے ہیں۔

چغتائی کو ہمیشہ ایسے لازوال کرداروں کی تلاش رہی ہے۔ جن سے دُنیا کبھی مایوس نہیں ہُوئی اور خدا نے کبھی ان کے ارادوں اور عزائم کو نہیں جھٹلایا ؎

خودی را حق بدان باطل دِگر ہیچ
جہان فانی خودی باقی دِگر ہیچ

اَے سوارِ اشہب دوران بیا
اَے فروغِ دیدۂ بینا بیا
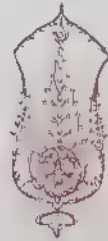
بھروسا کر نہیں سکتے غلاموں کی بصیرت پر
کہ دُنیا میں فقط مردانِ حُر کی آنکھ ہے بینا

وہی ہے صاحبِ امروز جس نے اپنی ہمّت سے
زمانے کے سمندر سے نکالا گوہرِ فردا

مسلمانے کہ خود را امتحان کرد | غبارِ راہ خود را آسمان کرد
شرارِ شوق اگر داری نگہدار | کہ با وَے آفتابے میتوان کرد

عزائم کو سینوں میں بیدار کر دے
نگاہِ مُسلماں کو تلوار کر دے

DETERMINATION

The artist loves the glory of the past with all passionate feelings to carry on its freshness, breath and air with atmosphere in which his colour, vibration and trembling of lines rhythmically dance with the extra ordinary sensitivenes of his vision. With the general revival of his community, he absorbed the ideas, pushing away towards the solid ground, symbolised with history. He imagined and approached the problem of National life as an artist and thus obtained a clear understanding of the true principle of National importance. He discovered how to build up a subject and to bring out portrait rich in character. He is thus a brilliant and an eminent artist of the Modern Indian school of painting and is known as a remarkable artist of the East.

"WHAT WAS, HAS FADED: WHAT IS, IS FADING: BUT OF THESE
WORDS FEW CAN TELL THE TRUTH;
TIME STILL IS GAPING WITH EXPECTATION OF WHAT IS NEAREST ITS HOUR OF BIRTH.
NEW TIDINGS SLOWLY COME DROP BY DROP FROM MY PITCHER GURGLING OF TIME'S NEW SIGHTS,
AS I COUNT OVER THE BEADS STRUNG OUT ON MY THREADED ROSARY OF DAYS AND NIGHTS.

IQBAL

منصور حلّاج

ما بمقامے دائمی سازیم و بس
ما سراپا ذوق پروازیم و بس

اقبالؔ

منصور حلاج

وُہ کون سا شاعر اور مفکّر ہوگا جس کی بصیرت نے **منصور** کے نعرۂ "اَنا الحق" کو اظہار کا ذریعہ نہ بنایا ہو
کہتے ہیں اس کے نعروں کی پُکار نے اُسے پتھروں سے ہلاک کروا دیا علماء نے اس کی ہلاکت کا فتویٰ صادر کیا تھا۔ کہ جو
گُذرے اس پر پتھر پھینکے یہاں تک کہ وُہ ہلاک ہو جائے۔ اقبال جیسے مفکرِ اعظم نے بھی اپنے کرداروں کی پختگی کی وضاحت منصور
کے نعروں سے کی ہے۔ چغتائی نے بھی اس موضوع پر تصویریں بنائی ہیں۔ اس کا مدعا بھی اس جذبے کا اظہار ہے جو مفکّروں اور
شاعروں کے مدِّنظر رہا ہے۔ اور غالباً یہ پہلا موقع ہے کہ یہ کردار رنگوں میں ڈھل کر سامنے آیا ہے۔

بیان کیا جاتا ہے کہ منصور حلاج کے حبیب صادق حضرت شبلیؒ نے شریعت کی مطابقت کرتے ہوئے منصور پر ایک
پھول پھینکا تھا منصور نے پھول دیکھ کر نعرہ لگایا اور وُہ درد و کرب سے چیخ اُٹھا۔ آسمان سر پر اُٹھا لیا۔ جیسے شبلیؒ نے اُسے عظیم صدمہ
پہنچایا ہے۔ وہ بدمستی میں بھی ہوشیار و باخبر تھا۔ اسے پھول اور پتھر میں امتیاز تھا۔ اس نے عشق کے حدُود سے گزر کر خدا اور
خدا کی خُدائی دیکھ کر خُدا کو پُکارا تھا۔

مُجاہد، مردِ مومن، مردِ شاہین۔ خرقہ پوش ایسی قلندرانہ تصویریں بنانے سے چغتائی نے کبھی پہلوتہی نہیں کی۔ اگر
ان تصویروں کو تنقیدی نظر سے دیکھا جائے تو اس کی یہ کوشش معاشرے کی رُوحِ رواں ہے۔ ان تصویروں کے مختلف تجربوں پر
اُن کی ساخت پر اور فن کار کے فنی انہماک پر غور کیا جائے تو اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ یہ سب کچھ معاشرے اور وقت
کا تقاضا اور استحکام ہے۔

چغتائی کے بیان کے مطابق اُس نے ایک ایسی تصویر ہیر اور رانجھے کی بھی بنائی تھی جس میں ان کی محبت کے آغاز
کا اظہار تھا۔ رانجھے کو ہیر کی نشست پر سویا ہُوا دیکھ کر ہیر کی سہیلیاں چہ میگوئیاں کرتی ہیں۔ ہیر برانگیختہ ہوتی ہے کہ کوئی ذرا اس
گُستاخ کو دیکھے سہیلیاں ہیر کو اپنے بازوؤں پر اُٹھا لیتی ہیں کیونکہ وُہ ہیر کی خاص الخاص کشتی پر سو رہا تھا۔ ہیر سربلند تھی دونوں
کی آنکھیں ملیں۔ دونوں اس رازداری کو راز بنا کر پی گئے۔ صدیوں سے ان کی محبت کے چرچے چلے آتے ہیں۔ مگر وُہ نازک لمحہ
کسی نے نہ دیکھا جس سے ان کی محبت کا آغاز ہوتا ہے۔ منصور حلاج کے جنون کا آغاز بھی ان حقیقتوں کا تقاضا تھا جن سے
منصُور مجذوب دوچار ہُوا۔ خُدا کا عشق اس کے اندر جذب نہ ہو سکا اور وُہ انا الحق پُکار اُٹھا۔

چغتائی کی یہ تصویر واقعات کی روشنی میں بہت کچھ بیان کرتی ہے۔ اس نے منصور حلاج کے کردار کو واضح شکل
دینے کے لیئے جو ماحول پیدا کیا ہے وہ اس کی فنی صلاحیتوں اور مطالعہ کا حِصّہ ہے۔ وہ ان رمُوز کو گرفت میں لے کر کردار کی

تشکیل شروع کرتا ہے جس کے زیرِ اثر شاعر کو شعر و مصوّر کو تصویر بنانے کا مواد حاصل ہوتا ہے۔ کس طرح فرد نے خلق اور خلق نے فرد کو جانچا تولا۔ کس طرح مجذوب قلندر نے نعرہ لگایا اور مذہبی فتویٰ تسلیم کر لیا۔ کس طرح اُس نے درد و کرب کی شدت سے بے نیاز ہو کر جزا اور سزا کا لطف اُٹھایا۔ اور کس طرح اُسے وہ پھول نظر آیا جس نے اُسے پتھروں سے بڑھ کر اذیت پہنچائی۔ صبر اور جبر اس داستانِ عشق کے تماشائی ہیں اور عشق آرزو و بے باک ہے۔

منصور کے درد و کرب کی داستان، نعروں کی صدائے بازگشت، روح کی بے طمینانی، عشق کی نے، زمانے کی رو پہ یوں ہی دانت پیستی رہے گی۔ اور الحاد سے اثر لینے والی انسانیت کو اس سے کوئی خطرہ لاحق نہ ہوگا۔ اقبالؔ ہو یا رومیؔ، جامیؔ ہو یا حافظؔ ہر ایک نے مجذوب کے نعروں سے عقل و عشق کی اصلی ہیئت کو سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ سچ پوچھو تو انسان نے اپنی پرواز کا رُخ ان بلندیوں کی طرف کیا ہے، جہاں پہنچتے فرشتوں کے بھی پر جلتے ہیں ؎

جہاں اگرچہ دِگرگُوں ہے قُم باذن اللہ
وُہی زمیں وُہی گردوں ہے قُم باذن اللہ

کیا نوائے انا الحق کو آتشیں جس نے
تری رگوں میں وُہی خُوں ہے قُم باذن اللہ

نظر حیات پہ رکھتا ہے مردِ دانش مند
حیات کیا ہے حضورِ سُرور و نورِ وجود

حیات و موت نہیں التفات کے لائق
فقط خودی ہے خودی کی نگاہ کے لائق

MANSOOR HALLAJ

Chughtai always felt his choice and study as something traditional with a desire for achievement. He admirably succeeded as an artist, builder of the social study in the spirit of a national art. In order to understand the work of the artist it is imperative that one should understand his definition of art. The art is good, if it conforms to the definition of the artist. In other words if it shows the expression of will-power and struggle on the part of living beings it is decidedly good. Chughtai painted this painting by a dimension outlook. The treatment is quite similar to the subject.

"THE COSMOS EVER FEALTY MAKES TO HIM,
WHO CALLED HIMSELF 'HIS WORSHIPPER' THIS RANK
IS PAST THY KEN, AS HE IS ALL AT ONCE
A HUMAN BEING AND YET AN ESSENCE PURE.
HE IS A MAN, YET PRISTINE MORE THAN MAN."

IQBAL

انجمن آرا

اگر ہو ذوق تو خلوت میں پڑھ زبورِ عجم

فغانِ نیم شبی بے نوائے راز نہیں

اقبال

انجمن آرا

چغتائی کی ابتدائی مصوری اور نوشتی کے مراحل ایسے سربستہ نہیں کہ اس کی کوششوں کا سراغ نہ مل سکے ، اور مطالعہ نگار اپنی تنقید کا رُخ ان امکانات کی طرف موڑ لے جہاں سوائے ناکامی اور خلش کے کچھ ہاتھ نہ آئے ۔ اس کی ابتدا کچھ ایسے حالات اور جذبات میں کروٹ لیتی نظر آتی ہے کہ وہ نہ تو اجنتا کے غاروں سے روشناس تھا اور نہ مغل مصوری اور ایرانی مصوری کی لوچ لچک سے آشنا تھا۔ کچھ تھا تو یہ تھا کہ اس کی خاندانی روایات تھیں کہ یہ دولہ اس کے اندر سے پیدا ہوتا اور وہ اس ٹوہ میں لگ جاتا کہ وہ اَن دیکھی دُنیا کیا صورت اختیار کر سکے گی جس کی کہانی وہ اپنے والدِ بزرگوار کی زبانی سنتا چلا آیا ہے ۔ وہ دیر تک انہیں جذبات اور پیدا ہونے والے ولولوں سے کھیلتا رہا۔ صرف یہ کہ ابھی تک رواں دواں اس منزل کی ٹوہ میں ہے جہاں سکی تمنائیں ، ور آرزوئیں س کی منتظر ہیں ۔ یہی اس کے فن کی ابتدا ر اور ارتقا ہے کہ وہ اپنی سُوجھ بُوجھ کے مطابق ہاتھ پاؤں مارتا اس افق کی طرف جا رہا ہے جہاں کامیاب فنکاروں کو سنگِ میل دکھائی دیتے ہیں ۔

چغتائی کے فن میں ابتدا ہی سے ایک ایسا کیف رچا اور بسا ہوا تھا جس سے اس کی فن کارانہ عظمت اپنے ارتقا کی طرف رُخ پھیرتی چلی گئی ۔ وہ اپنے والہانہ انداز میں اپنے مقصد کی ٹوہ میں لگا رہا اور مخالف قوتیں اس کا پیچھا کرتی رہیں ۔ اس کے باوجود صلاحیتیں تشبیہیں ، استعارے اور علامتیں زیادہ واضح اور روشن ہوتی گئیں کئی درخشاں مراحل اور افادیت کے مسائل سامنے آتے گئے ، ور وہ اپنے ہم عصروں سے کہیں زیادہ وقت کے تقاضوں کی ترجمانی کرنے لگا ۔ اور ایک دُنیا چغتائی کی عظمت کی طرف جھکتی گئی اور اس کے مستقبل پر نظر رکھ کر بڑے دانش مندانہ طور پر اس کا ساتھ دینے لگی ۔ قُدرت نے ایسے اسباب اور سامان مہیا کر دئے کہ وہ بہت جلد مغل ایران اور اجنتا کے آرٹ کی شناخت کرنے لگا ۔ جن داستانوں کو جاننے کا اس نے قصد کیا وہ حقیقتیں کشاں کشاں اس کی طرف کھنچی چلی آئیں جن کو حاصل کرنے کے لئے اُس نے کسی قربانی سے مُنہ نہ موڑا ۔

یہ تصویر انجمن آرا ایسے افکار اور رُجحانات کی ترجمان ہے ۔ جن سے اس کے فن کا زیر و بم اور رنگین نوئی ظاہر ہے طرزِ نگارش اور خد و خال یہاں تک کہ استخواں بندی کے جوہروں تک یہ تصویر شہزادی زیب النساء سے منسوب ہے ۔ آرٹسٹ کی بالغ نظری نے مغل تاثرات اور مغل معاشرت ، آرائش و زیبائش کا وُہ زندہ مرقع پیش کیا ہے کہ اس کے ہر زاویے سے علامہ اقبال اور چغتائی کی مشرقیت ظاہر ہے ۔ دل و دماغ کی کیفیات انجمن آرا کی قدریں اپنے مرکز کی طرف رواں دواں ہیں ۔ اور مجموعی اور صفاتی حیثیت سے چغتائی کی تخلیق کی ہیئت مغل اور ایرانی فن کے اس عروج سے جا ٹکراتی ہے ۔ جہاں دُنیا کے عظیم اُستادوں نے فن کی

تابانی اور معنویت کو ایک معیار بنا کر دم لیا ہے۔

تصویر کا میلان کتنا ہی رومانی ور شاعرانہ ہو، فن کی ندرت، بصیرت اور موزونیت نے اس کا مسلک ن ترکیبوں اور قوسوں سے نمایاں کیا ہے جن سے رنگوں میں بہار، علم وحکمت، تقدس اور عقیدت اپنے عروج پر زندگی کے ولولوں سے ہمکنار ہے۔ اور یہ پیکر مشرق قلب کی واردات سے زندہ و تابندہ ہے۔ مطالعہ بتاتا ہے کہ صدیوں کا یہ رشتہ فن کے اسلوب اور محاسن نے کہاں تک اپنایا ہے۔ چغتائی نے اپنے تہذیبی سرمائے کو بڑی عمیق نگاہوں سے جانچا اور تولا ہے۔ وہ کلاسیکی رجحانات جو اس کی تاریخ کو دُہراتے ہیں اس کے مدرسۂ فکر کا سرمایہ ہیں۔

انجمن آرا کو دیکھتے ہی ایک تجسّس حسین قالب میں ڈھل کر سامنے آتا ہے ور تصویر کو دیکھتے ہی رنگوں کی کیفیت دل و دماغ پر مسلط ہو جاتی ہے۔ ایک سُرخ اور دوسرا سبز، اور ان دونوں رنگوں کے امتزاج سے آرٹسٹ نے ستعارے کا کام بھی لیا ہو، ور فن کی رُو سے کسی کیفیت کا ادراک کیا ہو۔ مگر س نے جو سماں ور فضا پیدا کر دی وہ مغل کلچر کی نمائندگی کرتی ہے یہاں خطاطی کے بعض فنی رشتوں کو اُجاگر کیا گیا ہے تاکہ مغلوں کے نصب العین کا یہ مرقع مسرتوں، لطافتوں اور ان خوشبوؤں کا مجموعہ ثابت ہو۔ جس سے مُغلوں کی عظمت اور شہزادیوں کی فضیلت تابناک ہے ؎

میانِ آب و گِل خلوت گزیدم
ز افلاطوُن و فارابی بریدم

نکردم از کسے دریوزۂ چشم
جہاں را جُز بہ چشمِ خود نہ دیدم

نہ پیشِ من جہانِ رنگ و بُو رفت
زمین و آسمان و چار سُو رفت

تو رفتی اَے دِل از ہنگامۂ او   دیا از خلوت آبادِ تو او رفت

THE VIRTUOUS

Chughtai always desired to convey the message of God to man through his paintings. He is very much influenced by the beauty and fragrance of life that helps the artist in his creative work. As a great designer and a perfect craftsman, he composes his paintings rhythmically.

Unexpected effects of colour harmony balance light to dark-tones.

"THE SIGHT WHICH IS SOUGHT BY MY EYES IS WANTED.
THE LIGHT THAT OPENS THE INNER EYE IS WANTED.
THE OUTWARD BEAUTY PLEASES MY EYES.
MY IGNORANCE IS NO LESS THAN THINE.

IQBAL

غنی کشمیری

غنی آن سخن گوئے بلبل صفیر
نوا سنجِ کشمیرِ مینو نظیر

اقبال

غنی کشمیری

چغتائی کی توجہ تاریخ کے ایک ایسے اہم کردار کی طرف گئی ہے، جس کی انفرادیت اور بلند نگاہی کا اعتراف اقبال جیسے فلسفی اور شاعر نے بڑے بلند آہنگ الفاظ میں کیا ہے، جس کی شخصیت ہمارے علم و ادب میں بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ اس تصویر کے ترتیبی اجزاء اور جزو بندی سے چغتائی کی سوجھ بوجھ اور ارتقاء کی بلندیوں کا پتہ چلتا ہے۔ کردار کی اہمیت کو سمجھتے ہوئے اس نے فنی انہماک سے وارداتِ قلب کو کیا شکل دی ہے۔ مغلوں کے دور میں شبیہ نگاری کو بڑا عروج حاصل رہا ہے۔ مگر چغتائی کی یہ تخلیق جو اس کے تخیل کا کرشمہ ہے۔ جو دورِ احیاء کے بڑے بڑے شاہکاروں پر سبقت لے گئی ہے۔ تصویر کی ہمہ گیری اور اس کے تاثرات اپنے پورے عروج پر ہیں۔ چغتائی کی مصوری کا یہ دور اس کی شبیہ نگاری کا ایک اہم دور ہے جس کے اجتماعی حُسن اور جمالیاتی لطافتوں کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ نغمے اور گیت غنیؔ شاعر کے رگ و ریشہ سے پھوٹے نکل رہے ہیں تصورات کی ذہنی نشوونما تاریخ کے اوراق کو اُلٹ پلٹ رہی ہے۔ آرٹسٹ کا فنی شعور پہلے سے کہیں زیادہ شگفتہ اور شاداب نظر آ رہا ہے۔ پس منظر کیا ہے۔ ایک آئینہ خانہ ہے۔ شاعرانہ ندرت کا مظہر ہے۔ زندگی کے موثر نغموں سے معمور، ایک مستقل تڑپ۔ چغتائی کی یہ تخلیق سرمایۂ حیات ہے۔

آرٹسٹ رنگوں کے انتخاب اور ان کے استعمال کو اس پیار سے کام میں لایا ہے اور اس خلوص سے انہیں ترتیب دیا ہے کہ ان میں خونِ جگر کی رنگینی بھی ہے اور سوزِ دروں کی حدت بھی۔ یہ انفرادیت اپنی انفرادیت سے شطرنج کے تصورات کا وہ مرقع نظر آ رہی ہے کہ ہر شکل ہارجیت سے بے نیاز اپنے مکتبِ خیال کی ہم نوا ہے۔ رمزیت کی آویزش زندگی کے کیف سے پُر ہے۔ آرٹسٹ کے فن کا مشن اظہار اور بیان میں کبھی ڈانواں ڈول نظر نہیں آیا۔ اس کے متاع نے حصولِ فن میں کبھی کوئی اُلجھن پیدا نہیں کی۔

چغتائی کو اپنی شبیہ نگاری پر بھروسا بھی ہے۔ اس نے شبیہ نگاری کے اسلوب اور تکنیک کو رنگ آمیزی سے سہلا دیا ہے۔ اُس نے رنگ ریزوں اور سنگ ریزوں کو یوں لازوال بنا دیا ہے کہ اس سے مشرق و مغرب دونوں متاثر ہوتے رہیں گے۔

علامہ اقبال نے ہر بار اپنے اعجاز سے ایک نئے کردار کی نئی دُنیا آباد کی ہے۔ علامہ نے کوشش کی ہے کہ ان کردار کو بلند سے بلند مقام حاصل ہو۔ چغتائی نے بھی ہر بار بڑے اضطراب اور ولولوں سے اپنی تصویروں میں آزادیٔ فکر اور روشن ضمیری کا ثبوت دیا ہے۔ اس نے کوشش کی ہے کہ غنی کشمیری کے مستقل جذبے کو داستانِ پارینہ کا ایک ایسا ورق بنا دے جس سے اس کی شاعرانہ ندرت اور بلند نگاہی مجسم تمنا نظر آئے۔

چغتائی نے صدیوں کے تنزل کا جائزہ لیا ہے اور کوشش کی ہے کہ آج کی بیداری فن کے لئے بھی نجات کا ذریعہ بن سکے۔ اسے بھی مذہب سے ذراہٹ کر ایک مقدس فریضہ سمجھا جائے تاکہ مسلسل انحطاط کا احساس جاتا رہے۔ اس نے اپنی مضبوط گرفت سے کورانہ تقلید کے خاتمے کا تہیہ کیا اور وہ مشکلات پر غالب آگیا۔ مجرد اور تجریدی آرٹسٹوں نے مغرب کے موجودہ رُجحانات سے ضرورت سے کہیں زیادہ فیض حاصل کیا ہے۔ اگر وہ فضا کو مؤثر اور خوشگوار بنانے کی کوشش کرتے اور معاشرے کی ضرورتوں کے مدنظر دورِ احیاء کے عظیم اُستادوں اور پوسٹ امپرشنزم کے اتحاد سے نئی نئی راہیں پیدا کرتے تو ان کے مطالعۂ فن سے عملی طور پر نظریاتی حقیقتوں کی گرہ کشائی ہوتی۔ مشرق کو مشرقی نقطۂ نگاہ سے جانچنے سنوارنے اور اُبھارنے میں مدد ملتی۔ اور اس شعور کے دروازے بند نہ ہوتے جس پر اُسے اعتماد جاتا رہا ہے اور مغرب زدہ انسان بھٹک گیا ہے۔ کچھ بھی ہوتا اعتماد اُبھرتا۔ ہمارا فن ہمارے سہارے کھڑا ہو جاتا۔ مغرب زدہ دُنیا کو تسکین ملتی۔ کچھ امکانات نظر آتے اور ہم نقالی کے داغ سے بچ جاتے۔

چغتائی کے آرٹ پر کچھ اس انداز سے نکتہ چینی کی جاتی ہے جو زیادتی نہیں بدذوقی ہے۔ اس سے اس کے عظیم مُدعا کو نقصان پہنچنے کا کوئی احتمال نہیں۔ جہاں تک ثقافتی رشتوں کا تعلق ہے اس کے فن کی اہمیت بڑھتی رہیگی۔ اس سے کبھی مایوسی نہ ہوگی۔ اس کا درویش سُلطان۔ مزدور۔ کسان۔ قلندر کبھی نسلی تنزل کا شکار نہ ہوگا۔

غنی آن سخن گوئے بلبل صفیر   نوا سنج کشمیرِ مینو نظیر
یکے گفتش اے شاعرِ دل رسے   عجب دارد از کارِ تو ہر کسے
بپاسخ چہ خوش گفت مردِ فقیر   فقیر باقلیم معنی امیر
زمن آنچہ دیدند یاران رواست   درین خانہ جز من متاعے کجاست
غنی تا نشیند بہ کاشانہ اش   متاعے گرانے است در خانہ اش

چوں آں محفل افروز در خانہ نیست
تہی تر ازین ہیچ کاشانہ نیست
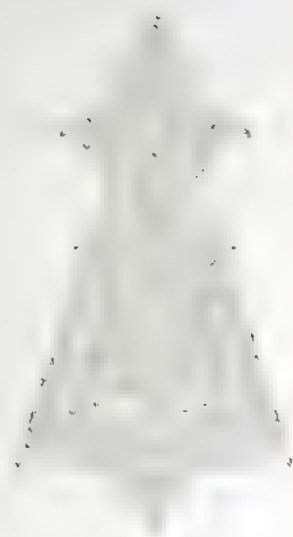
GHANI KASHMIRI

Chughtai is a versatile genius. Sometimes he draws illuminations of his designs of decorative panel and other historical subjects in the most distinguished and progressive form. Being very much inspired by the Poet-Ghani, he protrays him with strength and passions very powerfully. The beauty of colours and lines, along with mosaic treatment present it as the most perfect piece of art. In his broad energetic colourful mood, Chughtai has shown the fine craftmanship of a born artist, and a designer, that distinguishes him truly of refined poetic mind.

"WHO GAVE TO IND DESIRE OF LIBERTY?
WHO TAUGHT THE PREY TO HUNT?
THEY WERE THOSE SONS OF KASHMIR, WITH ALIVE AND VIBRANT HEARTS."

IQBAL

قمار زندگی
بیا تا کار این امت بسازیم
قمار زندگی مردانه بازیم
چنان نالیم اندر مسجد شهر
که دل در سینهٔ ملا گدازیم

بنتِ اُمم

اپنے صحرا میں بہت آہو ابھی پوشیدہ ہیں
بجلیاں برسے ہوئے بادل میں بھی خوابیدہ ہیں

اقبال
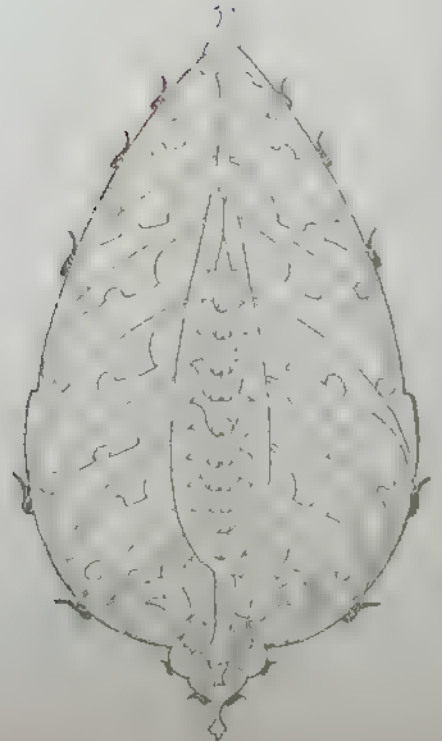
بنتِ اُمم

قوموں کے عروج وزوال میں عورت کا کردار بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ بنتِ امم اور اسکے کردار کا مطالعہ قوموں کے عروج وزوال اور اس کے عزم کا مطالعہ ہے۔ جس سے عالمگیر زندگی کا تصور پیدا ہوتا ہے۔ آرٹسٹ نے جہاں تک ان تصورات و تاثرات کا جائزہ لیا ہے وہ خود اس کے عمیق مطالعہ سے ثابت ہے۔ اس سے یہ بات بھی ثابت ہوتی ہے کہ وقت آنے پر ایک عورت اپنے عزم کو اپنے کردار کی بلندی اور تن دہی سے انجام دیتی ہے یہ بات عورت ہی کا حصہ ہے کہ وہ وقت پڑنے پر رقابت، بیوفائی، اور جاں نثاری میں اس درجہ شدت اختیار کر لیتی ہے کہ ایک مردِ مجاہد بھی اس مقام پر شکست خوردہ نظر آتا ہے۔ وہ بیٹی، ماں اور محبوبہ ہوتے ہوئے بھی مجاہد بننے سے انکار نہیں کرتی۔ اور کبھی کسی ایسے انتشار کا شکار بھی نہیں ہوتی جس سے اس کا نظریۂ فرائض اپنے مرکزی نقطے سے ہٹ جائے۔

بظاہر تصویر میں کوئی ایسی علامت نظر نہیں آتی جس سے یہ پتہ چلے کہ جنگ جاری ہے۔ مگر بنتِ اُمم کا عزم اور اس کی نگاہ کے تاثرات اس قدر موثر اور ولولہ انگیز ہیں کہ یوں محسوس ہوتا ہے کہ طبلِ جنگ بج رہا ہے۔ سپاہی مجاہدانہ اور سرفروشانہ ٹھ کھڑے ہوئے ہیں اور جہادِ زندگانی پر کمربستہ کشاں کشاں میدانِ جنگ کی طرف چلے جا رہے ہیں۔ ان کے گھوڑوں کی ٹاپیں غروں کی بلند صدائیں روئیں روئیں میں طوفان اور ولولہ پیدا کر رہی ہیں۔ مجاہدانہ اقدام، زندگی کی پرواز اور روح کی بالیدگی سے بھرپور۔ یہ بنتِ اُمم اقبال کا ایک کردار ہے جس کی شان میں اس نے کئی نظمیں لکھیں اور بڑے مؤثر نکات بیان کئے۔

چغتائی کی بلند نگاہی نے اس پیکر کی سادگی کو ایک ایسا پرشکوہ تصور بخشا ہے کہ وہ اس کے اسلوب اور رنگوں کی حلاوت اور جذبات کے اظہار سے ایک قابلِ احترام اور ناقابلِ فراموش کردار بن گیا ہے۔ اس کا متوازی چہرہ، پُروقار تناؤ، حیات پرور خلوص، نظر کی متانت اس کی یگانگت کی دعوے دار ہیں وہ قوم کے ذمہ دار فردِ واحد کی صورت میں ڈھل گئی ہے۔ اس کی گرفت میں اس کا سرخ خنجر مرکزی حیثیت رکھتا ہے۔ ہزاروں جلوے ہزاروں بناؤ اس کی گرفت سے پیدا ہو رہے ہیں جن سے اسکی انفرادیت اور اس کا سپاہیانہ انداز ان حدود سے بھی تجاوز کرتا نظر آتا ہے جہاں وہ عورت یا ایک محبوبۂ دلنواز ہے۔

آرٹسٹ کے تصویر بنانے میں جہاں تک غور وفکر انداز دلبری کا تعلق ہے بنتِ امم کی انفرادیت مجموعی اعتبار سے تقوی اور طمانیت پر ہے۔ اس کے ارادوں کا ارتقا لامحدود حدود کا حامل ہے۔ اس کا یہ اقدام قوموں کی تعمیر اور تدبیر کا محرک ہے جنھیں قوموں کے اقتدار اور وقار نے عالمگیر اخوت کی راہ میں ہمیشہ بھینٹ دیا ہے۔ چغتائی نے اپنی تخلیقی قوتوں، متحرک تحریکوں اور انقلاب آفریں جذبوں سے بنتِ اُمم کو سنوارا ہے۔ وہ علامہ اقبال کے ان خوابوں کی تعبیر ہے۔

جوانھوں نے کاروانِ حیات کے چلنے پھرنے اور اُبھرنے کے لئے دیکھے تھے۔

یہ بنت اُمّ عالمگیر سرزمین کی بیٹی ابد تک یاد رہے گی۔ وہ ملوکیت کے خاتمہ کا حاصل ہوگی۔ اس کا بلند عزم جسبت بن جائے گا۔ وہ بیٹی کے وقت بیٹی اور محبوبہ کے وقت محبوبہ ہے۔ وہ ایک دن ویرانوں کو لالہ زار بنا دے گی۔ اس کا سرا اُس کا کردار، قوموں کے عروج و زوال کا نقشہ ہے۔ یہ وہ بنت ہے جس نے کبھی اپنے فرائض سے فرار نہیں کیا۔ سَے لمحۂ فکر کو عمل اور صداقت کا درجہ حاصل ہے ؎

یہ کلی بھی اِس گلستانِ خزاں منظر میں تھی
ایسی چنگاری بھی یارب اپنی خاکستر میں تھی

یہ زورِ دست و ضربتِ کاری کا ہے مقام
میدانِ جنگ میں نہ طلب کر نوائے چنگ

خونِ دل و جگر سے ہے سرمایۂ حیات
فطرت لہو ترنگ ہے غافل نہ جل ترنگ

تن زنن و جان زندہ زربطِ تن جان است
یا خرقہ و سجّادہ و شمشیر و سنان خیز

از خوابِ گران خوابِ گران خوابِ گران خیز
از خوابِ گران خیز

RETROSPECT

Chughtai, is at his best, when he draws a romantic theme. The new subject that he portrays attains maximum of light, colour and harmony. He tries to discover the whole spirit with a contrast of the past and the present. His touches, in a holy spirit, and his revolt against the established standard of art, give a clue to his penetrating understanding.

"BE ASHAMED IF YOU WANT TO INHERIT A DIAMOND FORBEARS,
THIS CANNOT GIVE THE PLEASURE THAT IS IN QUARYING A DIAMOND.

IQBAL

فروغِ دیدہ

خلافت، فقر با تاج و سریر است
زہے دولت کہ پایان ناپذیر است

اقبال
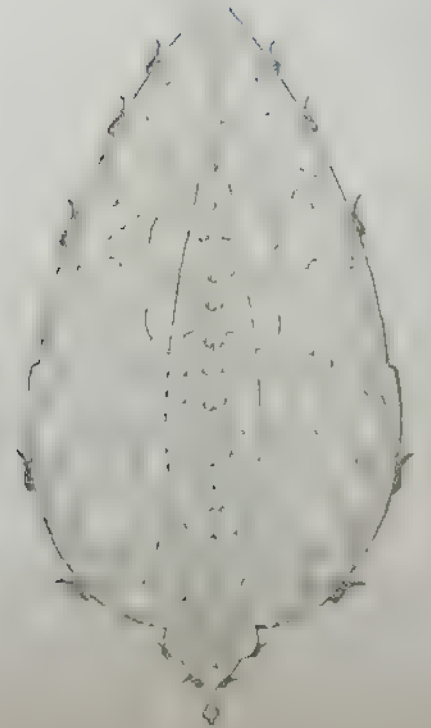
فروغِ دیدہ

پُرشکوہ تصویریں بنانا اور تصویروں کی زبان سے ماضی کی داستان سُنانا چغتائی کے فن کا کرشمہ ہے۔ اکثر اوقات یُوں معلوم دیتا ہے کہ چغتائی ایسی تصویریں بنانے پر مجبور ہے۔ پھر اس کی طرزِ نگارش اور موضوع میں باہم ایسی ہم آہنگی پیدا ہوتی ہے کہ ہر تصویر کی ہیئت اور مواد جانا پہچانا نظر آتا ہے۔ اور کہنا پڑتا ہے کہ جلال و جمال کی بصیرت اور نسلِ انسانی کی عظمت کو بلند سے بلند کرنا ہی منشاء ہے۔ مصوّر کے رُجحانات کا جائزہ لیا جائے تو وہ محض اس تصور پر قناعت نہیں کرتا کہ انسانی زندگی کا سرمایہ گُدڑی پوش بھکاری ہیں۔ بلکہ ان کا تعلق ملک کے مدبّروں، مملکتوں اور حکومتوں کے مسائل اور حکمرانوں کی اہمیت سے بھی ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ پُرشکوہ ہستیوں میں اس اعتقاد کا حل تلاش کرے جس سے اس کائنات کا وجود کسی اہم ترین نظام کے تحت رواں دواں ہے۔

چغتائی نے یہ تصویر ۱۹۳۲ء میں اپنے آبائی مکان میں تخلیق کی تھی اور غالباً یہ تنگیٔ داماں کا ردِ عمل ہے کہ وہ پُرشکوہ زندگی کا تصور پیدا کرے جس سے اس کے ماضی کو بڑا گہرا تعلق ہے۔ ایسی تصویروں سے ماضی روشن ہوتا ہے۔ ورثے سے اطمینان حاصل ہوتا ہے۔ اور اعلیٰ زندگی کا تصور ان حقیقتوں کا پیچھا کرنے پر مجبور ہوتا ہے۔ چغتائی نے ہمیشہ اس نقطۂ نگاہ سے روایات کا پیچھا کیا ہے۔ اس مُدعا میں اسے کہاں تک کامیابی ہوئی ہے یہ بات اس کی ہر تصویر اور اس کے مواد سے ظاہر ہے۔ اس کی طغیانی رُکنے نہیں پائی اور اس کا دماغی توازن معطّل نہیں ہوا۔ اس کے عمل اور سوچ بچار کے رستوں کے حدود وسیع سے وسیع تر اور تصورات پہلے سے پُختہ تر نظر آتے ہیں۔

سُلطان کھڑا ہے، اپنی کائنات کے باہر ایک پُختہ عمارت کی مانند یوں کہ قلعہ اس کا سایہ ہے وہ پُرشکوہ مملکت جس نے دُنیا کو بسنے، رہنے اور جینے کا سلیقہ سکھایا۔ وہ اس شکوہ کا حامل ہے اور اپنے دوام کا حل تلاش کر رہا ہے، اور ذمہ داریوں کے اس بوجھ کا احساس اس کے کندھوں سے واضح ہے۔ مطالعہ سے تجربات، تصورات اور وہ امکانات دکھائی دے رہے ہیں جو بلند ہمتی و بخششوں سے حاصل ہوتے ہیں اور ان بخششوں سے ہی ان حکمرانوں کے سینے روشن اور امانت دار کہلاتے ہیں۔

چغتائی کے اس طرح کے شاہکاروں سے، اس کے فنّی شعور سے، اسکے رشحات کے فیضان سے کبھی کوئی مہ وش، کبھی کوئی ملکہ اور شہزادی کبھی سلطان اور خلیفہ، سکے روبرو یوں کھڑا نظر آتا ہے جیسے وُہ ان کا خالق ہے اور انکے فطری رجحانات کو کماحقہ سمجھنے کی قُدرت رکھتا ہے اور یہی ایک وسیلہ ہے کہ اس کی نگاہ ان شاہراہوں سے ان پگڈنڈیوں پر بھی پہنچ جاتی ہے جہاں سے چرواہے، محنت کش لوگ، چرند پرند، یہاں تک کہ شاہین ہمہ صفت دکھائی دے جاتے ہیں وہ ان سے مانوس ہے وہ اپنے ہر کردار کے تقاضوں کو سمجھتا، دیکھتا اور سُنتا ہے۔ اور اپنے آپ کو ایسی ایسی تصویریں بنانے پر مجبور پاتا ہے میں نے چغتائی کی تصویروں میں

آقا کا عصا مزدور کے ہاتھ میں اور مزدور کا عصا آقا کے ہاتھ میں دیکھا ہے۔ اور یوں بھی کہ یہ کشمکش کارہا نے دنیا میں یک دوسرے سے دوش بدوش برسرِ عمل ہے۔ شاہین صفت مجاہد، مردِ مومن، فوق الفطرت انسان یونہی کائنات کی بلندی اور پستی پر تبصرہ کرتے رہیں گے۔ تاکہ یہ سوگوار انسان اپنی خودی کے سائے میں نجات تلاش کرتا رہے۔

سُلطان اپنی دُنیا میں کھڑا فروغِ دیدہ سے اس کُلی کائنات کو دیکھ رہا ہے جس کا بوجھ اسکے کندھوں پر ہے۔ وُہ آگ اور خون سے کھیلنے والا، مصائب سے ٹکرانے والا، تہذیب و تمدن کا سرچشمہ کتنا پُرشکوہ، کتنا بلند دکھائی دے رہا ہے۔ وہ آسمانوں میں کمندیں ڈالنے والا، وُہ ستاروں کو پھاند جانے والا، رواں دواں، وُہ سلطان ہے جس کی شانِ رعنائی فقیری کا درجہ رکھتی ہے۔

تصویر کی استخواں بندی اور اس کے ترتیبی اجزا نے تصویر کی اہمیت اس قدر بڑھا دی ہے کہ بار بار دیکھنے سے بھی تسکین حاصل نہیں ہوتی۔ چغتائی تاریخ کے اوراق کو کچھ اس انداز سے دُہراتا ہے کہ اس کے کردار فصاحت، بلاغت اور تشبیہات و استعارات سے بن سنور کر وُہ ندرت اختیار کر لیتے ہیں جن کے حصول میں **اقبال** جیسے مفکر نے اپنی عمر صرف کی۔

یہ تصویر اس آرٹسٹ کی تخلیق ہے جس کے ایک ہم جماعت نے برسوں بعد کی ملاقات پر اسے اس کی آوارہ مزاجی اور بے توجہی کا احساس دلاتے ہوئے کہا تھا "مُرغیاں مُرغے اور کبوتر پالتا ہوں۔ کچھ بیچ دیتا ہوں اور کچھ رکھ لیتا ہوں اور مُلک کی تقسیم کے احسانات سے زندگی رہی تو وہ خود ہیڈ کلرک بن جائے گا"

ازل سے فطرتِ احرار میں ہیں دوش بدوش
قلندری و ضیا پوشی و کلہ داری

زمانہ لے کے جسے آفتاب کرتا ہے
اُنھی کی خاک میں پوشیدہ ہے وُہ چنگاری

جوان مردے کہ خود را فاش بیند
جہانِ کُہنہ را باز آفریند
ہزاران انجمن اندر طوافش
کہ اُو با خویشتن خلوت گزیند

WITH ALL GRACE

This immortal picture of Chughtai increases our admiration for his art. As an eminent master of painting, he paints the grace of the Sultan and thus compares the present with the past glory.

Atmosphere that seems remote all over the painting is more joyously dedicated to the motive of the artist. The subject produced the grace With All Grace.

"THE CONNECTION OF AN INDIVIDUAL WITH SOCIETY IS
A BOON;
ITS REALITY ATTAINS PERFECTION THROUGH SOCIETY.
GOD ALMIGHTY CREATED OUR FORM.
AND THROUGH PROPHETHOOD GAVE US LIFE.
WHEN A NATION GIVES UP ITS CODE OF HONOUR,
LIKE DUST, ITS PARTICLES BREAK AWAY.

IQBAL.

مشرقِ غنا

اے کہ ہے زیرِ فلک مثلِ شرر تیری نمُود
کون سمجھائے تجھے کیا ہیں مقاماتِ وجُود

اقبال
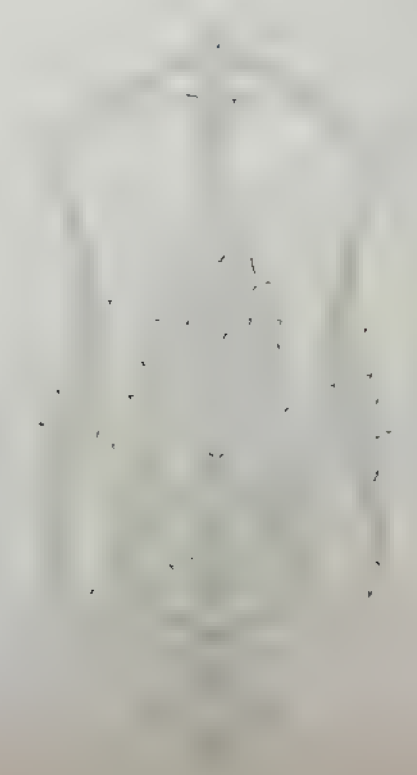
مشرقی غنا

چغتائی جن دنوں لندن میں تھا اُس نے اپنی تصویروں کی ایک مختصر سی نمائش ترتیب دی تھی۔ مغربی نقاد اور آرٹ کے مبصر سر ولیم روتھن سٹائین، ڈاکٹر بنین، باسل گرے، مسٹر ڈوبسن اور سر فرینک شارٹ جیسے لوگ تصویریں دیکھنے والوں میں تھے۔ سر ولیم روتھن سٹائین نے کہا۔ ہم دیکھتے ہیں تمہارا تخیل اور طرزِ نگارش بنگال کے جدید اسکول اور دُوسرے ہم عصر آرٹسٹوں سے بالکل مختلف ہے۔ جدید ہندوستانی آرٹ کے عناصر، تاثرات اور معنی بھی دُوسرے ہیں۔ بنگالی آرٹسٹوں کی تصویروں میں مذہبی تمثیلات کو زیادہ دخل ہے۔ اور تحریکات کا بنیادی پتھر بھی یہی کچُھ ہے۔ اس وقت ان مغربی نقّادوں کے سامنے چغتائی کی تصویریں حور، مَن لالہ، انورا، قاصدِ بہار، خلیفہ، مجاہد اور مشرقی غنا تھیں۔ وہ کہتے رہے تم اپنے ماضی سے متاثر ہو۔ تُمہاری روایات ہیں۔ تمہاری تصویروں کے خدوخال فنِ تعمیر کے خمیر سے اُبھرتے ہیں۔ ان میں وہ نستعلیقی حُسن بدرجۂ اُتم موجود ہے جس کی ترجمان یہ مشرقی غنا ہے۔ یہ تُمہارے کلچر کی ایک ایسی نمائندہ ہے، یہ ایک ایسا ستون ہے جس پر صدیوں پُرانی عمارت جُوں کی تُوں کھڑی ہے۔ یہ تصویر زندگی کی ان بھرپُور برکتوں سے سرفراز ہے جو مغل شہنشاہوں کی زندگی تک کا حصّہ تھیں۔

تصویر مشرقی غنا اس مشرقیت کی علمبردار ہے جس سے صدیوں ہندوستان متاثّر رہا اور اس مشرقیت کا دم بھرتا رہا جس سے آج بھی ہندوستان مغلوں کا ہندوستان زندہ اور تابندہ ہے۔ صُورت، سیرت، لوچ، لچک، طرزِ معاشرت کی سادگی، رنگ آمیزی کا نظم و ضبط آرٹسٹ کی ان ریاضتوں اور کاوشوں کا نتیجہ ہے جس کا اُس نے کبھی ساتھ نہیں چھوڑا۔ وہ صداقتیں اور مطالعہ کا عمل اسکی اس تخلیق سے یُوں اُبھرا ہے جیسے ہر رچاؤ اور رچاؤ پکا پکایا ایک گداز شگوفہ ہے۔ یہ مشرقی غنا ایک باکمال موسیقار کا امتیازی نغمہ اور امتیازی آہنگ ہے۔ یہ نغمہ، یہ آہنگ اور اس کی دلآویزی اور فراوانی حقیقی طور پر ہمارے لئے اجنبی نہیں، سوائے ان کے جن کی روایات اور کلچر کا امتیازی نشان گم ہوگیا ہو۔ اور ہم مشرق کے جمالیاتی حُسن سے بے بہرہ ہوں۔

روایات پر نکتہ چینی نہ کرنا بُزدلانہ فعل ہے۔ اور یہ بات اَور بھی کم ذوقی اور کم نگاہی کی دلیل ہے کہ ہم اپنی مشرقیت کو نظرانداز کرتے ہوئے مغرب پرستی کی تقلید میں اپنی روایات کی مذمت کرنے لگیں اور ان کے وسیع امکانات سے مُنکر ہو جائیں۔

چغتائی نے اپنی ہر تصویر میں اس لازوال اور پُراسرار حُسن کی چہرہ کشائی کی ہے جو مشرق کی رُوح اور روایات کیلئے طرۂ امتیاز ہے۔ یہ اس ریاضت اور مشاہدے کی دین ہے جس کو اس نے اپنایا اور چغتائی سکول سے وابستہ کردیا۔ یہ مغل خاتون، حرم کی یہ عظمت سرو کے مانند منظرِ پر اُبھر آئی ہے۔ جو چغتائی کے ذہنی تخیل نے فطرت کے آئینہ خانہ سے چُن کر حسن پروری کی مثال پیدا کی ہے۔ ایسا نظر آتا ہے یہ صدیوں کے کلچر کا نچوڑ ان قدر مندیوں اور فیاضیوں کو سراہ رہی ہے، جو مغلوں کے دم اور مغلوں کی سلامتی

سے زندہ تابندہ تھیں۔ پیکر کی درخشاں ادا، اقتادِ اور حجابانہ انداز اتنا پُرشکوہ اور اطمینان بخش ہے کہ تخیل کی رعنائیاں دلکشی اور حرکت سے جلوہ افروز ہیں بعض جمالیاتی خوبیاں سربستہ رازوں کی طرح رنگوں کی حلاوت سے ہم آہنگ ہیں اور ایک دوسرے میں یوں مدغم ہیں کہ **چغتائی** انفرادیت نے ایک نیا جنم لیا ہے۔ اور فن کے زیر اثر اس نے ایسی قوتوں کو اُجاگر کرنے میں شعور سے کام لیا ہے کہ ذوقِ نظر کا استحکام فرد اور جماعت کے رشتوں کا سنگِ میل نظر آنے لگا ہے۔ حُسن کی جولانیاں اور عشق کا سوز و سازِ زندگی کی قدروں سے کبھی جُدا نہ ہوگا۔

یہ مشرقی غنا، یہ مشرقی نُور، دل آویز نغموں میں ڈھلی ہوئی، ڈھلی ہوئی جمالیاتی حُسن میں بسی ہوئی، مشرقی رنگ و بُو میں لپٹی ہوئی، اپنی عظمت اور تمکنت میں ملبوس پورے جاہ و جلال سے اس تہذیب و تمدن کو دُہرا رہی ہے جس سے دل کی دھڑکنیں مچلتی ہیں، ایک ہیجان اُٹھتا ہے۔ ایک فضا اُبھرتی ہے۔ ایک سرور، ان برکتوں اور رحمتوں سے ہمکنار کر دیتا ہے جہاں دُھندلکوں کا گُذر نہیں۔

اقبال نے ایک مفکر اور فلسفی کہلانے سے پہلے ایک غزل گو کی حیثیت سے انسانی فکر اور تخیل کو کس قدر مؤثر پایا ہوگا۔ کہ اس نے مشرق و مغرب کے موضوع کو موضوع بنایا اور سے ایسا امتیازی رنگ دیا کہ چغتائی بھی تقاضوں کے فرائض و معاشرے کی مزدوروں سے رجعت پسندی سے منہ موڑ کر نئی راہوں کی ٹوہ میں لگ گیا۔ اُس کے شاہکار اس کی سلامتی کا یقین دلاتے رہینگے۔ اس کی اس طرزِ نگارش سے اور اس کی اس مشرقیت سے جس سے دورِ احیاء کے عظیم اُستادوں نے اپنی مشرقیت کا ثبوت دیا۔ جو کچھ وہ کر سکے اُسے حضرت مسیح کے قدموں میں ڈال دیا مع اس پیغمبرانہ تصور اور تقدس کے جس پر ان کا ایمان تھا ؎

تری خودی سے ہے روشن ترا حریمِ وجود
حیات کیا ہے، اسی کا سرور و سوز و ثبات

بلند تر مہ و پرویں سے ہے اسی کا مقام
اسی کے نُور سے پیدا ہیں تیرے ذات و صفات
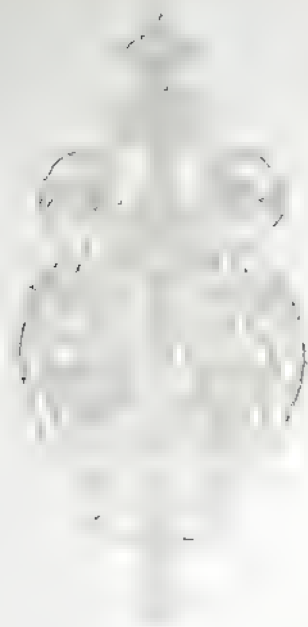
CHARM OF THE EAST

Chughtai, the great artist of our time laboured with great passion and devotion to produce the spirit of the East. In his paintings, he has full command and mastery over his subjects with colours and drawing. His rendering of long lost subjects with freshness is amazing.

He justifies his work with manifestation of the endless varieties of life and the sparks of human Ego. He loves the East, beauty and virtues belong to the East.

Chughtai is a student and lover of Mughal, Rajput, Persian and Egyptian Art.

"'TIS THE POET'S BREAST THAT BEAUTY UNVEILS,
'TIS FROM HIS SINAI THAT BEAUTY'S BEAMS ARISE;
BY HIS LOOK THE FAIR IS MADE FAIRER,
THROUGH HIS ENCHANTMENT NATURE IS MORE BE-
LOVED.

IQBAL

کتابِ حکمت

ز قرآں پیشِ خود آئینہ آویز

دِگرگوں گشتۂ! از خویش بگریز

اقبال

کتابِ حکمت

علامہ اقبال نے جہاں لا الٰہ اور کتابِ الٰہی کو انسان کی نجات اور اس کی سلامتی کا ذریعہ ٹھیرایا ہے وہاں اُنھوں نے زندگی کی جدوجہد کو بھی اس عالم گیر نظام کا پیش خیمہ قرار دیا ہے، جس سے وہ زندہ تابندہ ہے۔ اُس نے شاہین صفت انسان اور اس کی خودی کے خدوخال الفاظ کے دائروں اور جذبات کی حدود سے تجاوز کرتے ہوئے دکھائے ہیں۔ چغتائی کی یہ تصویر ایک نقش ساکن کا شاہکار ہے۔ یہ ذی رُوح نقش رنگوں کے امتزاج سے اُبھرے ہوئے ہیں۔ رنگوں سے اس کا انگ انگ اُبھرا اور نمایاں ہُوا ہے۔ روشنیاں اور سائے رنگوں ہی میں ڈھل کر جذبات کا اظہار کر رہے ہیں۔ محدود اور لامحدود محسوسات زندگی کی نشوونما کی صُورت پھیلتے اور سُکڑتے جا رہے ہیں۔ غور و فکر کے سرچشمے نے موضُوع کو تازگی دی ہے۔ اور اس تازگی میں زندگی کی توانائی بھی ہے اور مسرت بھی۔ تصویر کا ہر گوشہ خوشبوؤں اور اُمیدوں کی جستجوؤں کی طرف ایک بامعنی اشارہ ہے۔ یہاں جامد کچھ نہیں، سب کچھ حیات کے تابع ہے۔ یہ فرحت بخش اور خوشگوار فضا اپنی وارفتگی میں ان ہلکے ہلکے سانسوں کا احساس دلاتی ہے جو فن کار کے کمالِ فن کی تخلیق ہیں۔ اس نے ان کو مکمل کرنے میں اپنی انفرادیت سے پُورا پُورا کام لیا ہے۔ چغتائی نے اپنے ان نقوش میں بھی اندھی تقلید سے کام نہیں لیا۔ اس نے فطرت کے مطالعے کو سُرخ پتوں، زرد پھُولوں اور نازک کلیوں کی شکل دینے میں بڑی دلآویز رمزیت سے کام لیا ہے۔ حقیقت اور تخیل کا رچاؤ اس فنی مسلک کا حصّہ ہے۔ تصویر کی گہرائیاں وارداتِ قلب کو گرما رہی ہیں۔

چغتائی مغرب کی کسی تصویروں سے دُور نہیں۔ اس نے ان کا مطالعہ کیا ہے۔ مگر اس رُوحانی اور رومانی ترتیب و تزوین اس کی اس سنجیدہ وارفتہ محبت کا اظہار ہے جو اسے کتابِ الٰہی سے ہے۔ فیضان کے بیش قیمت لمحوں میں موضوع ایسی اچھوتی شکل میں ڈھل گیا ہے کہ یہ رنگوں نے ایک نیا روپ اختیار کیا ہے۔ یہ یاد دلاتی دیتا ہے کہ تخلیق کی ہر پختگی اور شگفتگی کتابِ الٰہی سے وابستہ و پیوستہ ممکن ہے۔ کتاب ہی دین و دنیا ہے اور کتاب ہی روشنی۔ کتاب ہی رضائے الٰہی، حیاتِ انسانی کی منظر اور خضرِ راہ ہے۔

رنگوں کی حلاوت، موضُوع کی نُدرت اور اس کی اجنبیت طبیعت کو اپنی طرف کھینچتی ہے اور دل چاہتا ہے کہ سُرخ سُرخ پتوں کو چھُوا جائے اور مسلا جائے اور ان صفحات کو مسلا جائے اور ان صفحات کو پرکھا جائے جن کی تہہ میں فن کار کی کوشش ایک ایسی بشارت بن گئی ہے جس کا سلسلہ ختم ہونے میں نہیں آتا۔ رحل، زرد، سُرخ پتے، کتابِ حکمت کی عکاسی، نگاری جدت طرازی اور طریقہ اظہار سے آرٹسٹ کی چابکدستی نمایاں ہے۔ اس نے مواد اور ہیئت کو جس خوبی سے واضح کیا ہے وہ اس کے فن کی لطافتوں اور برکتوں کا حصّہ ہے۔ اس نے فنی محاسن کے کسی بھی پہلو کو نظر انداز نہیں کیا جس سے اس کے

مقاصد اور مدعا کی تکمیل کا پہلو نہ نکلتا ہو۔ اس نے بڑی بصیرت سے تصویر کی تشکیل و تکمیل کے ہر پہلو سے متوازی طور پر نئے مطالعہ کی راہیں کھول دی ہیں، تاکہ مجموعی طور پر ہم اپنے مدعا سے متاثر ہوتے رہیں اور موضوعات کیلئے نئی راہیں نکالتے رہیں

جب ذی روح انسان آرٹسٹ کی تخلیق سے متاثر ہو کر اپنے جذبات کی رو میں گن گناتا ہے۔ تو وہ تخلیق کے مقاصد کے قریب تر ہوتا ہے اور الہامی رمز کو پا لیتا ہے۔ رنگین قوس قزح، پُر تاثیر فضا، مہکتی ہوئی بہار، خزاں کی بو باس فطرت کے اثرات کا کرشمہ ہیں یا اس فنی کمال کا جس سے آرٹسٹ کا خمیر بنا ہے ؎

زقرآں پیشِ خود آئینہ آویز
دِگرگوں گشتہ، از خویش بگریز

خرد دیکھے اگر دِل کی نگہ سے
جہاں روشن ہے نُورِ لا الٰہ سے
فقط اک گردشِ شام و سحر ہے
اگر دیکھیں فروغِ مہر و مہ سے

فاش گویم آنچہ در دل مضمر است
این کتابے نیست چیزے دیگر است

THE STILL LIFE

This picture, with a charm of calligraphic lines and curves, is a mass of colours and variety of the subjects. Chughtai painted few landscapes, flowers painting and still life. In most of his paintings, we find some kind of flowers with a great splendour of colour scheme and fragrance. A vigorous composition is the outstanding characteristic of Chughtai's art which has deeply influenced Modern Indian Art.

"THIS ROSE AND TULIP BRIGHT,
WHICH SEEM TO STAY AND GLOW,
E'ER RESTLESSLY SPEED ON,
MUCH AS THE BREEZE DOTH BLOW.

IQBAL

مسجدِ قرطبہ

بُجھ کے بزمِ ملّتِ بیضا پریشاں کر گئی
اور دِیا تہذیبِ حاضر کا فروزاں کر گئی
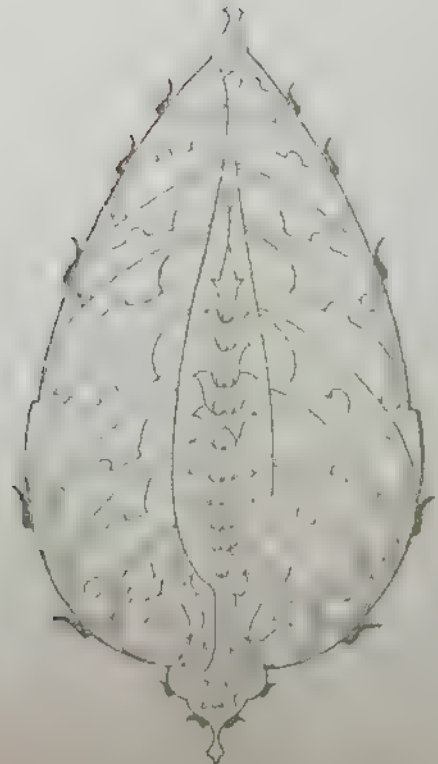
اقبال

مسجدِ قرطبہ

علامہ اقبال کی نظم مسجدِ قرطبہ شاعری کا ایک لافانی شاہکار ہے اور انسانی عظمت کے جاہ و جلال کا ایک پُرشکوہ تصور بھی۔ اس نظم کی عظمت اس لئے اور بھی بڑھ جاتی ہے کہ یہ نظم اُردو میں ہے۔ اردو کے امکانات اور اس کی بلند فطرتی کو علامہ کے افکار نے وُہ درجہ بخشا ہے کہ اُردو کا مستقبل روشن اور اس کی حدیں بیکراں نظر آنے لگتی ہیں۔ شاعرانہ اثر آفرینی کا کمال دکھانے کے علاوہ اقبالؔ نے اس نظم میں فلسفے اور تاریخ کو کچھ اس اسلوب سے ایک دُوسرے میں سمویا ہے کہ انسان پر اپنے کارہائے نمایاں کے احساس سے ایک وجدانی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ اور انسان اپنی ہر ادا کو نئے زاویہ سے دیکھنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ سلطنتوں اور حکُومتوں کو نظر انداز کرتے ہوئے بھی ان دانشوروں اور حکمرانوں کی نیتوں کی پاکیزگی اس درجہ بڑھ جاتی ہے۔ کہ دل کو انسان کے اس کمال فن اور قدر و منزلت کے سامنے جُھکنا پڑتا ہے۔ جو زندگی کی جدّ و جہد کو تقوی پر ترجیح دیتا تھا۔ اور جسے ہر چیز ناپائیدار ہونے کے باوجود پائیدار اور مستحکم نظر آتی تھی۔ یہ کامل انسان چاہتے تھے کہ اپنی برتری کو دُنیا پر مسلط کر دیں اُن کے جذبے کا خلوص، ان کے عشق کی بلندی اور اُن کے ضمیر کی پاکیزگی مورتوں کی مسجد قرطبہ کے آئیڈیل کو کبھی فنا نہ ہونے دے گی۔ اور ان زندہ لوگوں کی پاک طینتی سے عشق ھی کی بجلیاں اُندلس کی سرزمین کو روشن اور تابناک بناتی رہیں گی۔

چغتائی کی یہ تصویر اس کی کندہ کاری کا نمونہ ہے۔ یہ اس کا ایک ایسا شاہکار ہے جو محض کندہ کاری کی صنعت کے اسلوب اور اس کی تکنیک ہی سے تعلق نہیں رکھتا بلکہ اس نے اس میں وہ ہیئت اور مواد جمع کر دیا ہے کہ تصویر اک رنگی ہونے کے باوجود ہزاروں ایسی وسعتوں اور ایسی عبادت گاہوں کا تصور آنکھوں کے سامنے لا کھڑا کرتی ہے جن سے مسجدِ قرطبہ کی سی تاریخی روایات وابستہ ہیں۔ اس مسجد کا سکوت اور سکون ہے جہاں سے قلب و جگر کو نگاہ ملتی ہے۔ اور نگاہ کو رُوح کی بالیدگی سے واسطہ پڑتا ہے۔ چغتائی کو یہ وصف ودیعت ہے کہ وہ اپنے قدیم سرمایہ سے بھرپُور رشتہ قائم رکھتا ہے روایات کا اسے پورا احساس اور احترام ہے۔ اور یہی ایک سبب ہے کہ اس کا ہر تاثر اسے اس مقامِ بلند تک لے اُڑتا ہے جہاں ہر قوت صالح اپنے خلوص کی نمائندگی کرتی ہے۔

آرٹسٹ کی تخلیق میں رُوحانی اور الہامی سُوجھ بُوجھ کا ایک مخصوص انداز پایا جاتا ہے۔ اور حقائق کے پہلو بہ پہلو آرزوؤں کی ہماہمی اور زندگی کے مسائل اور امیدوں کی بوُقلمونیاں۔ اگر آرٹ میں بصیرت اور بصیرت کے پھلنے پھُولنے اور فروغ پانے کے امکانات نظر نہیں آتے، نگاہیں فن سے تجاوز کرنے کی راہیں نہیں ڈھونڈ پاتیں۔ تو وُہ آرٹ نہ تو حیات انسانی کا ساتھ دے سکتا ہے ورنہ اسے زندگی کی کامرانی میسّر آتی ہے۔ آرٹسٹ کا مقصد ہمیشہ یہ رہا ہے کہ ہم زندگی کے حقائق سے

نپٹ سکیں کبھی اپنی زندگی کے مقاصد سے فرار نہ کریں، اور انسانی تعمیر کو تعمیرِ کائنات سمجھیں۔

آرٹسٹ نے اس تصویر کا ڈھانچا تیار کرنے میں بڑی چابکدستی سے کام لیا ہے۔ اس کی ذہانت نے بے مثال پاکیزہ خطوں سے، جو اُسکے آہنی قلم نے جال کی طرح نیچے و پر بُن دیئے ہیں بہت سے کام لئے ہیں۔ ایک طرف ان خطوں کا ہجوم ضرورت سے زیادہ سیاہ تر دکھائی دینے لگا ہے لیکن یہ ترچھے اور سیدھے خط بڑے حُسن کے ساتھ اس کی تخلیقی قوتوں کا اظہار کر رہے ہیں۔ ترتیب رجز کا یہ عالم ہے کہ اُس نے اپنے موضوع کو سمجھنے اور بنانے میں فنی گہرائیوں سے وہ ہیجان پیدا کر دیا ہے جس کی موضوع کو ضرورت تھی۔ چغتائی کی یہ کندہ کاری روئیتی اسلوب اور روایتی طرزِ نگارش سے کچھ ایسی ہٹ کر سامنے آئی ہے۔ کہ چغتائی خود ایک دوسرا چغتائی نظر آنے لگتا ہے۔ ان خطوں کے پردے سے ماضی کی صدائے بازگشت اُٹھتی ہے اور مستقبل کی وہ دبی دبی چیخیں سنائی دیتی ہیں جن کو اقبالؔ نے بلند سے بلند تر کرنے کی کوشش کی ہے۔ وہ چیخیں جن کی آرزوئیں ہمیشہ تلاطم بن کر اُفق سے ٹکراتی ہیں اور آثارِ قدیمہ کو سینے سے لگانے کا جذبہ پیدا ہوتا ہے ؎

ہے زمینِ قرطبہ بھی دیدۂ مسلم کا نور
ظلمتِ مغرب میں جو روشن تھی مثلِ شمعِ طور

بجھ کے بزمِ ملتِ بیضا پریشاں کر گئی
اور دیا تہذیبِ حاضر کا فروزاں کر گئی

سلسلۂ روز و شب نقش گرِ حادثات
سلسلۂ روز و شب اصلِ حیات و ممات

سلسلۂ روز و شب سازِ ازل کی فغاں — جس سے دکھاتی ہے ذات زیر و بمِ ممکنات
تجھ کو پرکھتا ہے یہ مجھ کو پرکھتا ہے وہ — سلسلۂ روز و شب صیرفیِ کائنات

ARCH OF THE MOSQUE

Chughtai is always fresh and diligent in his work. He has distinguished himself as an Artist and as an Etcher. His art underwent a profound change during his stay in Europe. Consequently, his Drawings and Etchings are distinguished on account of the creative strength and energy of his lines. "The Arch of the Mosque" is a great achievement in the technique of Etching.

"LONG BLANK CURRENT OF TIME EMPTY OF SUNSET OR DAWN?
ALL ART'S WONDER ARISE ONLY TO VANISH ONCE MORE;
ALL THINGS BUILT ON THIS EARTH SINK AS IF BUILT ON SAND;
INWARD AND OUTWARD THINGS FIRST THING AND LAST, MUST DIE;
THINGS FROM OF OLD OR NEW—BORN FIND THEIR LAST GOAL IN DEATH.

IQBAL

اجنبی کردار

ازاں مے فشاں قطرہ بر کشیری
کہ خاکسترش آفرینند شرارے

اقبال

اجنبی کردار

چغتائی نے ایک موقعہ پر کہا تھا کہ زندگی کے بعض واقعات اِس قدر اہمیت رکھتے ہیں کہ اُنھیں کسی قیمت پر فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ خود میرے ساتھ زندگی میں کئی ایسے واقعات پیش آئے جن کی یاد برابر رُلاتی ہے اور کبھی دل کا ساتھ نہیں چھوڑتے۔ میں نے حالات کے مدِ نظر ایک ملازمت کے لئے درخواست کی اور ناکام ہُوا۔ مگر وہ ناکامی میرے درخشاں مستقبل کا پیش خیمہ بنی۔ میں بچ گیا۔ اور وہ کام جو قدرت کو مجھ سے لینے تھے جی بھر کر لئے۔ اور ایسے موقعے بھی عطا کئے کہ میں نے بڑی سے بڑی ملازمت کو ٹھکرا دیا۔ لیکن یہ صدمہ اب بھی ہے کہ میں نے ان تمغوں اور جڑاؤ اور قیمتی تحفوں کو اپنی تہی دستی سے مجبور ہو کر کیوں فروخت کیا۔ جو وقتاً فوقتاً ہندوستان کی مختلف نمائشوں سے، سوسائٹیوں سے، مہاراجوں اور مہارانیوں سے بطور اعترافِ فن کے مُجھے ملے تھے۔ اگر تنگ دستیاں نہ آتیں اور پریشانیاں نہ ہوتیں تو آج ان تحفوں اور نعامات کی مجموعی قیمت چالیس پچاس ہزار روپے سے کم نہ ہوتی۔ اس صدمے کا احساس خصُوصیت سے ان دنوں مجھے بڑی شدت سے ہوا جب میں پہلی بار کشمیر جنّت نشان دیکھنے گیا اور وہاں مجھے نظر آیا کہ وہاں کے صنعت کار دن رات محنت کرتے ہیں اور اس کے صلے میں اُنھیں پیٹ بھر کے روٹی میسّر نہیں ہوتی۔ کشمیریوں کی اس ناداری، ناقدری اور بیچارگی کے مشاہدے نے جو واقعی ایک دل دوز مشاہدہ تھا وہ سب کچھ بھلا دیا جو میری زندگی کا ایک ناقابلِ فراموش المیہ تھا۔ غالباً اسی مشاہدے کا ردِ عمل تھا کہ میں کشمیر اور کشمیریوں کو نئے نئے زاویوں سے دیکھنے لگا اور کشمیر کے موضوع پر ایک نہیں درجنوں تصاویر بنا ڈالیں۔ پھر بھی دل نہ بھرا۔ میری یہ تصویر اُن تصویروں میں سے ایک ہے۔ یہ تصویر اس اجنبی کردار کی ہے جس سے مُجھے واسطہ پڑا۔

آرٹسٹ کا بیان ہے کہ اس اجنبی کردار کی اور میری ملاقات جامع مسجد کشمیر میں ہوئی جو شہنشاہ شاہجہان کی اُن صلاحیتوں کی یادگار ہے۔ جو اسے قُدرت کی طرف سے ودیعت کی گئی تھیں۔ آرٹسٹ حیران تھا یہ کردار یہ اجنبی کردار کشمیر کا ہے جہاں ہر طرف ناقدری، ناداری، غُلامی اور حُسن کی ارزانی ہے۔ اس لئے جب اس کردار کے سراپا کا مطالعہ کیا۔ اور اس سے ہم کلام ہُوا۔ تو اُسے یُوں محسُوس ہُوا یہ فردِ وحید اُندلس کا فاتح ہے اور **علامہ اقبال** کی زبان میں اس زرخیز مٹی کا گُلِ لالہ ہے جو داغِ لالہ کے سوا اور کُچھ پیدا کرنے کی خُو نہیں رکھتی۔ اندلس کا یہ فاتح، الف لیلیٰ کا یہ شہزادہ، سب کچھ چھوڑ چھاڑ اپنی محبُوبہ کی تلاش میں مارا مارا پھر رہا ہے۔ وہ وطن کی آزادی کے خواب دیکھتا ہے۔ ان خوابوں کی تعبیریں بیان کرتا ہے اور کہتا ہے کہ ایک دن آئے گا اس کا وطن آزاد ہوگا۔ یہاں ہر طرف فراوانی ہوگی اور یہ دُنیا پھر زندگی کی نعمتوں سے معمُور ہو گی پھر

تُم دیکھنا کہ یہ صنعت کیا کیا رنگ لاتی اور صنعت کار کیسے کیسے گُل بُوٹے کھلاتے ہیں۔ پھر دیکھیں کہ وہ رُموز جو نسیم باغ اور شالیمار باغ کے درختوں میں پتّے پتّے پر لکھے ہوئے ہیں کیسے نہیں پڑھے جاتے۔

چغتائی نے بیان کیا کہ اس اجنبی کردار کی انفرادیت نے جو تاثرات میرے دل و دماغ پر چھوڑے تھے وُہ آہستہ آہستہ رنگوں اور خطوں میں ڈھل گئے۔ آج بھی اسکی انفرادیت میرا من کھینچ لیتی ہے۔ اپنی غیر معمولی شخصیت اور کردار کا جزیہ طلب کرتی ہے کہ کچھ نہ ہو، کچھ نہ کرسکوں تو اس اجنبی کردار کا ایک پیکر بناؤں اور اسے اس سے منسُوب کردوں جس کی آرزوؤں کی بازگشت بھی تک گردش میں ہے۔ وہ عشق کا مارا آج بھی اس خود پسند شہزادی کی تلاش میں سرگرداں جی رہا ہوگا جو اس کے اپنے شہر میں گُم ہے۔

کشمیر دُور کا دُور ہے وہ اجنبی کردار لاپتہ ہے۔ اس کا ایک ہی سہارا ہے۔ جس کی جستجو میں **اقبالؒ** نے نظمیں لکھیں، چشمِ نرگس کو خودشناسی کا سبق دیا، کشمیر کے لالہ زاروں کو سوزِ دروں سے روشناس کرایا اور روشن ضمیری کا پیغام دیا۔

یہ اجنبی کردار اب زندہ تابندہ کردار ہے۔ آرٹسٹ نے اسے اپنی اندرُونی کشمکش کے زیرِ اثر ایک ایسی حقیقت بنا دیا ہے کہ اس کی اجنبیت جاتی رہی ہے۔ شبیہ نگاری کا یہ شاہکار یوں ہی اپنی آرزوؤں کا تقاضا کرتا رہے گا۔ ایسے نہ جانے کتنے خود رو پھُول اس مٹّی کے اندر سے اُبھر کر مٹ چکے ہونگے۔ اور نہ جانے کتنے ہونگے کہ اب بھی اُبھرنے کے لیئے بے قرار ہونگے۔ اگر یہ اجنبی کردار تصویر کا محرّک نہ بنتا اور آرٹسٹ بھی اس حقیقت کو نظر انداز کر دیتا تو کون جانتا اور کون پہچانتا کہ اس کی وُہ محبُوبہ اس کے اپنے شہر میں گُم ہے، جس کی تلاش میں اُندلس کا فاتح مارا مارا پھر رہا ہے ؎

بہ جہانِ دردمندان تو بگو چہ کار داری
شب و تاب ماشناسی دلِ بے قرار داری

چہ خبر تراز اشکے کہ فرو چکد زچشمے
تو بہ برگ گُل زشبنم دُرِ شاہوار داری

چہ بگویمت زجانے کہ نفس نفس شمارد
دمِ مستعار داری، غمِ رُوزگار داری
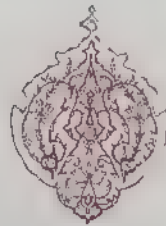
SON OF THE SOIL

Son of the Soil has all the characteristic qualities of Chughtai's art. Sensibility of Painting along with his modelling treatment have been struck by symbolism. His choice of subject and his impressionistic quality are common in all his portraits. As a draftsman he is admired on account of his plastic treatment and the basic principle of impressionism.

" WITHOUT THE CLARION CALLING, WILL THERE RISE,
A PEOPLE WHO WILL MUTINY AND LEAVE THEIR GRAVES,
GRIEVE NOT O THOU PERCEPTIVE SOUL,
GIVE OUT A SIGH THAT BURNS BOTH SEA AND LAND.
FOR MANY HUMAN HABITATIONS HAVE,
BENEATH THIS AZURE SKY, BEEN SET ABLAZE
BY FIRE THAT SEETHES IN A DERVISH'S HEART.
EMPIRE IS BUBBLE-FRAIL AND WITH A BREATH
CANST THOU DESTROY IT. NATIONS' DESTINIES.

IQBAL

عہد و پیمان

ہاتھ ہے اللہ کا بندۂ مومن کا ہاتھ
غالب و کار آفریں، کار کشا کارساز

اقبال

عہد و پیماں
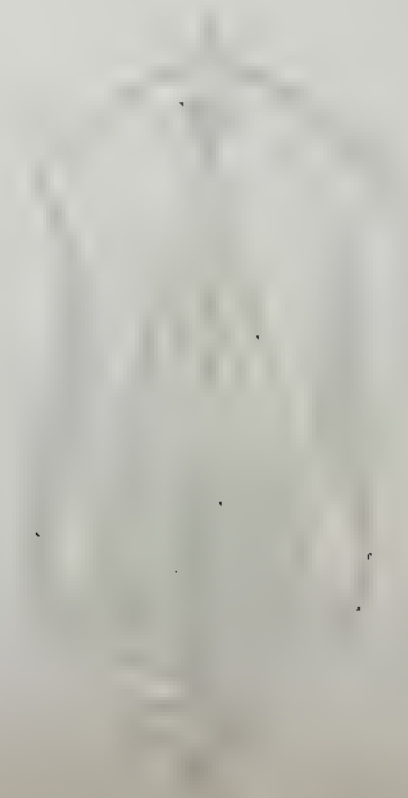
غیر فانی کردار کے لئے ایسی بنیادی قوتوں اور اصولوں کی ضرورت ہے جو خود انسان کے اعلیٰ کردار کی پیداوار ہیں۔ کبھی ہم اپنے محترم اُستاد سے عہد باندھتے ہیں اور کبھی اپنے بزرگوں کو اپنی فرماں برداری کا یقین دلاتے ہیں۔ اور کبھی اپنی محبُوبہ سے یہ پیمان لیتے ہیں کہ وُہ زندگی کی ہر اُونچ نیچ میں ہمارا ساتھ دے گی۔ سپاہی جنگ پر جائے گا تو وُہ محبُوبہ سے وفاداری کریگا اور قوم کا سپوت ثابت ہوگا۔ غازی، مجاہد اور بادشاہ تک میدان جنگ کو جاتے وقت اپنے خاندان کے افراد، قوم اور حرم کو اپنی فتح کا یقین دلاتے ہوئے اپنے الفاظ کو زیادہ سے زیادہ خوبصورت، بے باکانہ اور جاں فروشانہ انداز میں ادا کرتے ہیں اور اپنے عہد کو استوار بنانے میں کوئی کسر نہیں اُٹھا رکھتے۔ یہ تصویر خواہ پابندِ رسم و رواج ہو، پھر بھی وُہ محبت، اظہارِ محبت کا ایک عظیم جذبہ ہے جو دو محبُوبوں کے درمیان برسرِ عمل ہے۔

تصویر میں اجتماعی آرزوؤں اور قلبی واردات کا کچھ ایسا گہرا تعلق ہے کہ جذبات کا میلان اور واقعات کا اظہار بڑی مؤثر صُورت اختیار کر گیا ہے۔ دونوں چہروں پر خلوص و سنجیدگی نمایاں ہے۔ احساسات کے تیور اس قدر مؤثر اور حسین ہیں کہ تصویر ایک سماں، ایک مہکی ہوئی فضا بن گئی ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ مجاہد کو یقین ہے اور اپنے اوپر اعتماد ہے کہ وُہ میدانِ جنگ سے ایک فاتح کی حیثیت سے واپس لوٹے گا اور جب وُہ واپس لوٹے گا تو یہ فضا مُسکرائے گی۔ اور یہ سماں روشن ہو جائے گا۔ در و دیوار سے خوشی کے آنسو اُمڈ آئیں گے۔ **چغتائی** نے اس والہانہ جذبے اور ایسے حسین کرداروں کی تشکیل کی ہے۔ یہ تصویر زندگی کی حرارت اور لازوال پیار و محبت کی نشانی ہے۔

یہ جذبۂ خلوص و محبت جس صُورت و سیرت میں ڈھل کر سامنے آیا ہے نسانی انا کا تقاضا ہے کہ اس سے متاثر ہو۔

یہ جذبۂ وفاداری، یہ عہد و پیمان صدیوں کے تجربات اور رُجحانات کا حاصل ہے اور ہمیشہ ایک پاکیزہ اظہار کی صُورت میں سامنے آتا ہے۔ اس رُوحانی موضوع کو چغتائی نے رزمیہ زندگی سے جا ملایا ہے۔ یہ ایک ایسا موضوع ہے جو علامہ **اقبال** کے ہاں حیات بعد از ممات سے کہیں زیادہ فکر انگیز ہے۔ جذبات کی یہ کشمکش محبت کی زندگی پر وہ پُر خلوص مہر ہے جسے خدا کے ہمہ گیر قانونِ قدرت نے عورت اور مرد دونوں کے لئے مشترک اور لازمی بنایا ہے۔ چغتائی نے تصویر کے ڈھانچے کو جس سانچوں میں ڈھالا ہے اور اس کے لئے جو اچھوتا اور دل آویز پس منظر بنایا ہے۔ اس سے تصویر کی اہمیت اور اثر انگیزی بہت بڑھ گئی ہے۔ رنگوں کا انتخاب اور استخواں بندی اس درجہ کمال تک جا پہنچی ہے کہ تصور کہاں سے کہاں لے جاتا ہے۔ یہ موضوع بنیادی طور پر زندگی کی وجدانی کیفیات سے ہم آہنگ اور ایک پُرتاثیر نغمہ ہے یہ دو کرداروں کو ایک ایسے پاکیزہ رشتے میں

مسلک کر دیتا ہے جو دو محبت کرنے والے ایک دُوسرے کو عطیہ کے طور پر پیش کرتے ہیں۔

مجاھد کے ہاتھ میں تلوار ہے۔ عورت بہ عقیدت تمام اس پر جُھکی ہوئی ہے۔ چغتائی کو رومان کی تصویریں بنانے کا بڑا ملکہ ہے۔ اور اُس نے ان تصویروں میں اکثر رومانی انداز اور دلآویز پاکیزہ کیف کو کچھ اس طرح سمویا ہے کہ ان میں ایک وجدانی کیفیت پیدا ہو گئی ہے۔ اور اس کی تصویر غزل بن کر طمانیت کا سبب بن گئی ہے۔ تصویر کو دیکھ کر یہ خیال تک بھی نہیں ہوتا کہ یہ کرشمہ محض جذبات کو اُبھارنے کے لئے استعمال ہوا ہے۔ یہی کیفیت اس کی اس تصویر سے واضح ہے۔ عورت کے جھکاؤ و تیور نے ماحول کے اندر ایسا گہرا اور سنجیدہ جذبہ پیدا کر دیا ہے۔ تلوار سے مواد اور ہیئت کی ندرت بہت بڑھ گئی ہے۔ اور دونوں کا باہمی رشتہ خود شناسی کے مسلک کے قریب تر ہو گیا ہے۔

انسان کو بجائے دوسروں کے خود سے زیادہ عشق رہا ہے۔ اور یہ عشق اس احساس کا کرشمہ ہے جس سے زندگی کی رونق اور دُوسروں کے ساتھ مل کر جینے کی مسرت اُجاگر ہوتی ہے۔ محبت کی خوشگوارِیاں کسی ستدلال پر قناعت نہیں کرتیں سوائے اس کے کہ ہم ایک دُوسرے کے لئے جئیں اور جینا سیکھیں ؎

مصافِ زندگی میں سیرتِ فولاد پیدا کر
شبستانِ محبت میں حریر و پرنیاں ہو جا

گزر جا بن کے سیلِ تُند رَو کوہ و بیاباں سے
گلستاں راہ میں آئے تو جُوئے نغمہ خواں ہو جا

مسلماں از خودی مردِ تمام است
بخاکش ما خودی میر و غلام است
اگر خود را متاعِ خویش دانی
نگہ را جز بخود بستن حرام است
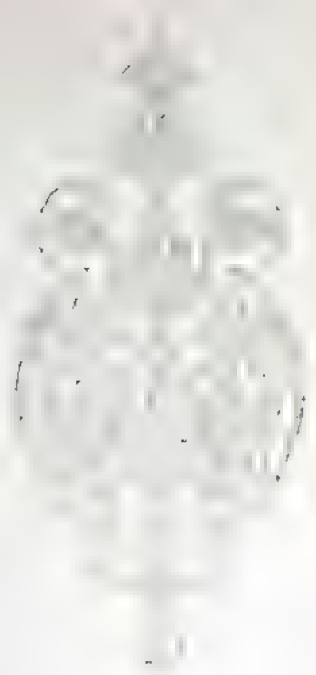
THE BOUND OF LOVE

It is evident from the technique of Chughtai that has imbibed the influence of the impressionistic school of art. His lines are like edge of the sword, while, his colours are harmony with the melody of moon-light, that always travels side by side. This brings a message of Love, Life and Immortality. Love has been a subject which has inspired the artist to sacrifice for his country's cause. It is a great achievement and a theme of painting.

**THE MARTYRS OF LOVE ARE NOT MUSLIM NOR PAYNIM,
THE MANNERS OF LOVE ARE NOT ARAB NOR TURK:
SOME PASSION FOR OTHER THAN LOVE WAS THE POWER,
THAT TAUGHT GHAZNI'S HIGH RULER TO DOTE ON HIS SLAVE.
WHEN THE SPIRIT OF LOVE HAS NO PLACE ON THE THRONE,
ALL WISDOM AND LEARNING VAIN TRICKS AND PRETENCE:
PAYING COURT TO NO KING, BY NO KING HELD IN AWE,
LOVE IS FREEDOM AND HONOUR, WHOSE SCORN OF THE WORLD
HOLDS MORE THAN THE MAGIC THAT MADE ALEXANDER
HIS FABULOUS MIRROR—ITS MAGIC MAKES MEN.**

IQBAL

مردِ مومن

کہتے ہیں فرشتے کہ دل آویز ہے مومن
حُوروں کو شکایت ہے کم آمیز ہے مومن

اقبال
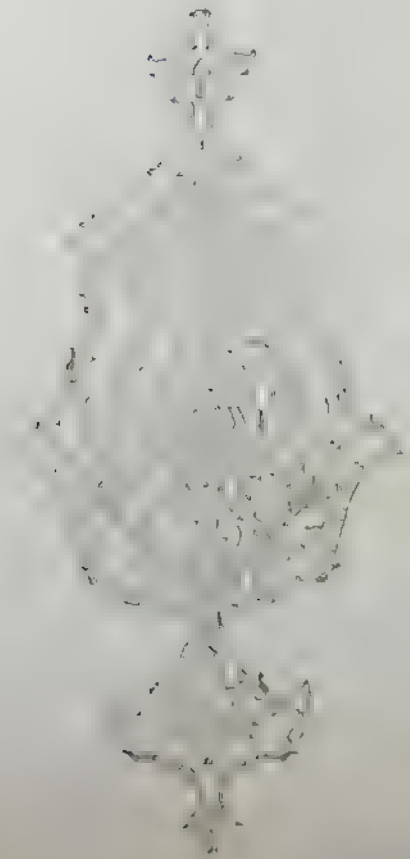
مردِ مومن

اگست ۱۹۱۸ء کا واقعہ ہے۔ اُن دنوں چغتائی کلکتہ میں تھا۔ اور وُہ ایک دن وائس پرنسپل میو آرٹ سکول کے ہمراہ بنگال کا جدید آرٹ سکول دیکھنے گیا۔ وائس پرنسپل نے جدید ہندوستانی آرٹ کے بانی ڈاکٹر ابندرا ناتھ ٹیگور سے چغتائی کا تعارف کراتے ہوئے کہا یہ چغتائی ہے اور اسے جدید ہندوستانی مصوری سے والہانہ عشق ہے۔ اس وقت ڈاکٹر ٹیگور کی شخصیت نے کروٹ لی اور اس نے کہا۔ یہ تو ہمارے غائبانہ دوست اور روشن ضمیر ساتھی ہیں ان کے وجود سے ہم پنجاب میں جدید آرٹ کے پھلنے پھولنے کے امکانات دیکھ رہے ہیں۔ ٹیگور کے تمام شاگرد اس وقت اسکے گرد جمع تھے۔ وہ اس سے گرو لہٰ مخاطب ہوتے تھے۔ جب اس خوشگوار ملاقات کے بعد رخصت ہوئے تو چغتائی کے ساتھی نے متاثر ہوتے ہوئے نپے تلے الفاظ میں کہا۔ بڑے درخت کے سایہ میں چھوٹے چھوٹے پودے کُچلے جاتے ہیں۔ تم خوش قسمت ہو کہ ان لوگوں کے سایہ سے بچے رہے اور نہ پھلنے پھولنے سے پہلے ہی دم توڑ دیتے۔ چغتائی کی آنکھوں میں ایک روشنی نے کروٹ لی اور کہا کبھی کبھی ایسا بھی ہُوا ہے کہ چلنے والوں نے پتھروں اور چٹانوں سے بھی سر نکال کر نمو پائی ہے۔

ڈاکٹر ٹیگور نے چغتائی کو اپنی بنی ہوئی کئی تصویریں دکھائیں، اور وہ تصویر بھی دکھائی جس میں مہاتما بدھ کو بشارت ہُوئی تھی۔ انکے ہاں اس موضوع پر کئی جاپانی تصویریں موجود تھیں۔ شیطان کی ترغیب اور بغاوت سے شیطانی وجود کی سلامتی ہے۔ اسکے کارناموں سے انحراف اس کے وجود کا اعتراف ہے۔ جاپانی اور چینی آرٹسٹوں کے علاوہ انسان اور شیطانیت کے رشتوں پر عیسائی آرٹسٹوں نے بھی بارہا طبع آزمائی کی ہے۔ اقبال کے ہاں بھی یہ مواد موجود ہے۔ اور اس قدر نمایاں ہے کہ مردِ مومن پر شیطان سے پیچھا چھڑانے کی کوشش میں گرفتار نظر آتا ہے۔ چغتائی کی اس تصویر کو دیکھ کر وہ مقدس لوگ یاد آجاتے ہیں جو سمادھی لگائے بیٹھے ہیں جن کے عقائد، اعتماد اور ایمان کی آزمائش کی گئی تھی۔ اور اُنھوں نے ہر حالت میں اپنی بزرگی اور برگزیدگی کو برقرار رکھا۔

مردِ مومن اپنے مدعا سے دوچار اور رحمتوں سے ہمکنار ہے۔ اپنے رب کی رضا سے پُورا پُورا لگاؤ لگائے ہے۔ اس کا سراپا، آنکھوں کی کیفیت، بیٹھنے کا انداز، فنادِ طبع، رُوح کی بالیدگی سے دوچار ہے اُسے شیطان کی شیطنت مرعوب کر رہی ہے۔ اور نہ وُہ انحراف اور ترغیب سے متاثر ہے۔ عالم استغراق میں خدا کے جلال و جمال کی روشنی اُسے زیادہ سے زیادہ امکانات اور مقامات دکھا رہی ہے۔

شیطان کی نمود اور اسکی بغاوت اپنے ترغیبی عناصر پر نہ کبھی مطمئن ہے اور نہ قانع، یہاں تک کہ آدم کو ورغلانے اور بہشت سے منہ موڑنے پر بھی اس نے کبھی اس کا پیچھا نہیں چھوڑا۔ وہ ہر بار ایک نئے رُوپ میں ظاہر ہوتا ہے اور آدمی کو ورغلانے

میں کامیاب ہوجاتا ہے۔ کبھی وہ مہ لقا بن جاتا ہے اور کبھی شرابِ ارغواں، کبھی سونا چاندی بن کر اور کبھی سلطنت کا بھوت بن کر ساری دھرتی کو آگ لگا دیتا ہے۔ وہ ہر روپ میں بستا ہے اور ہر روپ دھار لیتا ہے۔

چغتائی نے اس تصویر کی استخواں بندی جن عمیق نگاہوں سے کی ہے وہ اسکے کمالِ فن کا حصہ ہے۔ تصویر کے رنگوں کا انتخاب آگ پانی کا میل ہے۔ سبز رنگ اس نے اس اعتماد اور فراوانی سے استعمال کیا ہے کہ باوجود لبادے میں نظر آنے کے ساری فضا میں بسا ہوا محسوس ہو رہا ہے۔ اس نے اس ہمہ گیری سے اپنی اس تخلیق کو ان تمام تصویروں سے مختلف کر دیا ہے جو اپنے اپنے وقت اس موضوع پر بنائی گئی تھیں۔ بدھ کا معصوم پیکر، حضرت مسیح کی روحانی تصویریں جو پورے اعتماد اور عقائد سے تخلیق کی گئیں مع ان جدت طرازیوں کے جن میں عقیدت مندی شامل تھی۔ عیسائی اور بدھ کے پرستاروں نے بھی شراب و عورت سے اس موضوع کو آگے بڑھایا۔ چغتائی نے بھی عورت اور شراب کو موضوع کے طور پر چنا ہے۔ تاکہ اس موضوع میں الجھنوں کی بجائے معنی پیدا ہوں یہ اس کی بالغ نظری ہے کہ تصویر ایسی نظر آئے جس سے سیرت مرتب ہو، اور وہ انسان کے گناہوں کا کفارہ بن جانے مردِ خدا اور بغاوت میں کوئی رشتہ نہ ہو۔

مردِ مومن کی یہ ساخت ایک ایسی تخلیق ہے جس سے شعور کی منزلیں کھلی ہیں۔ عشق کی سرمستی ارتقا کا ساتھ دیتی ہے انسان کی خودی اس کے بیان کا کرشمہ ہے۔ اقدارِ حیات اور ذاتِ خداوندی سے انسان کبھی محروم نہیں رہا۔ اس نے ابدی زندگی سے کبھی سرکشی نہیں کی۔ چغتائی نے اپنی اس تخلیق کے ذریعے سچے وجدان اور صحیح جستجو کا پیچھا کیا ہے تاکہ ارتقائی سلسلہ جاری رہے۔

کافر کی یہ پہچان کہ آفاق میں گم ہے
مومن کی یہ پہچان کہ گم اس میں ہیں آفاق

چھپتے نہیں کنجشک و حمام اس کی نظر میں
جبریل و سرافیل کا صیاد ہے مومن

مسلمانے کہ خود را امتحان کرد — غبارِ راہِ خود را آسمان کرد
شرارِ شوق اگر داری نگہدار — کہ با وے آفتابے می توان کرد

TEMPTATION

Chughtai is characteristically original in his theme and designs. His every picture is new and original. The composition of his paintings, his conception and his vast knowledge are based on the study of his delicate subjects. "Temptation" means "courage" and not the hero-worshipping, which consists in facing the physical danger. A great courage is required in having faith, character and the ideal value of personality. A still greater courage is required in facing misunderstanding.

"KEEP THE DESIRE ALIVE IN THY HEART AT ANY COST; LEST THE HANDFUL OF THY DUST SHOULD TURN INTO A GRAVE.

"THE SELF BECOMES MORE ENDURING THROUGH LOVE— MORE ALIVE, ZEALOUS MORE EFFULGENT!

IQBAL

حدِ نگاہ

نہ پنداری کہ مردِ امتحاں مُرد

نہ میرد گرچہ زیرِ آسماں مُرد

اقبال

جذبِ نگاہ

چغتائی کا یہ شاہکار تکنیک اور فنی محاسن کی رُو سے بالکل اچھوتا اور مختلف واقع ہوا ہے۔ چغتائی کی یہ تخلیق اس کی نئی طرز تکنیک کندہ کاری کا کرشمہ ہے۔ جو رنگ، مُوقلم اور پنسل سے بے نیاز ہے۔ اس تصویر کی نوک پلک، خط اور خطوں کے اُلٹے سیدھے الجھاؤ سب آہنی قلم کے پیدا کردہ ہیں جو ذہنی توازن سے زندگی حاصل کرتے ہیں۔ کندہ کاری کے سیاہ و سفید خطوط تخیل کی اتھاہ گہرائیوں میں نئے سے نئے تسلسل کا سامان بہم پہنچاتے ہیں۔ اور کہا نہیں جا سکتا کہ زندگی کا یہ لامتناہی سلسلہ نظم کی لے اور الفاظ کی ترنم کی مانند کہاں جا کر دم لے گا۔ چغتائی کو کندہ کاری کا یہ اچھوتا وصف کچھ ایسا راس آیا ہے کہ وہ نئے جذبات اور تاثرات کو بڑی ہنرمندی سے اس جنبی تکنیک میں اس لطافت سے سمو دیتا ہے جو برش کے خطوں اور رنگوں میں بھی نہیں سما سکتے۔ وہ ان میں ایسی ندرت اور زندگی بھر دیتا ہے کہ ہم قدم قدم پر اس سے مستفید ہوتے چلے جاتے ہیں۔ کندہ کاری کی صنعت نے اس کے مداحوں کو کہاں تک متاثر کیا؟ ہم رواں دواں کہاں سے کہاں جا نکلے؟ یہ اپنے احساسات کا جائزہ ہے اور یہ اس تسلسل کی زندہ حقیقت ہے جسے آرٹسٹ نے اپنی گرفت میں لا کر خود کو خضرِ راہ ثابت کیا ہے۔

سنگلاخ چٹانیں، سخت کوش منزلیں، لڑکھڑاتے ہوئے قدموں کی آہٹیں، ذہن کا پھیلاؤ، اونچے مقام، کیا ہے جو آرٹسٹ کے تخیل نے دکھانے کی کوشش نہیں کی۔ فضا ہر آہٹ پر اس نغمے سے معمور ہے، جس سے انسان کا عزم لڑکھڑا جاتا ہے انسان ہر موڑ پر، ہر لمحہ ان دیکھی منزل کو عبور کرنے میں نئے سے نیا یقین استعمال میں لاتا چلا جاتا ہے۔ اور جب اپنی انتھک جدوجہد کے باوجود اسے کچھ ہاتھ نہیں آتا تو وہ خودی اور اعتماد دونوں کو اس پرسکون آغوش کے حوالے کر دیتا ہے۔ جہاں سوائے اپنی شکست کے اسے کچھ دکھائی نہیں دیتا۔

ہمارے ادب اور آرٹ میں اونٹ زندگی کی جدوجہد کا ایک مسلمہ استعارہ ہے۔ چغتائی نے اپنی اس انمول تخلیق کے ذریعے منزل کی تکمیل کو جس صورت میں پیش کیا ہے یہ ان لامحدود وسعتوں اور صحراؤں کا سوال نہیں جن کے زیر دم میں انسان ہار کر ہتھیار ڈال دیتا ہے۔ یہ اس تغیر اور تعمیر کا سوال ہے جہاں عقل انسانی ٹھوکریں کھاتے کھاتے عمل سے گریز پر اُتر آتی ہے اور اسے اپنی بلندی و پستی میں تمیز نہیں رہتی۔

کندہ کاری کا یہ نمونہ اور اس کی تخواں بندی، ترتیب اجزا، ماحول اور فضا یہ سب ان خطوط کا کرشمہ ہے جو آرٹسٹ نے اپنی تخلیق کو تکمیل دینے میں اپنی بے پناہ قوتوں اور بخششوں سے کام لیا ہے۔ منزل کی جستجو میں چلتے رہنا۔ چلتے رہنا۔ یہی ذہنی وسعتوں کا جال ہے یہی تاثرات کی اتھاہ گہرائیاں اور تراشی ہوئی تیز دھار چٹانیں ہیں جہاں انسان منزل کی تلاش میں چلتے چلتے

ہمت ہار دیتا ہے۔ حالانکہ یہ ان تھک اونٹ اپنی کسی جستجو میں ہمت ہار دے اور دم توڑ دے۔

چغتائی کی فن کارانہ عظمت کا اندازہ کرنے کا ایک یہی طریقہ ہے کہ ہم اس کے ان تاثرات کو سمجھنے میں آگے بڑھیں جنھیں آرٹسٹ نے بڑے قریب سے دیکھا ہے۔ پہلے سمجھا ہے اور پھر دکھایا ہے۔ تھکا ہارا اونٹ اپنی بلند ہمتی کا مظہر اپنے سوار کو لئے تیزی سے کامرانی کرتا ہوا دنیا کی ہاؤ ہو سے دور اس مقام پر آپہنچا ہے جہاں وہ اپنے آپ کو بے بس اور اپنے قویٰ کو شل پاتا ہے۔

امکانات کا دروازہ کبھی بند نہیں ہوا۔ زندگی کی ماہیت بھی ایک مسلسل جدوجہد ہے۔ **اقبال** نے اپنے پیغام کے رموز کو جس جس انداز سے بیان کیا ہے اور کتاب بھی کی روشنی میں ہر امکان اور قوت کے ساتھ اس کی ترجمانی جس جس طرح کی ہے، چغتائی کی یہ تصویر یہ حدِ نگاہ اس پیغام کی وضاحت ہے۔ اس موضوع کا کرشمہ ہے۔ وہ جہاں، وہ پوشیدہ جہان، وہ گمشدہ دُنیا جس کی آرزو میں انسان بیتاب ہے اور جس کی ازل سے اُسے تلاش ہے ؎

ترا شایان چنین مرگ است ورنہ
زہر مرگے کہ خواہی میتوان مُرد

ہر اک مقام سے آگے گذر گیا مہِ نو
کمال کس کو میسر ہُوا ہے بے تگ و دو

نفس کے زور سے وہ غنچہ وا ہُوا بھی تو کیا
جسے نصیب نہیں آفتاب کا پرتو

نہ پنداری کہ مردِ امتحان مرد   نمیرد گرچہ زیرِ آسمان مُرد

آگ بُجھی ہوئی اِدھر ٹوٹی ہُوئی طناب اُدھر
کیا خبر اس مقام سے گُذرے ہیں کتنے کارواں

THE ENDLESS HORIZON

Chughtai has travelled in France, Germany, U. K. and Itlay. On his return from this journey we find a remarkable change in his work. He introduces the art of Etching with full confidence and surety, and carries out a new technique which has never been carried before.

He always takes delight in the contrast of light and shade. This Etching of the artist shows the powerful treatment in the technique of glow of shade against the light. His lines engraved in copper are simply remarkable. He has, undoubtedly achieved craftsmanship and unerring artistic skill in his Etching. His work will continue to inspire generation after generation, especially the young searchers of his motifs and technique.

"SILENT IS THE MOONLIGHT,
SILENT THE BOUGHTS OF TREES,
SILENT ARE THE MUSIC MARKER OF THE VALLEY,
AND SILENT THE THE GREEN ROBED ONES OF THE HILLS.
CREATION IS IN A SWOON
AND ASLEEP IN THE ARMS OF THE NIGHT.

IQBAL

مردِ شاہین

تُو اے شاہیں نشیمن در چمن کردی ازاں ترسم
نوائے اُو ببالِ تو دہد پروازِ کوتاہی

اقبال

مردِ شاہین

ایک نہیں یہ دو شاہین ہیں۔ ایک شاہین اور دُوسرا شاہین صفت انسان۔ عُمر کی پُختگی کے ساتھ ساتھ شعُور اور خود آگاہی جیسی دولت سے مالا مال۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے کسی چٹان سے تراش کر نکالا گیا ہے۔ کشادہ پیشانی، کُھلے کُھلے شانے، متفکرانہ تیور، چہرے کی پُختگی۔ اس کے ہاتھوں کی مضبُوط گرفت پر شاہین اس طرح مطمئن بیٹھا ہے جیسے وُہ واقعی کسی اٹل چٹان پر بیٹھا ہو۔ ایک دُوسرے کو سمجھنے کا جذبہ دونوں میں عیاں ہے۔ تصویر کا تعمیری ڈھانچا آرٹسٹ کے وجدان سے معمور ہے۔ اور یہ بات فنکار کا انفرادی وصف ہے کہ وہ اپنے انفرادی کردار کو اپنے تخلیقی پیکروں کے ذریعے زندگی کے اُن رموز اور اس سوز و ساز سے استوار کرتا رہے جس سے زندگی میں رفتار اور پرواز میں بلندی پیدا ہوتی ہے۔

شاہین نے شاہین کو اعتماد میں لے رکھا ہے۔ حاکم اور محکوم میں، محمود اور ایاز میں کوئی ایسی تفریق نظر نہیں آتی کہ جذبۂ محبت کی ہمہ گیری اور ہم آہنگی کا احساس نہ ہو۔ یہ بے نیازی اور جذبۂ طمانیت محض شاعری نہیں حقیقت ہے۔ تصویر کے خدوخال اقبالؔ کے بنیادی تصوّرِ خودی کے ترجمان ہیں۔

فنی چابک دستی نے رنگوں اور خطوں سے عزم اور اعتماد حاصل کیا ہے۔ یُوں تو یہ تصویر یک رنگی نظر آتی ہے لیکن رنگوں کی حلاوت اور جدت نے وسعتِ معنی کو بلند سے بلند تر کر دیا ہے۔ تصویر کا ہر ذرہ جُزوِ زندگی نظر آ رہا ہے۔ فضا میں بسی ہوئی حیات پرور بصیرت اور پس منظر میں پرواز کا تصوّر نگاہ کے ساتھ ساتھ گھُومتا ہے اور تصویر کا ذرّہ ذرّہ رُوح کی بالیدگی کا سامان بن جاتا ہے۔ ہم اپنے آپ کو فضا سے ہم آہنگ پاتے ہیں۔ اور پرواز میں کوتاہی، احساسِ کمتری اور زندگی کی کسی کمزوری کا احساس تک نہیں ہوتا۔ اس کامیاب تصویر کا ماحول اور تاثر کسی شکستہ ساز کی آواز کو بھی پاس پھٹکنے نہیں دیتا۔

چغتائی کا بُرش نرم گداز اور شیریں ہے۔ اس میں ضربِ کلیمی کے وہ اعلیٰ جوہر بھی ہیں جو تیشہ کی آزاد روی کے ہر سانس میں سُنائی دیتے ہیں۔ چغتائی کا فن نئی زندگی سے اس کی قدروں سے، آج کے انسان کے تقاضوں سے بہرہ ور اور ہم آہنگ ہے۔ اُس نے اکثر ایسی تصویریں بنائی ہیں جن میں کسی نہ کسی زاویے سے جدت ہے۔ اس کا انداز نیا اور طرزِ نگارش منفرد ہے۔ مواد اور ہیئت کا یہ عالم ہے کہ ہر تصویر دُوسری سے مختلف ہے اور فن کے ایک نئے اسلوب کی نشاندہی کرتی ہے۔ یہ تصویر ماضی کے رشتے میں بھی منسلک ہے اور ان تقاضوں سے بھی عہدہ برآ ہوتی ہے جو آج کے انسان کے حصّے میں آتے ہیں۔ ان کا نصب العین خون کو گرماتا اور قلب کو اطمینان بخشتا ہے، جس سے ماضی کا رشتہ استوار ہوتا ہے۔ جس سے قوتِ عمل کُند نہیں ہوتی۔ اور ہم اپنی نئی زندگی کے لئے حرارت اور اپنے آپ کو زندہ تابندہ رکھنے کا حق حاصل کرتے ہیں۔ چغتائی کی یہ

ایک ایسی تخلیق ہے جسے دیکھ کر نگاہیں ہیجان بھرے عالم میں س ماضی کو دیکھنے لگتی ہیں، اس مقام کے مطالعہ میں کھو جاتی ہیں جب علماؔ نے فن کو کفر اور حرام کہہ کر مذہب سے خارج کر دیا تھا۔

عقل اور عشق کے تقاضے یُونہی رہیں گے۔ مگر یہ انسان جو فطرت کا رازدار ہے اپنے ذہنِ رسا سے زندگی کے تقاضوں کا جواز پیش کرتا رہیگا اور فن کے مسلک کو انسانی رہبری کے کام لاتا رہے گا۔ یہ آرٹسٹ کے وسیع مشاہدہ کا حصہ ہے یہ اس کی لگن ہے جس میں اقبالؔ کا نظریہ کارفرما ہے اور اس کی تخلیق میں اقبالؔ کی خودی اسکی ہم نوا ہے ؎

نہیں تیرا نشیمن قصرِ سُلطانی کے گنبد پر
تُو شاہیں ہے بسیرا کر پہاڑوں کی چٹانوں میں

غبارِ گشتہ آسودہ نتواں زیستن اینجا
بہ بادِ صبح دم درپیچ و منشیں بر سرِ راہے

ز جُوئے کہکشاں بگذر ز نیلِ آسماں بگذر
ز منزل دِل بمیرد گرچہ باشد منزلِ ماہے

گُذر اوقات کر لیتا ہے یہ کوہ و بیاباں میں
کہ شاہیں کیلئے ذِلّت ہے کارِ آشیاں بندی

اُس قوم کو شمشیر کی حاجت نہیں رہتی
ہو جس کے جوانوں کی خودی صُورتِ فولاد

ناچیز جہانِ مہ و پرویں ترے آگے
وُہ عالمِ مجبُور ہے تو عالمِ آزاد

شاہیں کبھی پرواز سے تھک کر نہیں گرتا
پُردَم اگر تُو تو نہیں خطرۂ اُفتاد!

WITH THE FALCON

Chughtai's idealism is the basis of his philosophic approach and search for the perfection. He is the most imaginative and experimental artist. As a thinker, he insists on the accuracy in his choice of subjects. The old graceful man who is in search of a new spirit haunts his mind. Chughtai likes to stress the human Ego, painting and colour. The old man with a Falcon, is a positive objective, he sets out to achieve -a new interpretation of the self.

"FALCON THOU ART, AND HAST MADE
THY NEST IN THE GRASSY GLADE.
AND ITS AIR, I AM FEARFUL, MIGHT
FORESHORTEN THY PIONIONS' FLIGHT.
"ART THOU DUST BECOME? IT IS CLEAR
THOU CANST NOT BE RESTING HERE;
ON THE BREEZE OF THE MORNING RIDE,
SIT NOT BY THE ROAD-WAY SIDE.

IQBAL

صُورت سیرت

موتی سمجھ کے شانِ کریمی نے چُن لئے
قطرے جو تھے مرے عرقِ انفعال کے

اقبال
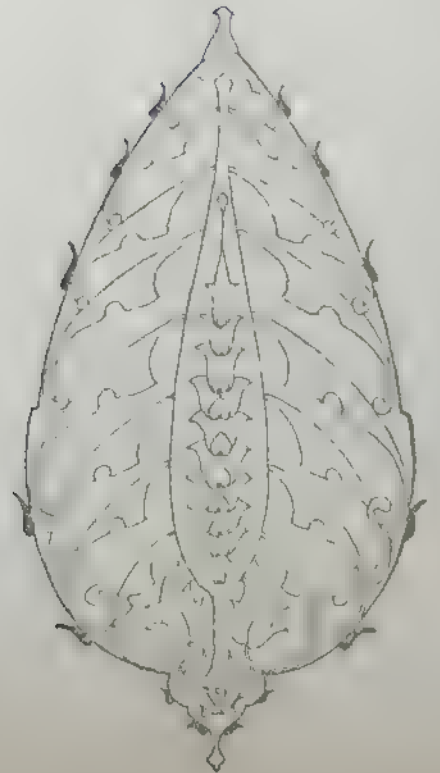
صورت سیرت

ہمارے معاشرے میں عورت کی سیرت اس کی صُورت سے کہیں زیادہ اہمیت رکھتی ہے۔ صنفِ نازک لباس کی تراش اور زیبائش سے کہیں زیادہ اپنی سیرت کے حُسن سے حسین ہے۔ اور یہی ایک وجہ ہے کہ وہ محبوبہ سے گزر کر ماں کا درجہ حاصل کر لیتی ہے۔ چغتائی صُورتوں کے رُوپ میں سیرتوں کو مصوّر کرنا فنی کمال سمجھتا ہے۔ اگر وُہ عہد و پیمان کی تصویر بنائے گا تو اس کا تعلق اس سیرت سے ہوگا جو اپنے محبوب کی ہم نوا ہے۔ اس کی صُورت و سیرت کا مقصد عہد پہ پُورا اُترنا ہے۔ وُہ جمالیاتی حُسن کی آئینہ دار ہے۔ اسے ان واقعات اور صُورتوں سے بے نیاز رہنا ہے جو عارضی اور بے ثبات ہیں۔ وہ کارزارِ حیات میں مرد کے دوش بدوش اس کی بلندی اور پستی میں اسکی شریک ہے۔

چغتائی کی تصویر صُورت و سیرت اس کی تصویروں میں ایک انفرادی درجہ رکھتی ہے۔ تصویر میں حقیقت نگاری اور خلاقیات کا عنصر اس درجہ اُبھر آیا ہے کہ آرٹسٹ کا یہ کہنا وزنی اور لطیف معلوم ہونے لگتا ہے کہ کائنات کا سارا حُسن عورت کی خوبصُورتی سے ہے۔ جس میں اس کی سیرت راہ دکھاتی ہے اور صورت سے زندگی مچلتی ہے۔ تصویر کی سنجیدگی اور رنگوں کے امتزاج سے پُوری خلاقی ہم آہنگی پیدا ہوگئی ہے۔ وہ ہر پہلو سے اتنی دلکش مقدس و متوازن ہے کہ ہر بات سے اس کی روشن ضمیری کا یقین ہوتا ہے اور یہ یقین اس حد کو پہنچ جاتا ہے کہ اس کی پاکیزگی دانش و رنہ اور اس کا تقدس رضائے الٰہی کی عین منشا کے مطابق معلوم ہوتا ہے۔ اسی کے وجود سے کائنات کی مسّرت و خوشحالی تعبیر ہے۔ اس کا رشتہ ان لافانی صلاحیتوں سے ہے جو بلند کردار کا سرچشمہ ہیں۔ نہ وہ جذباتی ہے نہ رومانی۔ افکار کے وُہ پہلو جو آرٹسٹ نے اپنے مُوقلم سے روشن اور اُجاگر کئے ہیں، بڑی عظمت اور کامیابی سے اپنی جامعیت کا تقاضا کرتے ہیں۔

چغتائی کے ہاں صُورت و سیرت کے مختلف جلوے اور مختلف پہلو ہیں۔ اس نے اگر استغراق میں جھکی ہوئی صُورتیں بنائی ہیں تو اُس نے برہنہ صُورتیں بھی رنگوں و خطوں سے بکھیری ہیں۔ اس نے اپنی بنائی ہوئی برہنہ تصویروں کی فسُوں کاری کو وہ درجہ بخشا ہے کہ ان کے دیکھنے سے ننگ کا احساس تک نہیں ہوتا۔ عورت کے ستر اور ننگ کا سوال اس وقت تک اہمیت حاصل کرتا رہے گا۔ جب تک اس کا سوز و ساز حُسن کی پاکیزگی اس سے چھن نہیں جاتی۔ مغرب کے بڑے بڑے عظیم فن کاروں نے عریاں تصویریں بنانے پر طبع آزمائی کی ہے مگر انھوں نے پاکیزگی اور عورت کے ستر میں سوز و ساز کے رنگ ڈھنگ کو اپنی چابکدستی سے محفوظ رکھا ہے۔ تصویر صُورت کی ہو یا سیرت کی، یا برہنہ جسم کی، اس کی بے ساختگی کے سُلجھاؤ اور حیاداری کی رمز شناسی کو بروئے کار لانے کے لئے خود کو اس سے کہیں سنجیدہ اور پُرسیرت بننا پڑتا ہے کہ کوئی پیکر جمالیاتی حُسن سے محروم نہ رہ جائے۔

جب چغتائی یورپ کی آرٹ گیلریوں اور درسگاہوں کا مطالعہ کر رہا تھا اُس نے مغرب کے آرٹ کے بدلتے ہوئے رُخ دیکھے تھے اور اس بات کے اسباب بھی تلاش کئے تھے کہ یہ ردِّعمل ان پر کیوں مسلط ہے۔ اس پہ مطالعہ کا رنگ تو ضرور چڑھا۔ مگر وُہ ان اثرات سے زنگ آلود نہیں ہُوا کہ وہ ان مُوشگافیوں کا شکار ہو جاتا جو مغرب کے لئے خود بھی کوئی مستقل نہیں رکھتیں۔ پھر وُہ معاشرے کی ضرورتوں کے زیرِ اثر مشرق کی رواداری اور حیاداری کو بھی نظر انداز نہ کرسکا۔ جس کی تیز روی میں یورپ خود سے بھی روشناس نظر نہیں آتا۔ پھر بھی جو مواد اُسے ہاتھ آیا اُس نے وُہ بھیانک صُورت اختیار نہیں کی کہ اس کا اپنا ارتقار رُک جاتا اور وہ خشک کا خشک واپس آتا۔ **چغتائی** نے فکر اور سنجیدگی میں جمالیاتی حُسن کا ہمیشہ ایک نیا رُخ پیش کیا ہے اور حسن کاری میں اپنی پختگی کا اظہار بڑے والہانہ انداز میں کیا ہے۔ کہ مضمون آفرینی میں شادابی اور سرمستی کا تسلسل ٹوٹنے نہ پائے۔ اس تصویر میں اس کی تکنیک ور فن بڑے عروج پر ہے۔ یہ مٹی کا کھلونا نہیں، صورت و سیرت کا بھرا ہُوا ساغرِ جام ہے۔ یہ قوتِ تخیلہ کی کرشمہ سازیاں ہیں۔ یہ طائرانِ حرم ہیں۔ یہ تخلیق کا وُہ جوہر ہے جس کی زبان، گفتار اور لباس ہر چیز دائمی اور ابدی ہے ؎

یہ حکمتِ ملکُوتی، یہ عالمِ لاہُوتی،
حرم کے درد کا درماں نہیں تو کچھ بھی نہیں

کبھی اَے حقیقتِ منتظر نظر آ لباسِ مجاز میں
کہ ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں مری جبینِ نیاز میں

جلوۂ حُسن کہ ہے جس سے تمنا بے تاب
پالتا ہے جسے آغوشِ تخیّل میں شباب

آہ موجود بھی وُہ حُسن کہیں ہے کہ نہیں
خاتمِ دہر میں یارب وُہ نگیں ہے کہ نہیں

MODESTY

Modesty is the spirit of lustrous youth and characteristic of a pious woman. We feel its fragrance in the pictures of Chughtai, who has achieved his place among the great artists of the world. The colour scheme of the subject is remarkable and expressive, painted in brilliantly pure varied hues. Decorative enrichments of the background with brilliant yellow colour, increased the charm of the figure.

"FROM STARS HE TOOK THEIR BRIGHTNESS; FROM THE MOON
THE MARKS OF BURNT-OUT PASSIONS OF THE PAST;
AND FROM NIGHT'S FLOATING AND DISHEVELLED TRESSES A LITTLE DARKNESS;
FROM THE LIGHTNING HE RECEIVED ITS RESTLESSNESS;
AND PURITY FROM HOURIES:.

IQBAL

اورنگ زیب

شاہِ عالم گیر گردُون آستان
اعتبارِ دودمانِ گورگان

اقبال

اورنگ زیب

یقینِ محکم اور عملِ پیہم انسانی زندگی کے اعلےٰ ترین اوصاف کا مرقع ہیں۔ یہ تصویر ایک ایسے فوق البشر بادشاہ کا تصور ہے جس کا عمل پیہم اور یقین محکم قابلِ رشک تھا۔ وہ عزم کا پکا گفتار اور کردار میں اللہ کی شمشیر تھا۔ وہ ایک ایسا تاجدار تھا جس کے زمانے میں بڑے بڑے انقلاب رُونما ہوئے۔ مگر اس کی عملی اور اخلاقی قوتیں برسرِ پیکار رہیں۔ وُہ انفرادی قدر و قیمت کی اہمیت کو سمجھتا تھا۔ اس کے نزدیک برکتوں کا بڑا درجہ تھا۔ وُہ یہ بھی جانتا تھا کہ عمل کے بغیر ایمان کی صفات محدود ہو جاتی ہیں۔ اور اعلیٰ صفات مسلسل جدّوجہد ہی سے حاصل ہوتی ہیں۔ جب تک سخت کوشی، نکار کی ندرت، کردار کی شخصیت میں نمُودار نہ ہو کردار نہیں بنتا۔ خواہ وہ قلندر کا ہو یا بادشاہ کا۔

چغتائی ایک ہُنرمند کی حیثیت سے فقیر اور بادشاہ سے ایک سا خلوص برتتا ہے۔ اور مزدور اور کسان سے بھی محبت اور عقیدت سے مغل اور ایرانی مصوروں نے اپنے معاشرے کی ضرورتوں کے مدِنظر دربار اور بادشاہوں کی تصویریں بنانے میں اپنے پورے خلوص سے کام لیا اور یہ حق واقعی اُنہیں پہنچتا تھا کہ معاشرے کی ضرورتوں اور نظریۂ فن کو برتری دیتے۔ چغتائی اپنی جگہ آج کے تقاضوں کے مدِنظر بہت مُختلف واقع ہوا ہے۔ وہ اندھا دھند تقلید کو سوداوی بیماری سمجھتا ہے۔ اور یہ بھی خیال کرتا ہے کہ نقالی اور تقلید سے قوم کی قوم نادار اور ان اوصاف سے محروم رہ جائیگی جو روشن ضمیری کا حصہ ہیں ضمیر بھی کند ہو جائے، تو تہذیب و تمدن اپاہج ہو جاتے ہیں۔ معاشرے کے چمن میں کوئی پھل پھول بارآور نہیں ہوتا۔ زندگی مسرتوں سے بے سواد ہو جاتی ہے اور کوئی کروٹ نہیں لیتی۔

یہ تصویر ایک ایسے بادشاہ کے کردار کا تصور ہے جس کی انفرادیت مسلّمہ اور خودداری بے مثل تھی۔ اس کی ہر صفت اسے، اس کے اپنے کردار سے حاصل تھی۔ اس نے محض حالات و روایات سے ہی بغاوت نہیں کی تھی بلکہ اُس نے اپنے ورثے سے بھی بغاوت کی تھی تاکہ زندہ رہنے کی راہیں اور کشادہ ہو جائیں۔ چغتائی کے سامنے عالمگیر بادشاہ کے یہ سب وصاف تھے۔ اور وہ انکو تصویر کی جُزبندی اور ترتیب میں لانا چاہتا تھا۔ یہ اوصاف اس کی بادشاہت سے بھی زیادہ اہم اور بلند تھے آرٹسٹ نے اپنے تصوّر اور تخیل کی پرواز سے محض رنگوں اور تکنیک کا ہی استعمال نہیں کیا بلکہ اس نے اس مسلک کو بھی پیشِ نظر رکھا ہے جو اورنگ زیب کے اعلےٰ کردار سے واضح تھا اور جس کی بنا پر اقبال نے اُسے چُنا ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ اورنگزیب کی غیر معمولی صفات کی عالمگیری کے زیرِ اثر اُس کی عالمگیری اور قلندری ایک دوسرے میں مدغم ہو جائیں۔ تاکہ اس کا کردار زندہ و تابندہ رہے۔

شبیہ نگاری کی حیثیت سے مغل بادشاہوں کی تصویریں کہاں تک ان کے کرداروں پر پوری اُترتی ہیں، یہ فن اور تکنیک کا حصّہ ہے۔ چغتائی کی یہ تخلیق ایک ایسے مغل بادشاہ کی شبیہ ہے جس نے اپنی غیر معمولی ذہانت اور شخصیت سے حکمران اور وارث ہونے کا ثبوت بہم پہنچایا تھا۔ تصویر کے خدوخال اور استخوان بندی سے کردار کا جلال و جمال، ندرت اور بصیرت اس کے انگ انگ سے روشن ہے۔ فضا کی ضیا پاشیاں اور پس منظر کی گہرائیاں ہر قدم پر دامن پکڑ کر تصویر کی کسی نہ کسی خوبی کی طرف رُخ پھیر دیتی ہیں اور ایسی دُنیا بیدار نظر آتی ہے جس سے عالمگیر بادشاہ کی غیر معمولی شخصیت اور غیر معمولی کردار اور زیادہ اُبھر آتا ہے۔ نگاہ فنی صلاحیتوں سے سیر نہیں ہوتی اور حشمت و جاہ کردار کے سامنے ماند پڑ جاتے ہیں چغتائی کو مغل تہذیب سے گہرا لگاؤ ہے۔ اور یہ رشتہ اُن روایات سے بھی جا ملتا ہے جن کو اجاگر کرنے کا اُس نے بیڑا اُٹھایا ہے۔

سلطنتِ مُغلیہ کے عروج اور پرشکوہ تصوّر کو اور اُن کی بلند نگاہی کو چغتائی نے ہر بار اپنے فنی اسلوب سے پورا کرنے کی کوشش کی ہے۔ تاکہ معاشرہ اس تہذیب و تمدن سے بیگانہ محسوس ہو اور ذوقِ نمود اور خود نمائی کا جذبہ اقبالؔ کی آرزوؤں کے مُطابق پرورش پاتا رہے۔ چغتائی نے اِس تصویر میں بڑے استدلال و وضاحت سے مواد اور ہیئت کو ایسی فنّی خوبصورتی سے پیش کیا ہے کہ آرٹسٹ کا تخیّل اسکے کردار کے رنگ اور نقش کو اُبھارتا رہے گا۔

حق گزید از ہند عالمگیر را
آن فقیہِ صاحبِ شمشیر را

برقِ تیغش خرمنِ الحاد سوخت
شمعِ دین در محفلِ ما بر فروخت

شعلۂ توحید را پروانہ بُود
چوں براہیمؑ اندرین بُت خانہ بُود

در صفِ شاہنشہان یکتاستے   فقرِ اُو از تربتش پیداستے

EMPEROR AURANGZEB

Chughtai, while portraying historictl subjects has acquired a great knowledge of man-kind.

In the relaxed sitting of the Emperor Aurangzeb, there is a sympathetic understanding of the greatness of the Mughals.

The Emperor was a man of action and a man of dynamic thought.
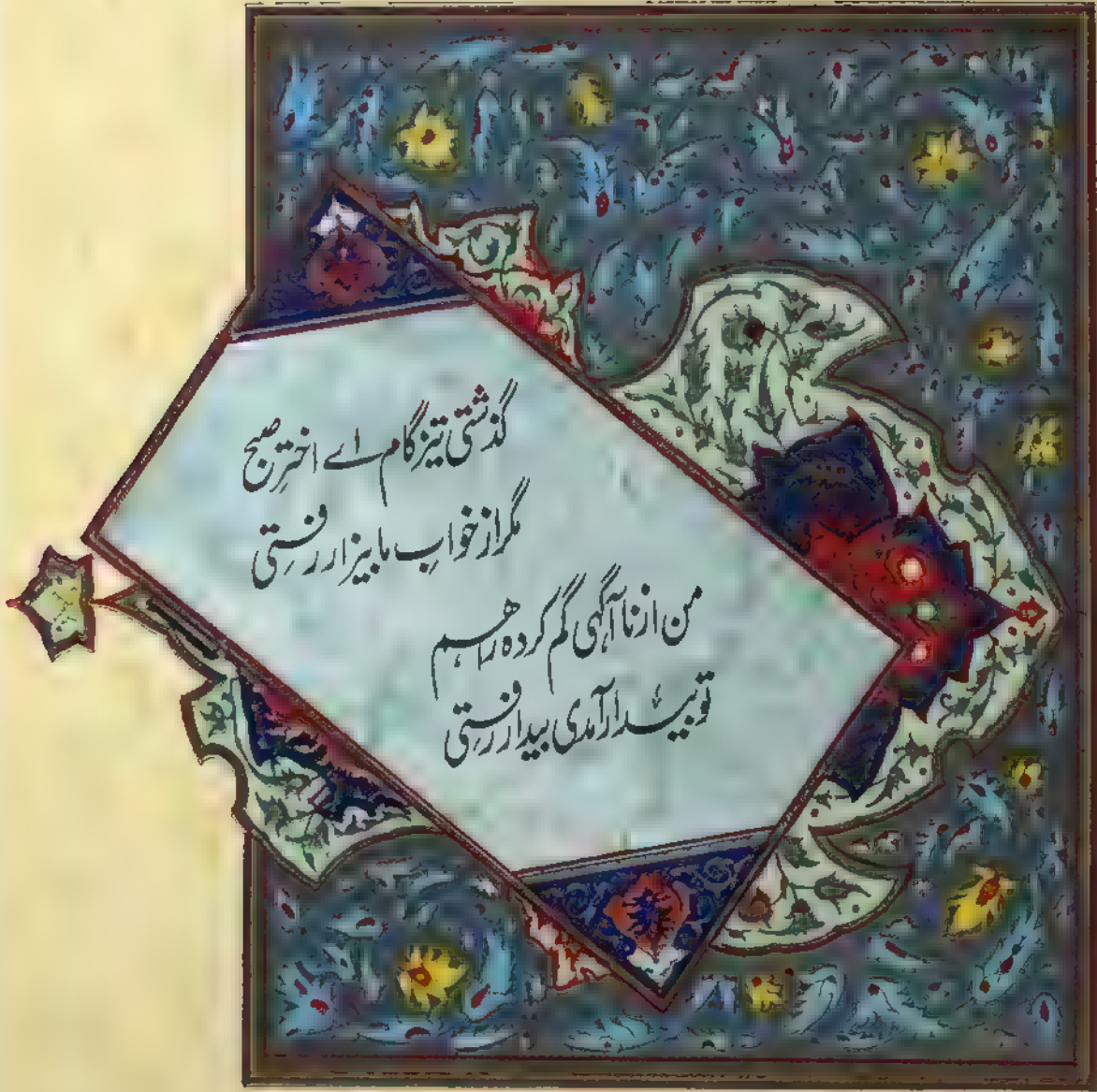
ACCORDING TO THE QURAN ;-
(1) THAT MAN IS THE CHOSEN OF GOD ;
(2) THAT MAN, WITH ALL HIS FAULTS, IS MEANT TO BE THE REPRESENTATIVE OF GOD ON EARTH ;
(3) THAT MAN IS THE TRUSTEE OF A FREE PERSONALITY WHICH HE ACCEPTED AT HIS PERIL."

QURAN

"IT IS THE DEED THAT PREPARES THE EGO FOR DISSOLUTION, OR DISCIPLINES HIM FOR FUTURE CAREER. THE PRINCIPLE OF THE EGO SUSTAINING DEED IS RESPECT FOR THE EGO IN MYSELF AS WELL AS IN THE OTHERS. PERSONAL IMMORTALITY, THEN IS NOT OURS AS OF RIGHT ; IT IS TO BE ACIEVED BY PERSONAL EFFORT, MAN IS ONLY A CANIDATE FOR IT."

IQBAL

گذشتی تیز گام اے اخترِ صبح
مگر از خوابِ ما بیزار رفتی
من از نا آگہی گم کردہ راہم
تو بیدار آمدی بیدار رفتی

بابر اور ہمایوں

نہ بہ ماست زندگانی ۔ نہ زماست زندگانی
ہمہ جاست زندگانی ۔ زکجاست زندگانی

اقبال
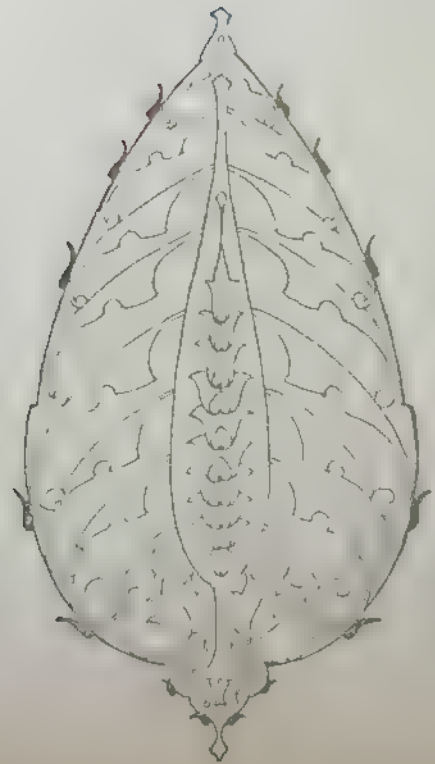
بابر اور ہمایوں

مجھے ٹھیک یاد نہیں پھر بھی ملکہ نور جہاں کی وہ تصویر یاد ہے جس میں ملکہ شہنشاہ جہانگیر کے مقبرہ پر بیٹھی قرآن پاک کی تلاوت میں محو تھی۔ اُس نے سفید لباس پہن رکھا تھا۔ یہ میری پہلی تصویر تھی، جسے میں نے بہتوں کے کہنے پر بہتوں کو دکھایا۔ کسی نے کہا "ملکہ کا سفید لباس ایک تاریخی حیثیت رکھتا ہے۔ وہ جہانگیر کے بعد گیارہ سال تک زندہ رہی۔ مگر اس عرصہ میں کبھی رنگین لباس نہیں پہنا۔" کسی نے کہا: "یہ واقعہ ہے کہ اس نے زندگی کا بقایا حصہ قرآن پاک کی تلاوت میں گذارا۔" کوئی بولا: "یہ دونوں محبوب آج بھی ایک دوسرے کے قریب ہیں۔" میں اپنے موروثی مکان کے تھڑے پر بیٹھا، تنگ و تاریک گلی میں خود بھی تصویر کو دیکھ رہا تھا۔ جو گذرتا دیکھتا۔ کچھ نہ کچھ ضرور کہتا تھا۔ ایک شخص نے بڑی یاس سے آہ بھر کر کہا "میرے پاس کچھ ہوتا تو یہ تصویریں خرید کر لیتا۔ وہ تصویر میں نے اُسے دے دی۔ پھر کیا ہوا۔ وہ دن اور آج کا دن ثقافتی قدروں نے اور میری مشرقیت نے میرا پیچھا نہیں چھوڑا۔ اور میں نے دانشور بوڑھوں، من چلے نوجوانوں، ہنگامہ پرور بچوں، مجاہدوں، شاعروں اور مزدوروں تک کو فکر کے اس خم میں ڈبو دیا۔ جس میں حیات اور زندگی کے جوہر موجود تھے اور جس کی صلاحیتوں اور لافانی کرداروں کی یقین دہانی اقبالؒ نے کی ہے۔" اس کے بعد چغتائی نے بیان کیا۔

علّامہ اقبال کی اس آرزو کو بروئے کار لانے کے لئے تہذیبِ مشرق کے دانشوروں اور مفکروں کی ٹوہ میں لگ گیا۔ میرے نزدیک انسان شناسی مشترک ہے، وہی ایک وحدت ہے جس سے تنزل کا احساس دلایا جا سکتا ہے۔ شہنشاہ بابر اور ہمایوں کے کردار کے انتخاب میں ایک مشترکہ یک نیتی اور اجتماعی زندگی کا نصب العین موجود تھا۔ بابر کے سامنے وحدت اور نظم و نسق سے جینا تھا۔ تصویر میں بابر اپنے وارث ہمایوں سے مخاطب ہے۔ ایسے ہی جیسے دو دوست ایسی شاہراہ پر کھڑے ہوں جس کی وسعتیں لامحدود ہیں۔ اس تصویر کو دیکھ کر ایک مبصر نے چغتائی سے کہا "کیا ہی اچھا ہوتا کہ اس تصویر کا موضوع اکبر اعظم اور جہانگیر ہوتا۔" آرٹسٹ نے بڑے اعتماد سے جواب دیا "کہاں جہانگیر اور کہاں ہمایوں! ہمایوں نے اپنے حسنِ تدبر اور یقینِ محکم سے تقدیر کو بدل ڈالا تھا۔ اُس نے اپنی مسلسل جدوجہد سے کھویا ہوا وقار حاصل کر لیا تھا۔ یہ ایسی آزمائشوں سے گذرنے کا نتیجہ ہے کہ اس کے وارثوں نے صدیوں ہندوستان پر حکومت کی اور اسے تہذیب و تمدن کا گہوارہ بنا دیا۔

ایک شاہین دوسرا شاہین زادہ۔ یہ اُن بلند اقبال لوگوں کا مرقع ہے جنھوں نے نئے انسان، نئے ہندوستان اور نئے جہان کی تخلیق کی تھی۔ بابر فاتحانہ انداز میں بلند ہمتی اور ثابت قدمی سے تنا کھڑا ہے۔ اور شہزادہ ہمایوں پورے انہماک اور پورے احترام سے باپ کے ارشادات کو سُن رہا ہے، جو ہر مصیبت اور کشمکش کے موقع پر اس کے کام آئے۔ بابر، تیمور کا

دھنی، لامتناہی مجاہدانہ حدود کا تصور لیئے ہوئے سرچشمۂ ہدایت بن گیا ہے۔ اور ہمایوں ضمیر کی آواز پر کان لگائے تابع عمل و حکمت نظر آرہا ہے۔ شہنشاہ باپ کی سرگوشیاں قدم قدم پر اُس کی رضا بنیں۔ کام آئیں اور وُہ ثابت قدم رہا۔ وُہ بصارت و بصیرت اُسکے کام آئی جسے بابر نے اپنا نصب العین بنایا تھا۔ اور جس سے فرد اور جماعت کے رشتے کو استحکام بخشا تھا۔

ہمایوں کے شاہین اور بابر کے ساغر پر تبصرہ کیا جائے تو زندگی کے وُہ تمام مراحل جن سے باپ بیٹا دونوں گزرے، اٹل پہاڑوں کی طرح نگاہوں کے سامنے آجاتے ہیں۔ اقبال نے کئی مقامات پر نوجوانوں کو بخصوصیت سے اپنے بیانوں کو نصیحت کی ہے کہ وُہ اُن ذمہ داریوں کا پُورا پُورا احساس کرے جو اُسے زندگی کی ہر منزل پر پیش آنے والی ہیں۔ اُس نے اپنے جذبات کو مختلف ولولوں میں پیش کیا ہے۔ مختلف نظریوں سے اس کا اظہار کیا ہے۔ چغتائی نے اقبال کے جذبات کی ترجمانی کی ہے۔ اقبال کے مطمح نظر کی وضاحت کی ہے تاکہ قومیں برسرِ عمل رہیں ؎

جب تک نہ زندگی کے حقائق پہ ہو نظر — تیرا زجاج ہو نہ سکے گا حریفِ سنگ
یہ زورِ دستِ ضربتِ کاری کا ہے مقام — میدانِ جنگ میں نہ طلب کر نوائے چنگ
خونِ دل و جگر سے ہے سرمایۂ حیات — فطرت لہو ترنگ ہے غافل نہ جل ترنگ

احوالِ محبت میں کچھ فرق نہیں ایسا
سوز و تب و تاب اوّل سوز و تب و تاب آخر
مَیں تجھکو بتاتا ہوں تقدیرِ اُمم کیا ہے
شمشیر و سناں اوّل طاؤس و رباب آخر

قناعت نہ کر عالمِ رنگ و بُو پر
چمن اَور بھی آشیاں اَور بھی ہیں
اِسی روز و شب میں اُلجھ کر نہ رہ جا
کہ تیرے زمان و مکاں اَور بھی ہیں

BABUR AND HUMAYUN

In this picture, Chughtai discovers a subject in a new form of design. The subject majestically controls history and its cultural background. The work is executed with the desire to live and let live. Thus the essence of Chughtai's art is a part of humanity. He points specific persons as symbols of idealised humanity.

"AS THE FIRST GLEAM OF DAYBREAK, AND A VOICE WAS HEARD;
I AM THE SPIRIT OF TIMUR!
CHAINS MAY HOLD FAST THE MEN OF TARTARY,
BUT GOD'S FIRM PURPOSES NO BOUNDS ENDURE;
IS THIS WHAT LIFE HOLDS-THAT TURANIA'S PEOPLES
ALL HOPE IN ONE ANOTHER MUST ABJURE?
CALL IN SOUL OF MAN A NEW FIRE TO BIRTH!
CRY A NEW REVOLUTION OVER THE EARTH

IQBAL.

مؤذن

وُہ سحر جس سے لرزتا ہے شبستانِ وُجُود
ہوتی ہے بندۂ مومن کی اذاں سے پیدا
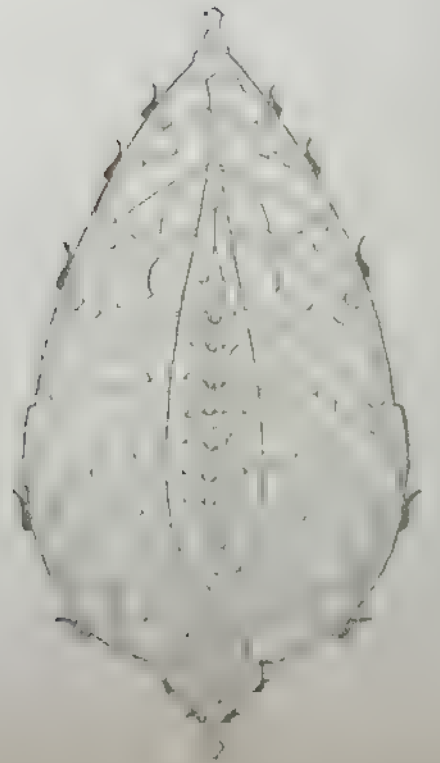
اقبال

مؤذن

علامہ اقبالؒ نے کہا ہے ملّا کی اذاں اَور مجاہد کی اذاں و ر۔ چغتائی کا موذن بھی اسی سرزمین کا نمائندہ ہے۔ اُس کی ذہنی تحریک اور کیفیات کے اندر مختلف جذباتی کنائے کروٹیں لے رہے ہیں۔ جمالی و روحانی عناصر خاص طور پر اس کے چہرے پر کچھ اس طرح نمایاں ہیں کہ مؤذن کا سراپا رحمتوں کے سایہ میں کھڑا رحمت حق کا طلبگار ہے۔ و ر وہ الفاظ جو اس نے دُہرائے اور وُہ بلند آہنگ آو ز ابھی تک فضا میں گونج رہے ہیں۔ اس نے ایک عالمگیر جذبے کے تحت اپنی دُنیا کو مخاطب کیا۔ و ر اپنی طرف بلایا کہ اللہ بڑا ہے۔ اللہ بڑا ہے۔ اس کی رحمتیں تمہاری منتظر ہیں۔ آو ز کی لَے اور لفاظ کی بازگشت ازلی فطرت پر اثر ڈ لتی ہے و ر عمل کے ولولے کو تازہ دم رکھتی ہے جو صحرا کی وسعتوں میں کا ر و نوں کو کبھی تھمنے نہیں دیتی اور یہ مسلسل مستعدی نہیں ایک دُوسرے کے دوش بدوش لئے پھرتی ہے ان کے من پر ایک بھرپور رُوحانی تقدس طاری رہتا ہے۔ مؤذن کا رُواں رُو ں پُرتقدس تمنّاؤں کا مخزن ہے۔ زندگی کی ختم نہ ہونے والی مسرّتوں سے ہم آہنگ ہے۔ زمان و مکاں اُس کے سامنے ہیں۔ چغتائی کے کمال نے ہر ذرّے کو اشتیاق ہی اشتیاق بنا دیا ہے۔

دُنیا کے ہر مذہب و ملت میں عبادت کے مختلف طور طریق ہیں۔ ان پر جب نگاہ جاتی ہے تو ہم میں سنجیدگی اور عمل کی تحریک پیدا ہوتی ہے۔ س سے کچھ نہ کچھ متاثر ہونا پڑتا ہے۔ چاہے بُت پرستی کے بے جان مناظر ہی کیوں نہ ہوں۔ اسلام نے عبادات کے شرُوع اور ختم کرنے کا جو طریقہ پنی برکتوں سے ہمیں عطا کیا ہے س میں بے پناہ کیفیات پوشیدہ ہیں۔ ہمارا سامنا اُن روشن عناصر سے ہوتا ہے جو انسانوں پر بشارتوں کی شکل میں نازل ہوتے ہیں۔ یہ انسان کی خلوص نیتی کا ثمرہ ہوتا ہے۔ انسان جھک جاتا ہے اور زندہ ہو جاتا ہے۔

قلب کو گرمانے والی۔ رُوح کو فطری نغموں سے ہمنوا کرنے والی جو صدا پہلی بار صحراؤں میں گونجی اور اس نے رُوحانی سکون کا سامان بہم پہنچایا وہ حضرت بلالؓ کی آو ز تھی۔ یہ بلالؓ کے صدق اور انکے ایمان کا معجزہ ہے کہ آج بھی وہ صدا اور اس کی بازگشت صحراؤں میں، شہروں میں، جُوں کی تُوں سُنائی دیتی ہے۔ جب بھی مؤذن کھڑا ہوتا ہے انھیں الفاظ میں خُدا اور خُدا کی برتری کی تصدیق کرتا ہے۔ چغتائی کا مؤذن یوں دکھائی دیتا ہے جیسے محسوسات میں اس ماورار کو دیکھ رہا ہے جہاں خُدا اور انسان کے درمیان کوئی حد بندی نہیں۔ طرزِ تعمیر اور اس کی جسامت نے اسے وُہ ابدیت بخشی ہے کہ اس کے اس مسلسل فعل نے اس دُنیا اور س دُنیا کی تمیز کو یکجا کر دیا ہے۔ یہ ایک لمحۂ فکریہ ہے۔ یہ ایک اُمید افزا بشارت ہے۔ یہ وہ مترنّم ابدی فعل ہے جس میں زندگی کا سوز و ساز زندگی کی پریشانیوں کے لئے ذریعۂ نجات ہے۔ یہ وُہ معراج ہے جسکی ابتدا اور انتہا ایک ہے۔

اقبال کی شاعری کے ہر پہلو میں ایک ایسی وحدت ہے جو اپنے عالمگیر ہونے کا یقین دلاتی ہے۔ اس کا ہر دار شدت سے بین الاقوامی مسائل کا احساس دلاتا ہے اور دل میں یہ یقین پیدا کرتا ہے کہ یہ کائنات عظمتِ آدم کا ساتھ دیتی رہے گی۔ یہ پرشکوہ منظر، یہ حسین پس منظر جو قلب و جگر کا پیدا کردہ ہے اپنی خودی کے ہم نوا رہے گا۔ چغتائی نے جس خلوص نیت سے اپنے عقیدے کا اظہار کیا ہے وہ اس کی ابدیت کا معاون و مددگار ہے۔

چغتائی کی یہ کوشش اس وحدت اور یکسانیت کا کرشمہ ہے جس میں وُہ پھلا پھُولا ہے۔ موضوع میں کوئی ہیجان کوئی پیچیدگی نہیں تصویر کے مجموعی تاثر میں جمالیاتی حُسن اور رُوحانی رشتے باہم ہم آہنگ ہیں۔ جُوں جُوں ہم تصویر کے مطالعہ میں منہمک ہوتے چلے جاتے ہیں تخلیق کے مقاصد روشن ہوتے چلے جاتے ہیں۔ ایک برقی کشش کشاں کشاں اس کے سمجھنے میں مددگار نظر آتی ہے کہ مؤذن کا سراپا، جس کا مستحکم کردار روزِ آفرینش سے اب تک دُنیا کی کسی آلائش سے مرغوب نظر نہیں آتا۔ رنگوں میں تصورات کی اتھاہ گہرائیاں ہیں۔ زمان و مکان اور عملِ حیات اس تسلسل سے وابستہ ہے کہ اس کے عمل اور قدرت نے جو عمل کی تابع ہے اُسے اپنی اَن گنت نعمتوں سے کبھی محروم نہیں رکھا۔

عجب نہیں کہ خدا تک تری رسائی ہو
تری نگہ سے ہے پوشیدہ آدمی کا مقام
تری نماز میں باقی جلال ہے نہ جمال
تری اذاں میں نہیں ہے مری سحر کا پیام
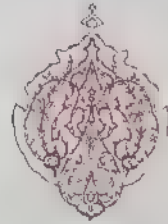
زمن بر صُوفی و مُلا سلامے
کہ پیغامِ خدا گفتند مارا
ولے تاویلِ شان در حیرت انداخت
خُدا و جبرئیلؑ و مصطفےٰ را
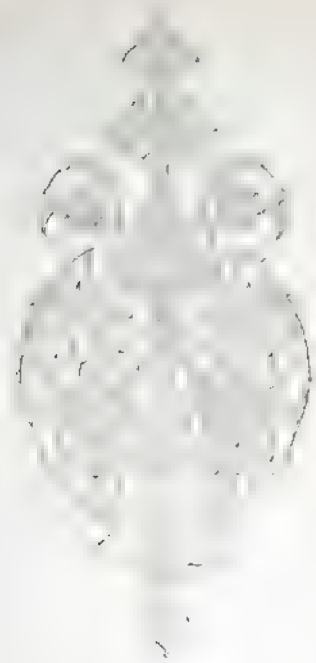
MUEZZIN'S CALL

It is hardly possible to trace the influences that have gone to develop Chughtai's art. He depicts different scenes and pictures by handling the subject in colours and lines. In fact, the combination of his colours and compositions distinguished him as a great artist. The symbol of a Muezzen is not a dream, but an intoxication, or ecstacy. Chughtai depicts this picture expressing the mood of the call of the Muezzen in a vivid and charming manner.

"CLOSE IN THAT DUST A RADIANCE
LIES HIDDEN, IN WHOSE CLEAR LIGHT
SHALL ALL THE SKY'S FIXED TENURES
AND ORBITS FADE FROM SIGHT".
—SUDDENLY ROSE THE PRAYER-CALL,
AND OVERFLOWED HEAVEN'S LAKE;
THAT SUMMONS AT WHICH EVEN
COLD HEARTS OF MOUNTAINS QUAKE.

IQBAL

خنجرِ ہلال
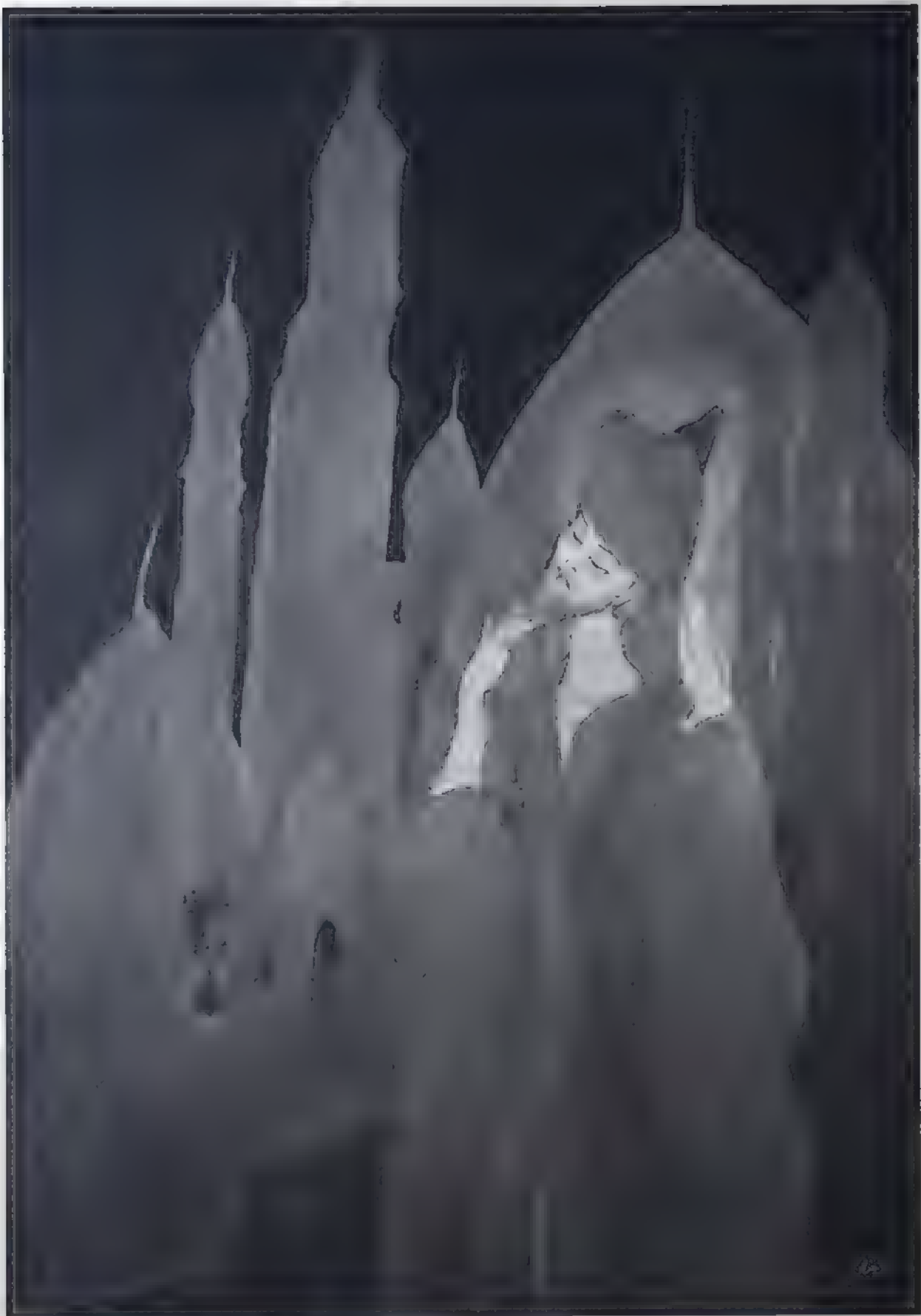
قُلزمِ ہستی سے تُو اُبھرا ہے مانندِ حباب
اِس زیاں خانے میں تیرا امتحاں ہے زندگی

اقبال

خنجرِ ہلال
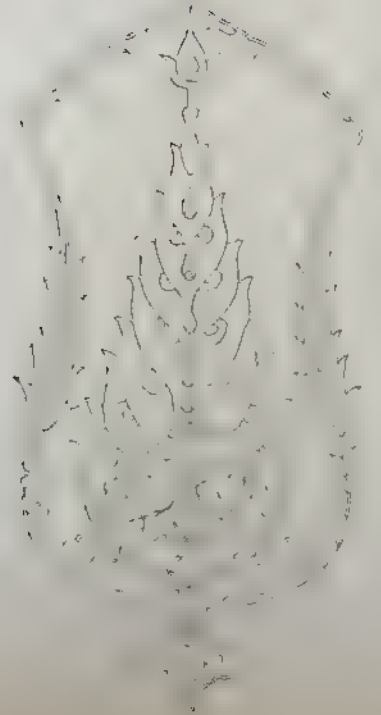
شاعر اور آرٹسٹ اپنے مرکزی تصور سے کتنے ہی قریب ہوں اُنکا نظریۂ فن خواہ ایک ہی ہو مگر یہ ایک فطری تقاضا ہے کہ تکنیک اور اظہار کی رُو سے وہ مختلف راستوں پر گامزن نظر آئیں اور اظہار و ابلاغ کے ایسے مختلف طریق اور راہیں تلاش کریں جن سے اُن کی انفرادیت اور جدت طرازی نمایاں ہو۔ چغتائی کی یہ تصویر اقبالؔ کے اس شعر کی ترجمانی کرتی ہے جس کا تاثر برسوں سے ہمارے دل و دماغ پر چھایا ہوا ہے۔ چغتائی کو اقبالؔ کا ہم عصر ہونے کا فخر حاصل ہے۔ اقبالؔ کے اس لازوال شعر سے اس کا رشتۂ حیات کچھ اس طرح منسلک ہے کہ وہ خنجرِ ہلال کے موروثی تعلق کو ماں اور بچے کی شکل میں دیکھنے پر مجبور ہے۔ خدا جانے شاعر کو کتنے مجاہدوں، غازیوں اور شہیدوں نے متاثر کیا ہوگا جو یہ حیات پرور تصور اور بصیرت افروز جذبہ شعر کے سانچے میں ڈھل سکا۔ اور خودی مجسم ہو کر سامنے آ سکی شمشیر و سناں، طاؤس و رباب اپنے اپنے وقت کے معمار اور اپنے اپنے تقاضوں کے خالق ہیں جن کو جانچنے اور پہچاننے میں کسی غلطی کا ارتکاب بربادی ہے۔

ماں اور بچے کے تاثرات میں وہ ابھی شکل و صورت میں ہیجان خیزی نہیں۔ یہاں جامعیت اور سنجیدگی کے وہ تمام امکانات موجود ہیں جن کو اقبالؔ آنے والی نسلوں میں دیکھنے کا خواہش مند ہے۔ ماؤں کی والہانہ آرزوئیں اور مامتا کے فرائض اس وقت تک زندہ و پائندہ رہیں گے جب تک مائیں اپنے نونہالوں کو کلچر اور تہذیب و تمدن کے دودھ سے سینچتی رہیں گی۔ اور انھیں پروان چڑھانے کے لئے اپنے جسم کا خون پلاتی رہیں گی۔ یہ وہ لمحات ہیں جن میں شخصیتیں نشو و نما پاتی ہیں اور پستی بلندی کا ذوق نظر آتا ہے۔ یقین اور عمل ایمان اور اعتماد پہلو بہ پہلو ماں کے آغوش میں بتدریج بڑھتے اور اپنے مرکز کی طرف پرواز کرتے چلے جاتے ہیں۔

یہ تصویر فنی محاسن اور آرٹسٹ کے فنی انہاک کا نتیجہ ہے جس کی بدولت ماں کا سایہ، ماں کے ہاتھ اور خنجر فتح و نصرت کا پرچم بن گیا ہے۔ یہ روح پرور شاہکار، یہ تصویری پیکر بڑھتے بڑھتے صحرا میں بسنے والی ماؤں کے پہلو بہ پہلو ان بچوں کو بھی دیکھنا چاہتا ہے جن کی پرورش کا حق ایک ہونہار بچے کی شکل میں منفق صورت اختیار کر لیتا ہے۔

بچے کے تاثرات میں مجاہد اور غازی بننے کے امکانات نظر آتے ہیں۔ ماں کی سنجیدگی، احساسات کی پاکیزگی اور خاموش دعائیں تصویر کی روح بن گئی ہیں۔ اور اس ہمہ گیری کی بدولت تصویر اس حقیقت کے قریب آ گئی ہے جہاں آرٹسٹ اور شاعر اپنے معاشرے کی مرکزیت اور اس کی برتری کو عزیز رکھتے ہیں۔ رنگوں اور خطوط سے گزر کر یہ تصویر ہمارے ذہنوں پر حکومت کرتی رہے گی۔ تاکہ یہ بچہ اپنی ماں کے سایہ میں، اپنی ذمہ داریوں کے احساس کے ساتھ اپنے مستقبل کی دیکھ بھال کر سکے۔

چغتائی کی ان تصویروں سے ایک ایسا کیف ابھرتا اور دلوں میں گھر کرتا ہوا محسوس ہوتا ہے جو اسے علامہ اقبال کا ہم نوا بنا دیتا ہے۔ دراصل یہ سب کچھ اس کے اسلوبِ فن، تکنیک اور اس خودشناسی کی بدولت حاصل ہے جس سے فن کار اور شاعر کے نظریۂ فکر میں ہم آہنگی پیدا ہوتی ہے۔ ماتا جاگ اٹھتی ہے اور خون گرمانے لگتا ہے۔ اس کا ذوقِ صورت گری در خدوخال کی بخشش ان ہنگاموں کا سنگم ہے جہاں اسرارِ حیات، دوامِ زندگی اور اوصافِ خداوندی ایک دوسرے کے ہم عناں اور ہم سفر ہوتے ہیں۔ جذبات اور احساسات کی ہم آہنگی ان نغموں سے پھوٹتی ہے جن سے قوموں کی نشوونما، ان کا مستقبل اور ان کے حقوق ان کے اپنے اختیار کی چیزیں بن جاتے ہیں ؎

تیغوں کے سائے میں ہم پل کر جواں ہوئے ہیں
خنجر ہلال کا ہے قومی نشاں ہمارا

خام ہے جب تک تو ہے مٹی کا اِک انبار تُو
پختہ ہو جائے تو ہے اک شجرِ بے زنہار تُو

قُلزمِ ہستی میں تُو اُبھرا ہے مانندِ حباب
اِس زیاں خانے میں تیرا امتحاں ہے زندگی

اے پسر! ذوقِ نگاہ از من بگیر — سوختن در لا اِلٰہ از من بگیر
لا اِلٰہ گوئی! بگو از روئے جان — تا ز اندامِ تو آید بوئے جان
مہر و مہ گردد ز سوزِ لا اِلٰہ — دیدہ ام این سوز را در کوہ و کہ!
این دو حرفِ لا اِلٰہ گفتار نیست — لا اِلٰہ جز تیغِ بے زنہار نیست
زیستن با سوزِ او قہاری است
لا اِلٰہ ضرب است و ضربِ کاری است!

THE NATIONAL EMBLEM

This picture depicts the verse of Iqbal with a symbol of National Emblem. In subjective treatment it is vigorous and expressive of the theme. The majestic figure Madonna of the Harem, represents (cultural spirit) in the true sense. The subject-matter and its composition have been treated artistically and with mastery. Chughtai paints this picture beautifully by employing a fusion of romanticism and classicism. His art imparts universal appeal and message to mankind.

"THE HISTORY OF THE ISLAMIC PEOPLE PROVES THE HIDDON TRUTH-
THOU ART THE GUARDIAN OF THE NATIONS OF ASIA SO VAST.
LEARN AGAIN THE LESSON OF TRUTH, JUSTICE AND CHIVALRY!
THOU WILT BE REQUIRED PERFORCE TO GUIDE THE WORLD.

IQBAL
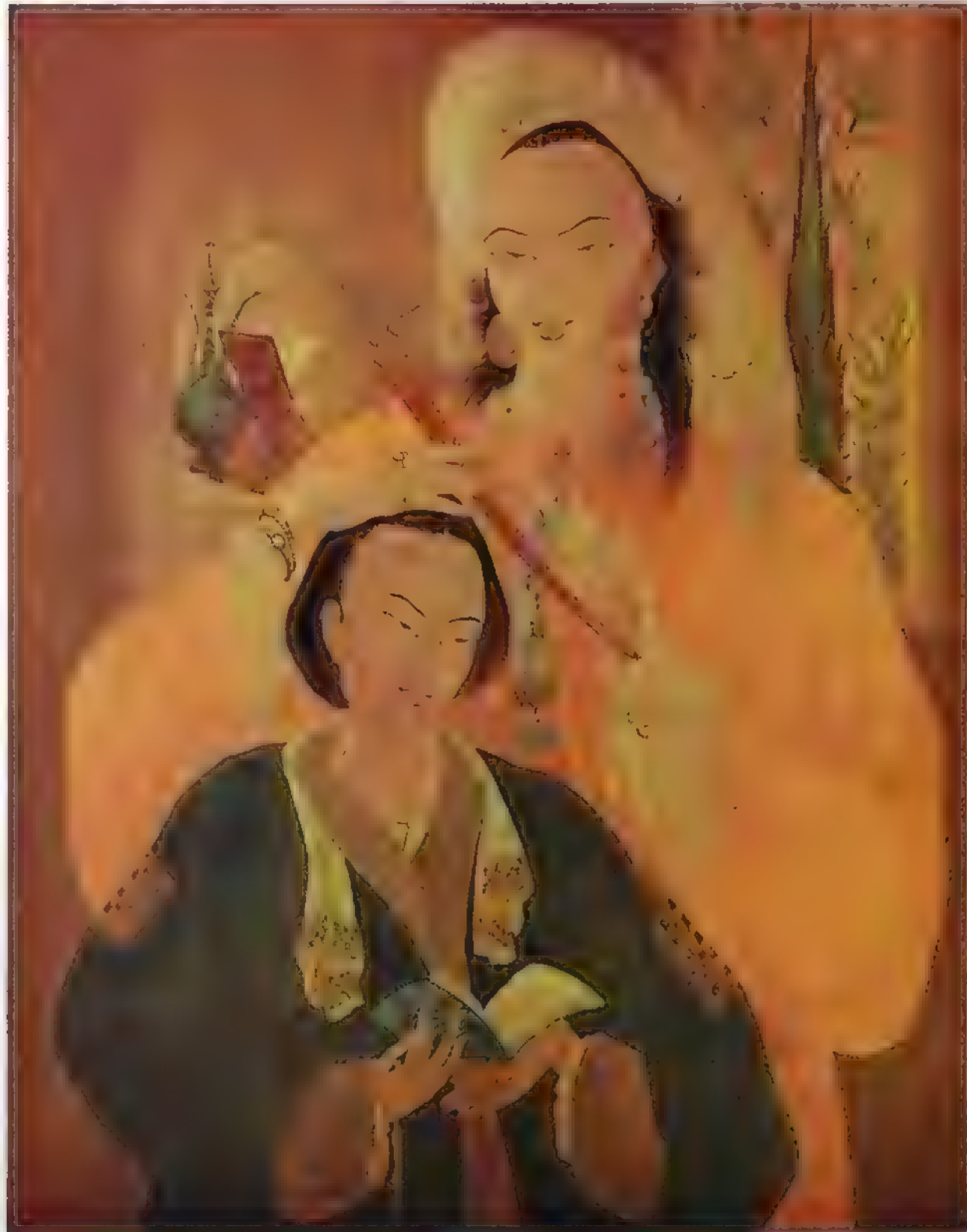
سلطان شہید

جس بندۂ حق بیں کی خودی ہو گئی بیدار
شمشیر کی مانند ہے بُرّندہ و بُرّاق

اقبال

سلطان شہید

سُلطان شہید ایک سخت کوش مجاہد اور سپاہی تھا۔ اسکے عظیم کردار کی عظمت زندگی کی اس کشمکش سے دوچار رہی ہے۔ جس کا ہر مجاہد اور غازی کو سامنا کرنا پڑتا ہے۔ مجاہد عمل اور آزادیٔ وطن کا غمخوار۔ اس کی منفرد شخصیت ہمیشہ زندگی کی نئی ترنگ سے ہمکنار رہی۔ اُس نے اپنے لئے وُہ راستہ منتخب کیا جس پر چل کر نظامِ زندگی قائم رہ سکتا تھا۔ وُہ خلق اور خالق دونوں کے کام آیا۔ اقبالؒ نے الفاظ کے ترنم اور وسعت معنی کے ساتھ جس طرح اس کی زندگی کے حقائق کو بیان کیا ہے چغتائی کی نگاہ بھی وہاں تک پہنچی ہے۔ اُس نے فنی نقطۂ نگاہ سے وہ کُچھ دیکھا ہے جو سُلطان شہید کی جدوجہد اور اس کی شہادت کا باعث بنا۔ اُس نے کردار کی تشکیل و تکمیل اور صُورتگری میں وُہ معانی پنہاں کردئے ہیں کہ سُلطان شہید کی داستانِ عظمت کی زندۂ جاوید داستان بن گئی ہے۔

سُلطانِ شہید کے کھڑے ہونے کا انداز ایک ایسے غازی اور کامل مجاہد کی تمکنت کا علمبردار ہے جس سے شہیدوں اور مجاہدوں کی سرگذشت حیات تکمیل پاتی ہے مستعدی، عالی ہمتی اور والہانہ اضطراب تصویر کے ہر پہلو سے نمایاں ہے۔ تصویر کے ہر گوشے پر جہاں بھی نظر پڑتی ہے، خود اعتمادی اور جسارت کے وُہ نقش اُبھرے ہوئے نظر آتے ہیں جن کا سُلطانِ شہید کی ذات مظہر تھی۔ بقائے دوام اور عظمت جاوداں نے اسکے قدم چُومے تھے۔ وہ تصویری پیکر میں بھی بڑی مستعدی سے ان واقعات کو دُہراتا معلوم ہوتا ہے جن سے تاریخ کے اوراق خونچکاں ہیں اور ہر آن ہم میں یہ احساس پیدا کرتے ہیں کہ سُلطان اپنے اعلیٰ مقصد کے لئے اب تک برسرِپیکار ہے۔

معلُوم ہوتا ہے کہ چغتائی نے یہ تصویر اُن نیک ساعتوں اور پُرخلوص لمحوں میں تخلیق کی ہے جب آرزُوؤں کے ولولے اور زندگی کی تڑپ کروٹیں لے رہی تھی۔ آرٹسٹ چغتائی نے ایک مجاہد کی آرزُوؤں کو اسکے کردار کا ہم نوا ہوکر سمجھا اور دیکھا ہے۔ وہ وقت کی حکمت سے دوچار ہُوا ہے۔ اُس نے دونوں کی نزاکت کو سمجھا ہے۔ گویا آرٹسٹ اور سُلطانِ شہید کے جنُوں کا رُخ ایک ہی تھا۔

فن کار ہر اس حقیقت کے قریب تر ہے جس سے اس کے پیکروں کو حیات ملتی ہے تصویر کے پس منظر میں توپ کا ڈھانچا دکھایا گیا ہے۔ یہ مجاہد سلطان کے مجاہدانہ اقدام کا تصوّر ہے۔ مردِ غازی کی بلند ہمتی اور اس کی بے پناہ سیرت ہماری نظر کے سامنے ہے اسکی بقا کو تاریخ نے واقعات کی صُورت میں دُہرایا ہے۔ انسانوں کا عمل کبھی شرمندۂ معنی نہیں ہُوا۔ انسان کی انسانیت کو کبھی صدمہ نہیں پہنچا اور یقین محکم سے شہادت کا خون رنگ لاتا رہیگا۔

سُلطان کی بلند ہمتی اور شخصیت کے انداز میں بقا اور فتح کا موازنہ ہے۔ اس کی دُوربین آنکھوں میں وُہ اعتماد

سحر ابھی تک نمایاں ہے۔ جو اُس نے اپنی تلوار اور اپنے عزم میں دیکھا تھا۔ اور یہی ایک ذریعہ ہے جس سے قومی نقطۂ نگاہ سے سلطان کے زندۂ جاوید کردار سے تسکین حاصل ہوتی ہے۔ لفاظ کی بلاغت اور جذبات کی توانائی نے رنگوں اور خطوں کی پختگی کو کیا نہیں بخشا ہو آرٹسٹ کے مُوقلم نے نظر انداز کیا ہو۔ یہ تصویری پیکر اپنے تخلیقی کرشمہ، کردار کی یہ مجاہدانہ سیرت زندہ تابندہ ہمیشہ دُنیائے آب وگل پر اس بات کی منادی کرتی رہے گی کہ وہ ہاتھ جس نے اسے بنایا اس کی منشار کے مطابق زندہ و تابندہ ہے۔

چغتائی نے حسن و نزول تخلیق کی تکمیل میں نہ صرف اپنی بصیرت کا اظہار کیا ہے بلکہ اس نے اس بات کی وضاحت بھی کی ہے کہ سلطان کے مدعا کا اس کے ساتھ ازلی رشتہ ہے۔ فکر و نظر اس کی کاوشوں کو مذہب کی طرف نہیں لے جا سکتی تھی، کیونکہ یہ پُرفسوں جذبہ ایک سچے اور کامیاب آرٹسٹ کا اظہار ہے ؎

اُس کی نگہِ شوخ پہ ہوتی ہے نمودار
ہر ذرّہ میں پوشیدہ ہے جو قدرتِ اشراق

چون بروید آدم از مُشتِ گلے
با دلے، با آرزوئے در دلے

لذت عیان چشیدن کارِ اوست
غیرِ خود چیزے نہ دیدن کارِ اوست

جہاں اگرچہ دِگرگوں ہے قُم باذن اللہ
وُہی زمیں وُہی گردوں ہے قم باذن اللہ

خودی ہو زندہ تو ہے فقر بھی شہنشاہی
نہیں ہے سنجر و طغرل سے کم شکوہِ فقیر
خودی ہو زندہ تو دریائے بیکراں پایاب
خودی ہو زندہ تو کُہسار پرنیاں و حریر!
نہنگِ زندہ ہے اپنے محیط میں آزاد
نہنگِ مُردہ کو موجِ سراب بھی زنجیر

SULTAN SHAHEED

"Chughtai has saved traditions by his sense of tradition. This picture shows, dignity and grace of an illustrious personality. Chughtai has caught the real spirit of Sultan Shaheed and portrayed it. Sultan Tipu, an embodiment of all human faculties and talents is represented by Chughtai in an artistic manner. In a way, he gives a comprehensive definition of his character. This is a very remarkable portrait by Chughtai revealing the high interest and aim of life. Chughtai establishes his ability of representing the administrative and political organisation of self-confidence in terms of colour and harmony.

"LIKE EAGLES, THEN SHOULD BE THY LIFE, THY DEATH,
ETERNITY IS IN THE BREATH OF LIFE,
I DO NOT SEEK ITS LENGTH. WHAT IS ITS LAW
AND PRINCIPLE? THE TIGER'S SINGLE BREATH IS
BETTER THAN THE SHEEP'S FULL CENTURY.

IQBAL
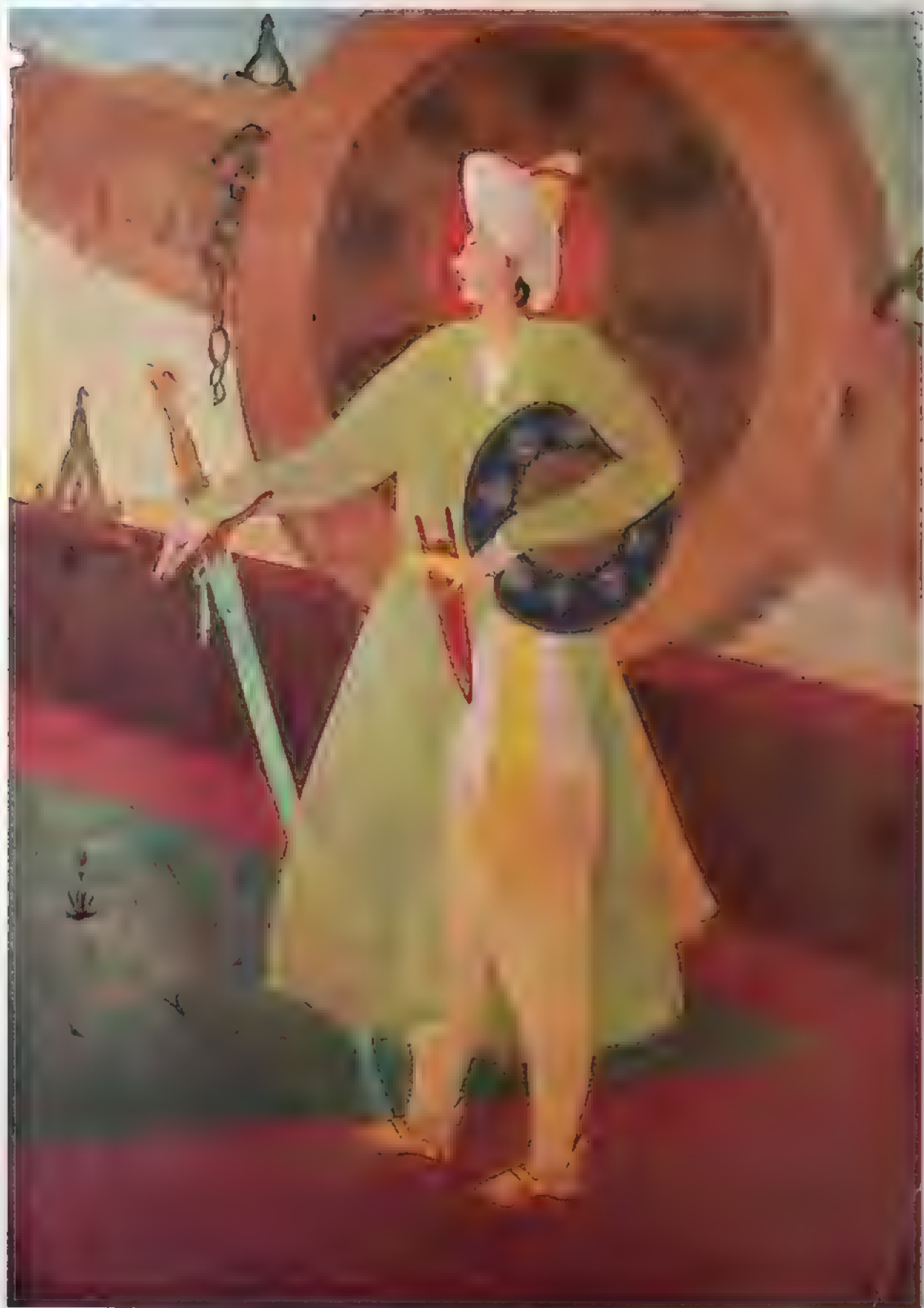
فروغ آدم
فروغ آدم خاکی ز تازه کاری هاست
مه ستاره کنند آنچه پیش ازین کردند
بلند بال چنانم که بر سپهر برین
هزار بار مرا نوریان کمین کردند
چراغ خویش برافروختم که دست کلیم
درین زمانه نهان زیر آستین کردند
نمود لاله صحرا نشین ز خونابم
چنانکه باده لعلی به ساتگین کردند
در آ به سجده و یاری ز خسروان مطلب
که روز فقر نیاگان ما چنین کردند
دم مرا صفت باد فرودین کردند
گیاه را ز سرشکم چو یاسمین کردند
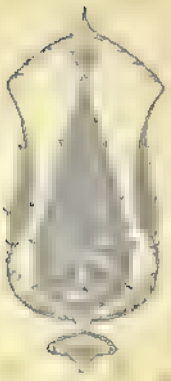
سلطان اور درویش

حیات و موت نہیں التفات کے لائق
فقط خودی ہے خودی کی نگاہ کا مقصود

اقبال
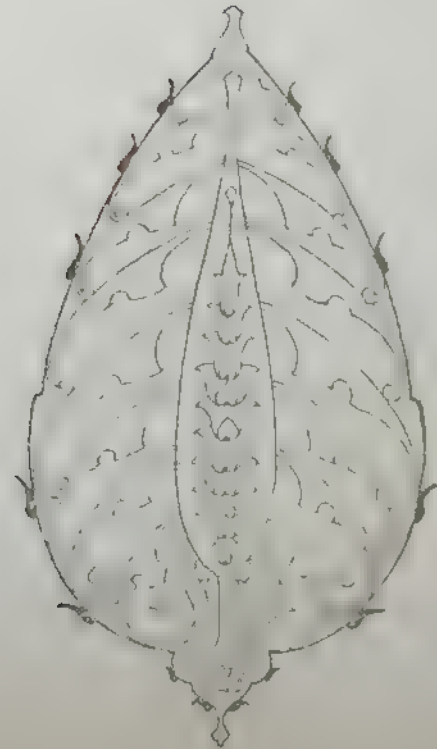
سلطان اور درویش

ہر مذہب و ملت میں دو قوتیں دوش بدوش برسرِ جنگ اور برسرِ اقتدار رہی ہیں اور اُن کی جنگ سے انسان کو الوہیت حاصل رہی ہے۔ ان قوتوں کے درمیان تقدیر کے اسرار کے علاوہ خود انسان ضبط و نسق سے برسرِ پیکار چلا آرہا ہے۔ کبھی اس جنگ میں انسان کے قلب و جگر و نگاہ کو اطمینان ملتا رہا اور کبھی وہ اس قدر بغاوت پر اُتر آیا کہ اسے خدا کی خدائی میں خدا بھی یاد نہ رہا۔ یہ بغاوت روحانی قدروں کی وحدت کا اہم مسئلہ تھا۔ وریہی وہ پوشیدہ جوہر ہیں جن سے قوانینِ زندگی اپنے ارتقا کو مائل پرواز دیکھتے ہیں۔ اور انسان اپنے نصب العین کو نظام ربوبیت کے تحت لامتناہی پاتا ہے۔ اور اس سلئے جیتا ہے کہ اس منزل سے پکارے۔ جس میں اس کی ہلاکت ہے۔

آرٹسٹ ہمیشہ سے زندگی کے مراحل کی طرح اصُولِ ارتقا کا پابند ہے۔ اسے تحقیق کا ذوق ازل سے ورثہ میں ملا ہے تاکہ تعمیر کا جذبہ کبھی اس کے اندر سے مفقود نہ ہو۔ چغتائی نے اپنی اس تصویر میں بلندی و پستی کو یکسر کر کے دیکھا ہے اور یہی بغاوت یا ترقی پسندی کا مفہوم ہے۔ یہ ترقی پسندی اگر رجعت پسندی میں بھی ڈھل جائے تو اس کے رگ و ریشہ میں کوئی فرق نہیں آتا۔ اسنے کمال فن سے جمالیاتی تجلیوں کا مظاہرہ کیا ہے۔ اس سرِ خودی کا بھی جو درویش اور سُلطان کے حصے میں اپنی اپنی شکل اور عقائد کے مطابق ظاہر ہوتی ہے۔ سلطان سُلطان وقت ہے۔ اس کے سپرد دین و دُنیا کا نظام ہے وہ جود و سخا کا مظہر ہے۔ لیے وہ عظمت حاصل ہے جو فرقِ مراتب کو ظاہر کرتی ہے۔ چغتائی نے اس کا سراپا اس کا جامع پیکر اس خود اعتمادی سے تیار کیا ہے کہ جیسے وہ سُلطان نہیں تو سُلطان کا ہمنشین ضرور رہ چکا ہے۔ اس کے مقابل جب اس کی نگاہ درویش کی طرف اُٹھتی ہے تو یُوں محسوس ہوتا ہے ان بخششوں میں اس کا بھی حصہ ہے۔ جن کے سامنے سُلطان کا سر بھی جُھک جاتا ہے۔ جس کے جبروت کے اقتدار کے حدُود مشرق و مغرب کے پابند نہیں ہیں۔ درویش ہو یا سُلطان دونوں کی گردن پر امانت کا بارِ مسلّم ہے اور اس حقیقت سے انکار بھی نہیں کیا جاسکتا کہ کائنات کا مطمحِ نظر پیچ در پیچ ہے۔ جلال و جمال کی شان رُوح کی بالیدگی کی نسبت سُلطان اور درویش دونوں پر طاری ہے۔

چغتائی نے ایک لڑکی کے آٹوگراف پر دستخط کرتے ہوئے لکھا تھا: "آرٹسٹ چغتائی غُربت اور پریشانیوں سے دوچار ضرور ہوا ہے۔ مگر ہر بار اسے ایک ایسی نعمتِ غیر مترقبہ حاصل ہوئی ہے جسے کبھی فنا نہیں" جب لڑکی نے گرم جوشی سے ہاتھ ملایا تو اُس نے کہا۔ تمہارا ہاتھ ایسا نہیں جیسا کہ مَیں نے ایک سُلطان سے ہاتھ ملاتے وقت محسُوس کیا تھا اور سُلطان کے یہ الفاظ سُن رہا تھا۔ خُدا خود مصوّر کے درجے کو بلند کرتا ہے تو مَیں کیسے ایک مصوّر سے مل کر خوشی محسوس نہ کروں۔ لڑکی نے جھکتے ہوئے کہا "مَیں سُلطان تو نہیں" مگر وُہ نعمتِ غیر مترقبہ تو ہو جو غربت کی پریشانیوں میں کبھی حاصل نہیں ہوتی۔ سُلطان اور درویش کے حسین پیکروں میں یہ جذبہ کارفرما ہے

کہ دونوں ایک ایسی غیر مترقبہ دولت سے مالا مال ہیں جسے کبھی فنا نہیں۔

تصویر کے بناؤ میں اس قدر تقدس اور ہم آہنگی ہے کہ رُوحانی ماورائیت بتدریج حلقہ بگوش نظر آتی ہے سُلطان ہو یا درویش، خلیفہ ہو یا دُخترِ حرم۔ چغتائی خود بھی ان تصوّرات اور حادثات سے متاثر ہو رہا ہے۔ زندگی چاہے رُوکھی پھیکی گذاری ہو، چاہے اس میں رجائیت اور قنوطیت کا تصادم رہا ہو اسے تو بہرصورت اسی تخلیق کے کل پُرزوں کو سنوارنا اور رُوحانی رشتے کو بلند کرنا ہے۔

چغتائی کا یہ غیر معمولی شاہکار اسرار و رُموز اور بیخودی کا جوہر ہے جس سے اس کی سنجیدگی و عقیدت مندی کا اظہار ہوتا ہے۔ یہ موضوع کتنا ہی فرسُودہ ہو مگر آرٹسٹ نے ان دونوں پیکروں کے اندر وہ شگفتگی اور تازگی بھر دی ہے کہ شبہ تک نہیں ہوتا کہ وہ اپنے مسلک سے بھٹکا ہوا ہے۔

آرٹسٹ نے اپنی اس تصویر میں علامہ اقبال کے نظریۂ وحدت کو بڑے وسیع پیمانہ پر پیش کیا ہے۔ اور اپنے موضوع کو ان خامیوں سے بچایا ہے جن کا بار بار اقبال نے ذکر کیا ہے ؎

خودی کو جب نظر آتی ہے قاہری اپنی
یہی مقام ہے کہتے ہیں جس کو سُلطانی

یہی مقام ہے مومن کی قوّتوں کا عیار — اسی مقام سے آدم ہے ظلِّ سُبحانی
یہ جبر و قہر نہیں ہے یہ عشق و مستی ہے — کہ جبر و قہر سے ممکن نہیں جہاں بانی
کسے خبر کہ ہزاروں مقام رکھتا ہے — وہ فقر جس میں ہے بے پردہ رُوحِ قرآنی

بہ خود نگر! گلہ ہائے جہاں چہ مے گوئی
اگر نگاہِ تو دیگر شود جہان دگر است

بہ میر قافلہ از من دُعا رسان و بگوی
اگرچہ راہ ہمان است کاروان دگر است

SULTAN AND THE SAINT

This picture reveals the religious conception and faith of the artist. His mastery of characteristic touchings displays the symbolic nature of his art.

The man of power is taking counsel from the man of wisdom (the Saint) and represents a contrast between the simplicity of his garments and the worldly dress of the Sultan. Yet there is a paradox here, for the Sultan is seen contemplating with sadness the blossom he holds, with its one remaining petal. He is reflecting on the transitory nature of his power and the agelessness of the Saint's wisdom.
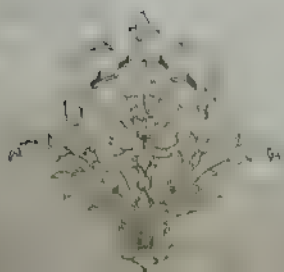
"THE POINT OF LIGHT, WHICH IS CALLED THE SELF,
IS THE VERY SPARK OF LIFE BENEATH OUR DUST.
BY LOVE IT IS MADE MORE LASTING AND FIRM,
MORE LIVING MORE BURNING, MORE EFFULGENT!

IQBAL

ہفت کشور

ہفت کشور جس سے ہو تسخیر بے تیغ و تفنگ
تُو اگر سمجھے تو تیرے پاس وُہ ساماں بھی ہے

اقبال

ہفت کشور

ہفت کشور کی تسخیر اقبال کے نزدیک عمل پیہم اور کتاب کی ہے۔ جب زوال پذیر عناصر قوموں اور ملکوں پر غلبہ حاصل کر لیتے ہیں تو ہر عمل بالبس ہو جاتا ہے ورانفرادیت گم ہو جاتی ہے۔ مغرب کا نظریۂ زندگی کتنا ہی مادہ پرستی کا نمائندہ ہو، وہ اپنے زبردست عمل سے پنے مقاصد کی طرف رواں دو ں ہے۔ اس کے مقابل مشرق کا سرمایۂ زندگی وحی ہے اور وحی پر اس کا ایمان۔ اور جب ایمان میں تذبذب پیدا ہو جائے، ور اس پر تنزل چھا جائے تو ایمان اور انسان دونوں محکومی اور نفاق کا شکار ہو جاتے ہیں۔ دریوں عتمادی گراں بہا دولت ن کے ہاتھ سے جاتی رہتی ہے۔ ذہنی محکومی نظامِ زندگی کو اس قدر درہم برہم کر دیتی ہے کہ غلام کے لئے آزادی کے ساتھ سانس لینے کی بھی گنجائش باقی نہیں رہتی۔ بصیرت گم ہو جاتی ہے، ضابطۂ حیات کا توازن بگڑ جاتا ہے، پژمردگی چھا جاتی ہے۔ اور تنزل روح اور جسم دونوں پر غالب آجاتا ہے۔

مغرب مشرق کی خواب آور زندگی سے محروم ہے۔ س کا رخ کسی نہ کسی شکل میں مشرق کے جوہروں کا متلاشی رہا ہے۔ ورمشرق اونچ نیچ دیکھنے کے باوجود ہڈیوں کی راکھ بنکر رہ گیا ہے۔ زوال پذیر آرٹ اور کند ذہنی نے خود اعتمادی کو کچل کر رکھ دیا ہے۔ اور ان تباہ کن اثرات نے قوموں کی سلامتی کو خطرے میں ڈال دیا ہے۔ اور کوئی قوم جس کا ادب اور آرٹ ڈانواں ڈول ہو اس گرداب سے نکل نہیں سکتی۔

چغتائی کی یہ تصویر اقبال کے نظریۂ انقلاب اور فلسفہ عمل کی طرف بڑی شدت سے توجہ دلاتی ہے اور آرٹسٹ نے کوشش کی ہے کہ اسے وہ بڑی حیثیت حاصل ہو جس سے ذہنی بلندیاں اور فکری وسعتیں پیدا ہوتی ہیں اور جن کے کھو جانے سے قوموں کی سوجھ بوجھ زنگ آلود ہو جاتی ہے اور تنزل کے راستے پر جا پڑتی ہیں۔

چغتائی کا یہ شاہکار کتاب الٰہی کی روشنی میں جدوجہد اور جہادِ زندگی کی ترغیب دلاتا رہے گا، اس منزل کا پتہ دیتا رہے گا جہاں استحکام اور ثبات حاصل ہوتا ہے، قوم کی عمارت کا سارا نظام انقلاب پیدا ہونے کے احساس پر استوار ہوتا ہے اور خود شناسی تیغ و تفنگ کے بغیر نمایاں اور آشکار ہوتی ہے۔

یہ تصویر مطالعہ کی استخواں بندی کا بھی ایک اچھوتا تجربہ ہے۔ ہر صورت و سیرت میں ایک انفرادیت ہر چہرے میں نیا تاثر اور نیا عزم ہے۔ یہاں ان امکانات کا سراغ ملتا ہے جن کی طرف رجوع کرنے سے نجات حاصل ہوتی ہے۔ چغتائی کی کثر تصویریں زندگی کی ایک موجِ بے تاب کی حیثیت رکھتی ہیں اس لئے کہ وہ سمجھتا ہے کہ زندگی خودی کی معمار ہے۔ اس تصویر میں تسلسل کا رجحان ہے۔ جماعت میں آزادروی پائی جاتی ہے۔ زندگی کا نیا شعور پیدا ہو رہا ہے۔ ہر رکاوٹ دعوتِ عمل بن گئی ہے۔

اور یوں محسوس ہوتا ہے کہ صدائے جرس کانوں میں سمائی جا رہی ہے۔ بلندی و پستی کی سطح ایک ہوگئی ہے۔

اقبال کے تصورات انسانی انا اور خودداری زندگی کی ان صلاحیتوں کے جویا ہیں جن سے انسان جینے کا سامان حاصل کرتا ہے۔ وہ کبھی اس زندگی کو گوارا نہیں کرتا جو بندگی کے بوجھ سے دب کر دم توڑ دے۔ اقبال جنگ آزما زندگی اور جہادانہ عمل کو خودشناسی سے تعبیر کرتا ہے۔ وہ اس جینے کا قائل ہے جس سے اس کے دین کی صداقت کے لئے راستے کھلے رہیں۔ وہ لوگ جنھیں کتاب الٰہی ہدایت کے لئے ملی تھی عالمگیر اخوت پر جیتے تھے۔ انھیں ہر حد بندی سے آزاد رہنے کی تلقین کی گئی تھی۔ وہ زمان و مکان کی حصار بندی سے بلندیاں کے آئینہ دار تھے۔ چغتائی کی تصویر میں ایک کہنہ سال، کہنہ مشق بوڑھی ماں ملت کی ماں کتاب حکمت کو تھامے اور کتاب الٰہی کو وسیلہ بنائے زندگی کا واسطہ دے رہی ہے۔ جہادِ زندگی سے آگاہی ہمارا فرض اور ہماری ذمہ داری ہے تصویر کا مجموعی خیال بیدار کرنا اور ان رجحانات کا رخ بدل دینا ہے جن سے قوائے حیات شل اور کمزور ہوگئے ہیں ؎

گر تو می خواہی مسلماں زیستن
نیست ممکن جز بہ قرآں زیستن

ز شامِ ما بروں آور سحر را
بہ قرآں باز خواں اہلِ نظر را
تو می دانی کہ سوزِ قرأتِ تو
دگرگوں کرد تقدیرِ عمر را

نقشِ قرآں تا دریں عالم نشست
نقشہ ہائے کاہن و پاپا شکست
فاش گویم آنچہ در دل مضمر است
ایں کتابے نیست چیزے دیگر است

THE VOICE OF THE VIRTUE

This painting shows the qualities of National spirit with great sentiment of sacrifice. These qualities, naturally depend on every thing in action. Godly person with the fortification of the Ego is endowed with infinite spirit.

Godly persons hearken to the inner voice when they are confronted with the problems of human rights and the social problems. This establishes the relation between the infinite Ego.

As an artist Chughtai has been able to depict the individual and social life, and creates interest in both. Old women holding the Holy Quran gives expression to her National spirit.

"WHAT I HAVE DESCRIBED IS ABOUT ANOTHER WORLD,
THIS BOOK IS ABOUT A DIFFERENT FIRMAMENT:
WHEN IN THE WORLD THE PATTERN OF THE BOOK
WAS DRAWN, IT RUBBED OUT THAT OF POPES AND PRIESTS.
WHAT DWELLS WITHIN THE HEART I MAY DISCLOSE:
'TIS NO MERE BOOK, IT IS A DIFFERENT THING.
WHICH, WHEN IT SOAKS THE SOUL TRANSFORMED, THE WORLD AS WELL IS SHAPED A NEW. BOTH IMMANENT AND CLEAR.

IQBAL

تسخیرِ آب و گِل

به خاکِ بدن دانۂ دِل فشان
که این دانه دارد زحاصل نشان

اقبال
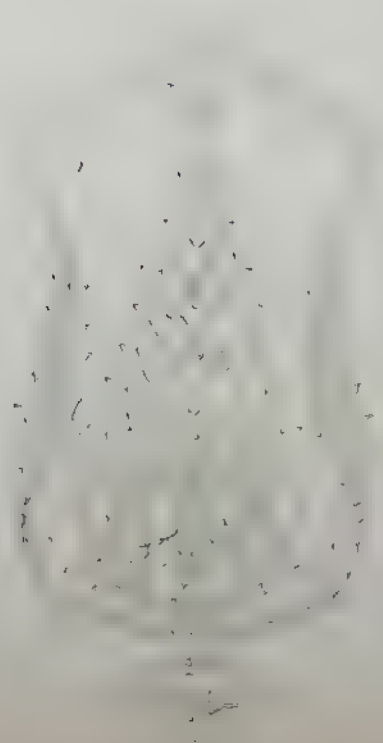
تسخیرِ آب و گِل

اِنکشافات اور ایجادات کا سلسلہ ہزارہا برس سے جاری ہے اور اب تک ختم ہونے میں نہیں آتا۔ مغرب میں ایسے ایسے ذہنی اور مشینی انقلاب رُونما ہُوئے ہیں کہ فراعنۂ مصر کی خدائی میں بھی ممکن نہ تھے۔ زمین سے آسمان والوں کا رشتہ بغاوت ہو یا شیطانی ممکن ہو یا ناممکن، مگر تسخیرِ آب و گِل کی راہیں وُہی ہیں جن میں انسان پرورش پاتا رہا اور اُن راہوں کی تلاش میں لگا رہا۔ جو تسخیرِ آب و گِل میں پوشیدہ تھیں۔

چغتائی آرٹسٹ کو اپنے پنجابی ہونے پر بڑا فخر ہے۔ خود کو زندہ دل اور اپنی سرزمین کو زرخیز خیال کرتا ہے۔ وہ یہ بھی سمجھتا ہے کہ یہ پنج دریاؤں کی فطرت ہے کہ یہ سرزمین ایسے جوہر اُگلتی رہی ہے، جس میں انسان اور انسانیت کا بھلا ہو۔ چغتائی نے پنجاب کے رسم و رواج پر ہیر رانجھا، سوہنی مہینوال اور دوسرے دیہاتی موضوعات پر بہت سی تصویریں بنائی ہیں۔ اسکے باوجود اسے اپنی اِس تصویر پر بڑا فخر ہے۔ اِس لئے کہ اس میں وُہ عالمگیر جذبہ موجود ہے جس سے کائنات پھلتی پھولتی اور مہکتی نظر آتی ہے۔ یہ ایک لوک گیت ہے جو تصویر کے رنگوں اور خطوں میں جلوہ گر ہے۔ یہ زندگی کی ان قدروں سے مالامال ہے جن سے انسان مٹّی کے اندر سے سونا اور سونے کے وُہ سکّے کرید کر نکالتا ہے جن پر اس کی حیات کی پُوری عمارت کھڑی ہے۔

اقبال نے کسان کی حمایت میں خوشۂ گندم کا نعرہ کُچھ ایسے انداز سے لگایا ہے کہ سارے کا سارا ملک اِس کا ہم نوا ہوگیا۔ نیا شعور بیدار ہوا۔ کسان اور زمیندار آب و گِل کی ٹوہ میں اپنے کردار کا جائزہ لینے لگا۔ اس کے وجود سے عمل، بلند ہمّتی اور توانائی زندہ ہے۔ دیہاتی نوجوان مٹّی کا اُگلا ہوا جوہر اپنی محنت کا پھل ہاتھ میں لئے ہوئے ہے۔ کتنا توانا، کتنا صحت مند اور اپنی زندہ دلی میں کتنا منفرد نظر آ رہا ہے۔ چغتائی نے اپنی اس تصویر کے خدوخال اور ان کی بناوٹ سے مٹّی کا صُوری حُسن اس ادا سے اس اعتماد سے اُجاگر کیا ہے کہ عملی زندگی کا نصب العین سامنے آکر کھڑا ہوگیا ہے۔

کسان کا اپنا عمل ہمیشہ عالم گیر راستوں کا تعین چاہتا ہے۔ کسان کی انفرادیت کا ضامن خود اسکا کردار ہے۔ اسکے بلند مقام سے اس کے کردار سے ضمیرِ انسانی میں اضطراب و ہیجان اُبھرتا ہے۔ چغتائی نے وحدتِ کردار کا وہ نادر شاہکار پیش کیا ہے کہ دُنیا کی تاریخ سمٹ کر ہمارے سامنے آگئی ہے اور نتائج مرتب کرنے کے لئے ہماری منتظر ہے اس تصویر کے خدوخال اور طرزِ نگارش نے خود چغتائی کے فن میں بھی ایسا نیا رنگ و آہنگ پیدا کیا ہے جو پہلے اس کی تصویروں میں بہت کم نظر آتا ہے۔ اس نئے تجربے اور نئے موضوع میں آرٹسٹ کے فکر کی سنجیدگی اور رُوح کی بالیدگی نے نئی تخلیقی سرحدوں کو چھُوا ہے۔ تصویر میں رنگوں کا اعتدال و توازن جامع بھی ہے اور حسین بھی۔ اس میں دلکشی اور رعنائی کا جو امتزاج ہے اس سے محبت اور عقیدت کی وُہ شدت

ظاہر ہے جو آرٹسٹ کو اپنی مٹی سے ہے۔

اقبال کشمکشِ حیات کو زندگی کا اہم ترین جزو سمجھتا ہے۔ اس کا نظریہ ہے کہ ہر فعل سے حُسن اور خون کی حدت پیدا ہونی لازمی ہے۔ چغتائی کا کہنا ہے کہ کوئی سرزمین، کوئی ملک، کوئی قوم ہو اُسے اپنے تقاضوں سے جینا اور جینے کا ثبوت دینا ہوتا ہے۔ اور اسی میں اس کے دماغی توازن کا کرشمہ ہے۔ یہی سبب ہے کہ اس کے جمالیاتی حُسن کو ہر نفسیاتی تجزیہ پر برتری حاصل ہے۔ وُہ چاہتا ہے کہ ہم اپنے نشانوں سے اپنی روایات سے اور اپنے فن سے پہچانے جائیں اور جو قدم آگے کی طرف اُٹھے۔ اسکا رشتہ پچھلے قدم کے ساتھ مربُوط و محکم ہو۔

آرٹ کا یہ نادر شاہکار تنقیدی پہلوؤں سے اس بات کا یقین دلاتا ہے کہ وُہ ایک خاص معاشرے کا نمائندہ ہے۔ اس نے معاشرے کے تقاضوں اور ضرورتوں کے زیرِ اثر شکل و صُورت حاصل کی ہے۔ آرٹسٹ ذہنی آزادی، امتیازی نظم و ضبط، انفرادی اور اخلاقی قُوتوں کے تحت فن کی افادیت کو کام میں لایا ہے۔ اُس نے زندگی کی مطابقت بھی حاصل کی ہے۔ اور اس کی صلاحیتیں بروئے کار آئی ہیں۔ یہ تصویر ایک لوک گیت ہے، عمل سے ہم آہنگ ہے۔ اس سے صُوبجاتی وضعداری نمایاں ہے جسے آرٹسٹ نے اپنی ذات تک ہی محدُود نہیں رکھا بلکہ عالمگیر انسانی محبت اور مساوات میں ڈبو دیا ہے ؎

پالتا ہے بیج کو مٹی کی تاریکی میں کون
کون دریاؤں کی موجوں سے اُٹھاتا ہے سحاب

کس نے بھر دی موتیوں سے خوشۂ گندم کی جیب
موسموں کو کس نے سکھلائی ہے خُوئے انقلاب

دہ خُدایا یہ زمیں تیری نہیں تیری نہیں
تیرے آبا کی نہیں تیری نہیں میری نہیں

بہ خاکِ بدن دانۂ دل فشان — کہ این دانہ دارد ز حاصل نشان

THE YOUNG FARMER

Here is a portrait of a young farmer full of youth — a typical character of self representative of action. This painting of Chughtai is a masterpiece and it is not influenced by the complications of any 'ism'. If Botticelle, Rembrandt, John, Renior and Manet can select any living model as their subjects. Chughtai too has the right to paint from his living surrounding.

The creative portrait of a young farmer with a fruitful corn, gives an interesting example of his art. A vigorous and a colourful composition portrayed by a subtle harmony depicts him with amazing realism.

"WHO REAR THE SEED IN THE DARKNESS OF THE GROUNDS?
WHO LIFTS THE CLOUD UP FROM THE OCEAN WAVE?
WHO DREW HERE FROM THE WEST THE FRUITFUL WING?
WHO MADE THIS SOIL, OR WHO THAT LIGHT OF THE SUN?
WHO WILLED WITH PEARLS OF GRAIN THE TASSELLED WHEAT?
WHO TAUGHT THE MONTHS BY INSTINCT TO REVOLVE?
LANDLORD! THIS EARTH IS NOT THINE, IS NOT THINE,
NOR YET THY FATHERS; NO, NOT THINE, NOR MINE.

IQBAL

خلیفہ ہارُون الرّشیدؒ

اُمم را از شہاں پایندہ تر داں
نمی بینی کہ ایراں ماند و جم رفت

اقبال
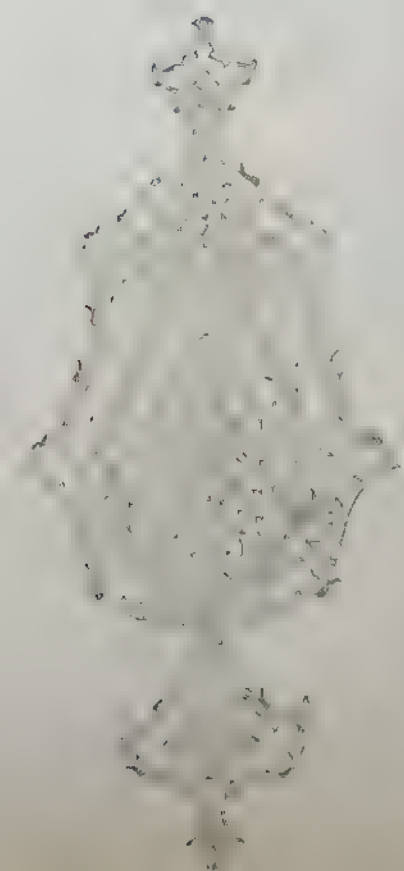
خلیفہ ہارون الرشید

چغتائی کے فن کا طرۂ امتیاز یہی ہے کہ اس کے رنگوں اور خطوں کو نظر انداز کرتے ہوئے بھی اس کی تخلیق پر اس کی مہر ثبت ہو۔ وہ اس طرزِ نگارش سے اور اس اسلوب، و رفنی انہاک سے جو اُنکے نام سے منسوب ہے، جدھر نظر اُٹھے وُہی وُہ نظر آئے۔ مگر جب اس کے معیارِ فن اور معیار کے وقار کو پرکھنے کے لئے تنقید کا سہارا تلاش کیا جائے، تو اس کے فن میں ایسے ایسے امکان نظر آتے ہیں کہ وہ خود اپنی انفرادیت سے سرکشی اور بغاوت کرتا ہُوا نظر آتا ہے اور مطالعہ سے ایسی راہیں ہاتھ آتی ہیں کہ اس کے جدید اور جدید تر ہونے کا سوال اُٹھ کھڑا ہوتا ہے انھی راہوں کی دیکھ بھال میں ایسا محسوس ہونے لگتا ہے جیسے آج کا انسان ہزاروں سال پہلے اپنی تہذیب و تمدن کے بڑے بڑے کرداروں اور شخصیتوں کے ساتھ اُٹھتا بیٹھتا وقت کے تقاضوں سے نپٹتا رہا ہے۔ اُن شخصیتوں کے ساتھ جنھیں رجائیت سے لگاؤ اور انحطاط اور تنزل سے نفرت رہی ہے، جو ہمیشہ وقت کیساتھ چلتے اور ان قوتوں کی دیکھ بھال کرتے رہے ہیں جن سے آسمان بھی لرزہ براندام رہا وہ کبھی اپنے مُدعا سے ادھر اُدھر نہیں ہوئے۔ چغتائی ان کا رازدار ہے اور وہ چغتائی کے قدرشناسوں میں سے ہیں۔ وہ فن کا معراج یہی سمجھتا ہے کہ کرداروں سے جوہر تخلیق ہوں، قوائے حیات شل نہ ہوں اور تخلیق اپنے حدود سے بھی تجاوز کر جائے اس لئے کہ اس کے نزدیک تقلید موت کے مترادف ہے۔

چغتائی کا سُلطان اور اس کا خلیفہ گوتم بدھ نہیں۔ وہ تلوار کا دھنی ہے۔ تلوار سے کھیلتا ہے اور زندگی کی مسرتوں اور کامرانیوں کا آرزومند ہے۔ وہ دونوں جہاں کی تسخیر چاہتا ہے۔ وہ چوب کلیم کی ضرب سے اپنی رجائیت سے قنوطیت کا سر تسلیم کر دینا چاہتا ہے۔ وہ ملک و ملّت سے عقیدت رکھتا ہے اور چاہتا ہے اس کا ہر فرد ہفت اقلیم کا تسخیر کنندہ ہو۔ مشرق و مغرب اس کی گرفت میں ہوں۔ کائنات کے ذرّے ذرّے پر اس کے قدموں کے نشان ہوں۔ وہ ایک ہی جست میں آسمانوں میں کمندیں ڈال کر ستاروں کو پھاند جائے۔ اس کی دُنیا اس کی اپنی دُنیا ہو۔ بُدھ نے اپنے پرستاروں کو رہبانیت کا سبق دیا تھا۔ انھیں غاروں میں بند کر کے دُنیا کی نعمتوں سے محروم کر دیا تھا، مگر خلیفہ کا خمیر چاہے چغتائی کے قلم کی پیداوار ہو یا اقبال کے تصور کا اظہار، وہ خودشناس بھی ہے جہاں بان عشق اور عاشقی پر جیتا ہے۔ خلیفہ کی نشست اُن قلندروں کی سی ہے جنھوں نے کبھی محکومیت کو تسلیم نہیں کیا۔ اس نے کبھی ایسا لباس نہیں پہنا جس سے اس کا سراپا مرعُوب یا مغلوب نظر آئے۔ وہ اُٹھیگا تو سیرت پیغمبرؐ بن کر، چلے گا تو شاہین کی پرواز ہو کر۔ اس کی عقابی آنکھیں خود کی متلاشی، اپنے مرکز کی طرف مائل، زندگی کے زیروبم سے ہم آہنگ بخششوں اور رحمتوں کا مظہر ہیں اقبال جن توقعات اور اوصاف سے ہر انسان کو دیکھنے کا خواہش مند ہے چغتائی کی نادرہ کاری اور سحر نگاری اس کا ثبوت ہے۔

ہمیں خواہ فن کار کے رُجحانات سے اختلاف ہو مگر اس کے جمالیاتی حُسن، جلال و جمال اور نظریۂ ہیئت اور مواد

کو کسی قیمت پر نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اس کی مشرقیت میں معتمدانہ کرداروں اور ان کے انتخاب کو دیدہ وری سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ وہ ہر بار اپنی نگاہوں کو صدیوں کے بچھڑے ہوئے رشتوں سے ہمکنار کرتا ہے۔ یہ خلیفہ، یہ فنِ تعمیر، یہ شمشیرِ حیات، یہ خود شناس یہ اٹل چٹان کی سی شخصیت مملکتوں کے اہم مسائل کی روشنی میں پوری رجائیت پر قادر ہے۔

تخلیق خواہ مادی ہو یا ذہنی کسی پیکر وجود میں منتقل نہیں ہو سکتی جب تک آرٹسٹ اس کی افادیت اور توازن سے خود بہرہ ور نہ ہو۔ پست ہمتی، پست خیالی ہمیشہ ایسے مواد کی تلاش میں رہی ہے کہ وہ مادی اور ذہنی تخلیقات کی جمالیاتی تسکین سے محروم رہے۔ مگر چغتائی نے کسی قیمت پر اس محرومیت کو قبول نہیں کیا۔ اس کا مدعا ہرگز یہ نہیں کہ وہ چھوٹے نگوں کی ریزہ کاری میں تخلیق کا مقصد کھو دے۔ اس سے اس کی انفرادیت کو صدمہ پہنچتا ہے ؎

ہر لحظہ ہے مومن کی نئی آن نئی شان
گفتار میں کردار میں اللہ کی برہان

قہاری و غفاری و قدوسی و جبروت
یہ چار عناصر ہوں تو بنتا ہے مسلمان

ہمسایۂ جبریلِ امیں بندۂ خاکی
ہے اس کا نشیمن نہ بخارا نہ بدخشاں

یہ راز کسی کو نہیں معلوم کہ مومن
قاری نظر آتا ہے حقیقت میں ہے قرآن

قدرت کے مقاصد کا عیار اس کے ارادے
دنیا میں بھی میزان قیامت میں بھی میزان

تنے پیدا کُن از مشتِ غبارے
تنے محکم تر از سنگین حصارے
درونِ او دلِ درد آشنائے
چو جوئے در کنارِ کوہسارے
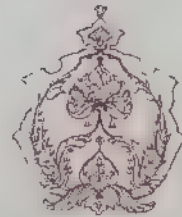
KHALIFA HARUN RASHID

Khalifa Harun Rashid, an august personality from the history of Islam, as a living personality. Living personalities, of Emperors, Vazirs, Generals and Soldiers, from the history of Islam are favourite subjects of Chughtai, they always inspire the artist with their characteristic charm.

The artist has created an architectural monument which is a symbol of wisdom, vigour and vitality. His posture has been set-up and looks like a carved rock. By symbolising the great personality, Chughtai has depicted the Royal dignity and the superiority of the attitude of the Khalifa.

"ALEXANDER THE GREAT IS GONE, THE SWORD AND BANNER ARE NO MORE;
THE TRIBUTE OF THE CITY AND THE TREASURE OF THE MINE AND SEA ARE NO MORE;
SURELY THE NATIONS ARE MORE LASTING THAN THE KING;
DOST THOU NOT SEE THAT IRAN HAS REMAINED AND JAMSHID IS NO MORE!

IQBAL.

دیدن دگر آموز

نوائے وقت

دیدن دگر آموز

مانندِ صبا خیز و وزیدن دگر آموز — دامانِ گل و لالہ کشیدن دگر آموز
اندر دلکِ غنچہ خزیدن دگر آموز!

موئینہ بہ بر کردی و بی ذوق تپیدی — آن گونہ تپیدی کہ بجائی نرسیدی
در انجمنِ شوق تپیدن دگر آموز!

کافر! دلِ آوارہ دگر بارہ باد بند — بر خویش کشا دیدہ و از غیر فرو بند!
دیدن دگر آموز و ندیدن دگر آموز!

دم چیست؟ پیام است شنیدی؟ نشنیدی! در خاک تو یک جلوهٔ عام است ندیدی!

دیدن دگر آموز! شنیدن دگر آموز!

ما چشمِ عقاب و دلِ شہباز نداریم چون مرغِ سرا لذتِ پرواز نداریم

اے مرغِ سرا خیز و پریدن دگر آموز!

تختِ جم و دارا سرِ راہے نفروشند این کوہِ گران است بکاہے نفروشند

با خونِ دلِ خویش خریدن دگر آموز!

نالیدی و تقدیر ہمان است کہ بود است! آن حلقۂ زنجیر ہمان است کہ بود است!

نومید مشو! نالہ کشیدن دگر آموز!

واسوختہ؟ یک شرر از داغِ جگر گیر! یک چند بخود پیچ و نیستان ہمہ در گیر!

چون شعلہ بخاشاک دویدن دگر آموز!

نوائے وقت

خورشید بہ دامانم، انجم بہ گریبانم
در من نگری ہیچم، در خود نگری جانم
در شہر و بیابانم، در کاخ و شبستانم
من دردم و درمانم، من عیشِ فراوانم
من تیغِ جہاں سوزم، من چشمۂ حیوانم

چنگیزی و تیموری، مشتے ز غبارِ من
ہنگامۂ افرنگی، یک جستہ شرارِ من
اِنسان و جہانِ اُو، از نقش و نگارِ من
خُونِ جگرِ مرداں، سامانِ بہارِ من
من آتشِ سوزانم، من روضۂ رضوانم

آسُودہ و سیارم، ایں طرفہ تماشا بیں
در بادۂ امروزم، کیفیتِ فردا بیں
پنہاں بہ ضمیرِ من، صد عالمِ رعنا بیں
صد کوکبِ غلطاں بیں، صد گنبدِ خضرا بیں
من کسوتِ انسانم، پیراہنِ یزدانم

تقدیر فسونِ من، تدبیر فسونِ تو !
تو عاشقِ لیلائے، من دشتِ جنونِ تو
چوں روحِ رواں پاکم، از چند و چگونِ تو
تو رازِ درُونِ من، من رازِ درُونِ تو
از جانِ تو پیدایم، در جانِ تو پنہانم

من رہرو و تو منزل، من مزرع و تو حاصل!
تو سازِ صد آہنگے، تو گرمئ ایں محفل!
آوارۂ آب و گل! دریاب مقامِ دل
گنجیدہ بہ جامے بیں ایں قلزمِ بے ساحل
از موجِ بلندِ تو سر بر زدہ طوفانم!

امامت جہاں

سبق پھر پڑھ صداقت کا عدالت کا شجاعت کا
لیا جائیگا تجھ سے کام دُنیا کی امامت کا

اقبال

امامت جہاں
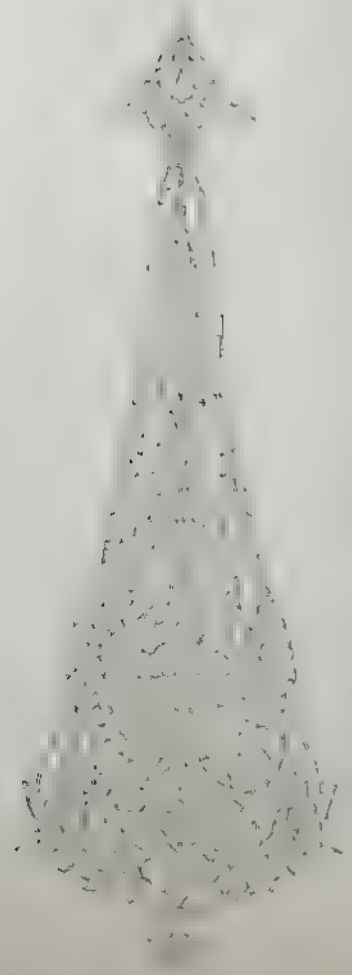
اقبالؒ کے ہاں کس بات کی کمی ہے، جس کا مطالعہ انسانی رشتے کو استواری کا موقع مہیا نہیں کرتا۔ شاعر نے ہر صحت مندانہ جذبے کی پرورش کیلئے راہیں دکھائی ہیں۔ زندگی کو جدوجہد سے جینا سکھدیا ہے۔ عشق کو عقل کو نیا شعور عطا کیا ہے۔ زندگی کی صداقتوں کو رُوح کی بالیدگی کا سامان دیا ہے۔ صداقتوں کو ناپا اور پرکھا ہے۔ اقبال نے نظریۂ خودی کے پہلو بہ پہلو اسلام کے قانون کو بھی کبھی نظر انداز نہیں کیا جس سے یہ کائنات اور زندگی زمان و مکان کے سانچوں میں ڈھلتی ہے۔ ملک اور ملکوں کی تسخیر ایک ایسا مسئلہ ہے جہاں تہذیب و تمدن اور رضائے الٰہی کام آتی ہے۔ زندگی کی شدت، انداز دلبری اور قاہری دعوتوں کا پتہ دیتی ہے زندگی کے یہ سب اوصاف آرٹسٹ کے مرہون منت ہیں۔ اس کی تصویروں سے، روشن ضمیری، آزادیٔ فکر اور جمالیاتی حُسن کی نئی آیات اور نیا اُفق ہاتھ آتا ہے۔

یہ سچ ہے کہ چغتائی آرٹسٹ ہے۔ اُسے اپنی مشرقیت سے والہانہ عشق ہے۔ وہ اقبال کا ہم عصر اور اقبال جیسے مفکر اور فلسفی کے زمانے کی پیداوار ہے پھر سے اقبال جیسے عظیم انسان سے عقیدت ہے۔ اس کی شخصیت کا پُورا پُورا احترام ہے عقل اور عقیدت کی روشنی میں وہ اپنے معاشرے، اور معاشرے کے تقاضوں کا ترجمان ہے اس کی تکنیک رنگوں اور خطوں کی جمعیت کو نظر انداز کرتے ہُوئے بھی مشرق کی ان روایات کے ساتھ منسلک ہے جنہیں اقبال کی آرزو ہونے کا فخر حاصل ہے وہ سُلطان فقیر، غلام، شہزادی کسی کی تصویر کیوں نہ بنائے اپنے موضوع کے پیش نظر وہ ایسی شکل اختیار کر لیتی ہے کہ علامہ اقبال کے مطمح نظر کے قریب تر نظر آتی ہے۔ **چغتائی** کی ہر تصویر ہماری ثقافتی قدروں کی ترجمانی کرتی ہے۔ امامت جہاں کا ماحول اور تاثرات ماضی سے جنم لیتے ہیں یہ ماضی کی تصویر ہے۔ یہ ہماری بے راہ روی پر ایک **نظم**، زندہ نظم، اور زندہ قوم کے محتمد لوگوں کا زندہ کردار ہے۔

ایک فنکار کی حیثیت سے چغتائی نے امامت جہاں کا تصور ایک مقدس مدعا کے زیر تخلیق کیا ہے۔ صداقت شجاعت، عمل پیہم، یقین محکم کی سرپرستی کا انداز اتنا معنی خیز اور نتیجہ آور ہے کہ سر جھک جاتا ہے۔ کتاب الٰہی کا دامن پکڑے نوخیز امام پرواز چڑھنے کے لئے پر تول رہا ہے۔ چغتائی نے ایک کامل معمار حرم کا تصور پیش کیا ہے۔ اور یہ وُہی تصور ہے جسے اقبال نے مُختلف زاویوں اور مُختلف شکلوں میں پیش کیا ہے۔

تصویر کی استخواں بندی اور ترتیبی اجزاء کی بندشوں نے ایک پاسبان حرم کی تخلیقی راہیں کھول دی ہیں اقبال کے شاعرانہ جدل دجمال کو چغتائی کے قلم نے یوں آباد کر دکھایا ہے۔ کہ موضوع کی عظمت اور تصویر کا سلوب واضح ہے چغتائی

کی فروانی اور توانائی اس کی خود اعتمادی معمارِ حرم کے خدوخال سے قابلِ ستائش ہے۔ آرٹسٹ کردار کی ذمہ داریوں سے خودشناسی کے داخلی پہلوؤں سے اور وحدت تعجب کے تاثرات کو دیکھتا محسوس ہوتا ہے۔ اسے قومی کردار کا اس قدر شعور ہے کہ زندگی کی فنا سے اُبھرے ہوئے نقوش خود بخود ماضی سے جا ملتے ہیں۔

معمارِ حرم کا جوہر وراثت کی پرورش و پرداخت کا ماحول یوں لگتا ہے جیسے دماغی توازن صدیوں کے ہیر پھیر کے باوجود شل نہیں ہوا وقت کے تقاضوں کا سینے در ہر دُکھ پیچ سے باہر ان قوتوں کا مظہر ہے جن سے وحدت اور انفرادیت ہاتھ آتی ہے۔ تصویر ان محسوسات کی شیرازہ بندی ہے جن سے شانِ خودداری اور خود اعتمادی آنکھ ملانے کی تاب نہیں رکھتی۔ تصویر کا ذرہ ذرہ اپنے حضور کی خاطر خود اپنے تخلیق کی مصلحت آمیزی کو نمایاں کرنے پر مجبور ہے۔

چغتائی کو یہ بات ورثہ میں ملی ہے کہ وہ اپنی ہر تخلیق کے لئے ایسا مواد اور ہیئت مہیا کرے جس کی نوعیت و ماہیت ملت کی اُمنگوں سے سرشار اور محبت کے ہمہ گیر جذبے کے سیاہ و سفید کی پرستار ہو تاکہ ثقافتی قدریں کسی محدود دائرہ فن اور ذہنی خلفشار میں دم گھٹ کر نہ رہ جائیں ؎

پسر را گفت پیرے خرقہ بازے
ترا این نکتہ باید حرزِ جان کرد

بہ نمرودانِ این دور آشنا باش
ز فیضِ شانِ براہیمی توان کرد

غیرت ہے بڑی چیز جہانِ تگ و دو میں — پہناتی ہے درویش کو تاجِ سرِ دارا
افراد کے ہاتھوں میں ہے اقوام کی تقدیر — ہر فرد ہے ملت کے مقدر کا ستارا
تقدیرِ اُمم کیا ہے کوئی کہہ نہیں سکتا — مومن کی فراست ہو تو کافی ہے اشارا

اخلاصِ عمل مانگ نیاگانِ کہن سے
شاہاں چہ عجب گر بنوازند گدا را!

THE LEADERSHIP

Leaders and leadership is an intellectual and original apprehension for the rebirth of the spirit and awakening of the Ego. It is impossible for the human power to achieve any success without courage and moral spirit. No progress can be achieved by the young blood of the Nation without the development of the character. Character defines the balance of all human powers with human rights.

The composition of this marvellous painting has achieved the position of a masterpiece by remaining faithful to life and by using the symbol and treatment of the man of genius. The attitude of man as leader is unusal determination.

" A MOMIN'S ARM IS REALLY GOD'S ARM-
DOMINANT, CREATIVE, RESOURCEFUL, EFFICIENT.
HUMAN BUT LIKE ANGELS INDISPOSITION. A SLAVE WITH MASTER' ATTRIBUTES,
HIS CAREFREE HEART NOT WORRIED ABOUT EITHER WORLD.
HIS HOPES ARE SMALL, HIS AIMS GREAT,
HIS MANNERS CAPTIVATING, HIS EYES CHARMING.
GENTLE IN SPEACH, FIERCE IN ACTION ;
IN WAR OR IN FRIENDLY ASSEMBLIES PURE OF HEART AND NOBLE OF DISPOSITION.

IQBAL

قلندراں

مہر و مہ و انجم کا محاسب ہے قلندر
ایام کا مرکب نہیں راکب ہے قلندر

اقبال

بے پروا احترام

چغتائی نے جو پہلا باز دیکھا وہ ایک سرحدی پٹھان کے دائیں ہاتھ پر بڑے مدبرانہ انداز میں بیٹھا تھا۔ اسے دیکھ کر وہ متحیر رہ گیا تھا۔ سرحدی نے اپنے باز کی آنکھوں پر کن ٹوپ چڑھا رکھا تھا خود اُس نے ایک بھدا سا دستانہ پہن رکھا تھا۔ چغتائی س کے قریب ہوگیا اور جرأت کر کے پوچھا۔ کیا یہ کوئی نئی قسم کی چیل ہے ؟ پٹھان نے آٹھ سات سال کے بچے کو اپنی طرف کھینچا۔ وُہ ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔ وہ خود بھی ایک شاہین تھا۔ اس کی بلوری آنکھیں چمک رہی تھیں۔ اس نے اپنے باز کی آنکھوں سے کن ٹوپ اُتارا، و راس کا اصل رُوپ دکھایا، جس میں پٹھان کی سی شجاعت اور وجاہت موجود تھی۔ چغتائی نے بیان کیا۔ مجھے یاد ہے بند آنکھوں والا باز اپنے مالک کی ہر حرکت پر بازو ہلاتا اور پر تول دیتا تھا، جیسے وُہ ایک ہی اُڑان میں پہاڑ اور چٹانیں پھاند جائیگا۔ یہ واقعہ چغتائی کے ساتھ سنہری مسجد لاہور کے عین سامنے پیش آیا تھا۔ چغتائی نے باز کی جو پہلی تصویر دیکھی وہ جرمنی کے مشہور آرٹسٹ ہال بائین کی تھی۔ اسے اس وقت وہ سرحدی پٹھان اور اس کا باز بڑی شدت سے یاد آیا۔ ہال بائین کی اس تصویر سے چغتائی کے مطالعے کا آغاز ہوتا ہے۔ اس وقت اس کی عُمر انیس بیس سال کے لگ بھگ تھی۔ اسی طرح چاند سلطانہ کی تصویر۔ آہستہ آہستہ مغل بادشاہوں کی تصویریں اس کے علم میں اضافہ کرنے لگیں۔ اسکی دلچسپی بڑھتی رہی۔ وُہ اپنے فن کی راہوں کو کشادہ کرنے کے لئے شاہین کے کردار کو مختلف صُورتوں میں استعمال کرتا۔ جنہیں زندگی کے رمُوز سے علیحدہ نہیں کیا جاسکتا۔ علامہ اقبال نے چغتائی کے ایک شاہین کی تصویر دیکھ کر اُس باز نامے کا ذکر بڑی تفصیل سے کیا جو آج بھی فارسی زبان میں جُوں کا تُوں موجود ہے۔ ان خصُوصیات اور اوصاف کے ساتھ جو اس پرندے کو دُوسروں سے افضل بناتی ہیں۔

چغتائی کے قلندر کی یہ تصویر پہلے پہل محض خاکے کی شکل میں نمودار ہوئی تھی اور بڑھتے بڑھتے رنگوں میں ڈھل گئی۔ علامہ اقبال کو دکھائی گئی تو اُنھوں نے اسے راکب قلندر کہا۔ چغتائی کا فن وقت کی ضرورتوں کے ساتھ بدلتا رہا۔ اس میں اہم تبدیلیاں واقع ہوتی رہیں۔ اسنے حقائق سے کبھی چشم پوشی نہیں کی۔ اس کا فن معاشرے اور قوم کا فن کہلاتا رہا۔ چغتائی کلاسیکی رُجحانات کا نمائندہ ہے وہ اُن آوارہ قلندروں اور درویش منش بھگتوں کے پیکروں میں جو قنوطیت کا سہارا تھے، جو دھرتی کے سینے کی گرمی کو سرد کرنے کیلئے تُلے تھے، توانائی بھر دی تاکہ قلندر کا عصائے پیری اپنی ضربِ کلیمی سے دُنیا کا نقشہ بدل سکے۔ یُوں تو چغتائی نے گوسائیں تلسی داس، گوتم بدھ، راجہ بھرتری، بھگت کبیر تک کی تصویریں بنائی ہیں مگر اقبال کے قلندر کی تصویر ان سب سے مختلف ہے۔ چغتائی کا قلندر عشق و محبت کے وجد سے سرشار ہے۔ اسکی آنکھیں رمُوزِ حیات سے ناآشنا، برق رفتار، ایک نیا جہان آباد کرنے میں پیش پیش ہیں۔ قلندر کی خود اعتمادی اور اُسکے عصائے قلندری کی گردش سے کائنات دم بخود ہے۔ قلندر کا رقص انقلاب انگیز بڑی بڑی قوتوں کو تسخیر کرنے

میں سیلاب کا کام کرتا نظر آ رہا ہے وہ اس تہذیب کا تصور ہے جس نے فقر کو قلندری اور انسان کو بے خوفی بخشی ہے۔ یہاں تک کہ اقبال نے قلندر کو اسرارِ حیات کا سرچشمہ قرار دیا ہے۔

عجم میں رقصِ درویشاں بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ جب درویش پر وجد طاری ہو جاتا ہے تو دھرتی کانپ اٹھتی ہے بشارتیں ٹپکتی ہیں۔ درویش پر ایسی سرمستی اور محویت چھا جاتی ہے کہ وہ الحاد اور شرک جو بھی ہو گزرتا ہے۔ یہ رقص، یہ طریقہ صدیوں سے یوں ہی چلا آتا ہے۔ چغتائی کی یہ تصویر ان حقیقتوں کا اظہار ہے جن کے نیچے معنی خیز اسرار اور انسانی جوہر پوشیدہ ہیں۔

تصویر کی تحریر بندی جس انہماک اور چابکدستی سے عمل میں لائی گئی ہے وہ مواد و ہیئت سے بلند ہے۔ بقول چغتائی تصویر کو دیکھنے اور بار بار دیکھنے سے ذہن کے دروازوں کے پٹ کھل جاتے ہیں اور تب کہیں جا کر فنی قدروں کی ندرت ہاتھ آتی ہے۔ اقبال کے قلندر کی افتاد اس کی خودسری میں مضمر ہے۔ چغتائی نے ان جوہروں کو شعلۂ عشق سے فروغ جاوداں بنا دیا ہے۔ انفرادیت کا یہ عالم ہے کہ قلندر جامع عمل بن گیا ہے۔ اس کی داخلی اور خارجی قوتوں کا اتصال ان صحرا نوردوں سے جا ملتا ہے جن کا دکھ درد اور ریاضت آج بھی انسانوں کے کام آ رہی ہے۔

قلندر کی نگاہ نگاہِ مرداں اور اس کا بیکراں جذبہ ان دشتوں کا پتہ دیتا ہے جہاں تمنائیں ان حدود سے بھی تجاوز کر جاتی ہیں جن کا افق کبھی نظر نہیں آتا۔ قلندر کا یہ جنون اس کا اپنا پیدا کردہ ہے۔ وہ اس وقت تک اپنے عصا کو گھماتا رہے گا جب تک وہ ان صحراؤں میں نہ پہنچ جائے جو اس کی تمناؤں کا حاصل ہیں۔ قلندر کے پس منظر میں کئی قلندر کئی درویش ہیں۔ وہ بادی النظر میں وہ نغمہ سن رہے جو ان کی خود اعتمادی سے پھوٹ پھوٹ کر نکل رہا ہے۔ یہ جہاد کے علمبردار انقلاب کے نعروں سے دنیا کو زیر و زبر کر کے دم لیں گے۔ چغتائی اپنی اس تصویر کو اس سرحدی پٹھان اور باز کی یاد دلاتا ہے جن کی آنکھوں کا سحر قلندر کی آنکھ میں چھپا بیٹھا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ ایسے فن کی نجات اسی مشرق میں ہے جس نے قلندر اور قلندری کو جنم دیا ہے ؎

قلندران کہ بہ تسخیرِ آب و گل کوشند
ز شاہ باج ستانند و خرقہ می پوشند

نظامِ تازہ بہ چرخِ دو رنگ می بخشند
ستارہ ہائے کہن را جنازہ بر دوشند

زمانہ از رخِ فردا کشود بندِ نقاب معاشران ہمہ سرمست بادۂ دوشند
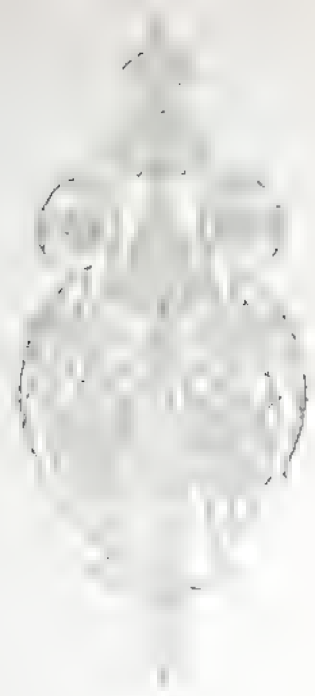
DANCE OF DARVESHES

In view of his lofty aim the artist has dexterously made rhythm in the movements of the Qalandars. In this picture the artist has so determined the space, in accordance with the principles of perspective that the temper of the Qalandars is one with its background. In the background every Qlandar is in movement and is himself swayed by the spiritual and pleasing atmosphere. The artist has enhanced the charm and beauty of the subject by his colour scheme. The composition of the picture is expressive. The faces of the Qalandars reveal the spiritual yearning with which Qalandar always dance. Chughtai has shown the extraordinary ability with which he has handled the masses of Darveshes in the background. You can note his pronounced liking for green colour which he has used affectively in the whole picture.

"LET THE TIDINGS OF THIS SECRET BE CARRIED TO THE KINGS,
THAT A WORLD CAN BE SUBDUED BY A SOUL-ENTHRALLING MELODY.
PRIDE NOT THYSELF OVER THY WEALTH, FOR IN THE CITY OF LOVE, THE HEART OF A MAHMUD IS NOT WORTH THE SMILE OF AN AYAZ.
ALL THIS PRIDE, TO WANT NOTHING; ALL HIS POSSESSIONS, TO HAVE NOTHING.
THE HEART OF A KING TREMBLES FROM A QALANDAR WHO WANTS NOTHING.

IQBAL

اخوّتِ ہلال

نتواں ز چشمِ شوقِ امید اے ہلالِ عید
از صد نگہ براہ تو دامے نہادہ اند

اقبال

اخوتِ ہلال

چغتائی نے ہلالِ عید کی روایت پر کئی تصویریں بنائی ہیں اور اس موضوع کے اظہار کے لئے ہر بار بڑا اچھوتا اور نیا انداز اختیار کیا ہے۔ ان تصویروں میں نہ صرف اس کا ابتدائی فن غالب ہے بلکہ اس کا تخیل بھی اس کے مستقبل کا پتہ دیتا ہے۔ اس کی ابتدا ہی شاندار آمد کا پتہ دیتی تھی۔ یہ تصویر مجموعی طور پر ان روایات کا حامل ہے جن پر کئی نظمیں اور تصویریں بنائی گئیں۔ یہ تصویر ایک معجزہ بھی ہے اور ایک شاہکار بھی جس میں روایات کی جامعیت کیساتھ سن پختگی کا پتہ چلتا ہے جسے فن کا معراج کہا جا سکتا ہے۔ تصویر کی اشخاص بندی اور ترتیبی اجزا کی طرف توجہ دی جائے تو اُس کے انہماک اور تخیل نے وہ راستہ اختیار کیا ہے جس سے کئی راستے اور شاہراہیں نکلتی ہیں اور فنکار کے رُجحانات کا بتدریج مطالعہ کرنے کا موقع حاصل ہوتا ہے۔

اخوتِ ہلال کا مطالعہ مختلف کرداروں اور مختلف زاویوں سے تکمیل پاتا ہے اور یُوں محسوس ہوتا ہے تصویر کا ہر کردار مخصوص انداز اور مخصوص خدوخال کا جویا ہے۔ سبھی جواہر ریزے اور نگینے ہیں اور ان کی الگ الگ قدر و قیمت اور اپنی اپنی جگہ ہے۔ اخوتِ ہلال میں مصور نے اپنے فن سے اپنے معاشرے سے اور ان روایات سے فرار نہیں کیا جو صدیوں سے ہماری زندگی کا جزوِ لاینفک بنی ہوئی ہیں۔ پھر اس یک جہتی کو یکجا کرنے کے لئے آرٹسٹ نے اپنے قلم اور رنگوں کے امتیاز کو کتنی مسرت آمیز مستیوں کے ساتھ استعمال کیا ہے۔ چغتائی کی مصوری کی جدت پسندی اور تجریدی قدریں اس کے سب و لہجہ، اسکے اسلوب اور اس کے بنائے ہوئے پیکروں کی ساخت سے پرورش پاتی ہیں۔ چاہے وہ کتنی ہی رومانی اور روایتی ہوں، جذبے کی کارفرمائی اور جمالیاتی تکمیل کی ذہنی صُورت ان میں پوری طرح ایکدوسرے سے ہم آہنگ ہوتی ہے۔

رویتِ ہلال کو آرٹسٹ نے مستقبل کی شکل میں جنم دیا ہے۔ ایک تسلسل کو اس نے داستانِ ہلال کی آمد میں سمو دیا ہے۔ یہ تو چہرے خاموش ہیں نہ متحرک، صرف ایک یکسوئی، ایک جستجو اور ایک تلاش ہے۔ ہلال کی آمد آمد ہے۔ وُہ ابھی ابھی ہر کروٹ کو دُنیا بھر کی مسرتوں سے مالا مال کر دیگا۔ سکوت ٹوٹ جائیگا۔ خوشی پیدا ہوگی اور انگ انگ میں دوڑ جائیگی۔ ہر پیکر کے لباس کی بندشیں اور حدیں کچھ اس انداز سے ایک دُوسرے سے ملتی چلی جاتی ہیں کہ تصویر کا تسلسل نفسِ مضمون کی اہمیت کو آگے بڑھاتا سُلجھاتا محسوس ہوتا چلا جاتا ہے۔ اس کے پیچھے صدیوں کی روایات اور اخوت کی داستانیں زندہ تابندہ کروٹیں لیتی نظر آنے لگتی ہیں۔ سکُوت ہے۔ یہ سکوتِ کامل ٹُوٹنے والا ہے۔ ہلال کا نظر آنا اور نظر آنے کی ہر آرزوئیں ہر چہرے پر تحریر ہیں۔ رنگوں کی ہم آہنگی اور اس کا سُہانا پن، جمالیاتی حُسن، تصویر کو دیکھتے دیکھتے جی نہیں بھرتا۔ ذہن یُوں منہمک ہو جاتا ہے کہ خود آفرینی جاگ اُٹھتی ہے۔ یہ ایک عمیق جائزہ ہے، ایک مؤثر مطالعہ ہے جس میں ہزاروں جلوے اور کیفیتیں کارفرما ہیں۔

بچپنے کی نادانیاں، بچپنے کی یادیں، عُمر کے تقاضے، عُمر کی سنجیدگیاں سبھی تاثرات کے ملنے جُلنے سے یوں محسوس ہوتا ہے کہ یہ گذری ہوئی داستانیں یادیں روشن ہیں اور یہی وجہ ہے کہ اقبال نے ہلالِ عید پر نظمیں لکھ کر اس کی اہمیت کو اور بڑھایا ہے اور اپنے محسوسات کا اظہار کیا ہے۔ ہر تصویر، ہر نقش، ہر خدوخال ان باطنی رشتوں کا پتہ دیتے ہیں جہاں اقبال کی نگاہوں نے ماضی کی نگہداشت سے، انسانی نشوونما کو بنیادی اصولوں کے قریب دیکھا ہے اور ارتقائی اصولوں کو زندگی کی ہر دلفریبی کا ذریعہ خیال کیا ہے۔

چغتائی نے ہلالِ عید پر جو پہلی تصویر بنائی وہ ۱۹۴۲ء کا واقعہ ہے۔ اس تصویر میں آرٹسٹ نے ایک معصوم بچی کو اپنی دادی سے جس کی آنکھیں چندھیا سی گئی ہیں، نویدِ ہلالِ عید کی سرگوشیاں کرتے ہوئے دکھایا ہے۔ اس تصویر میں بھی مضمون ویسا ہی ہے۔ مگر وُہ وقت نہیں آیا کہ پوتی دادی سے کہے "وہ دیکھو دادی اماں! چاند نکل آیا ہے"۔ آج بھی وُہی سماں ہے کہ دادی دُعا کے لئے ہاتھ اُٹھائے ہوئے ہے کہ اس کی پود پھلتی پھُولتی رہے۔

جمُود کو توڑنے سے نئی نئی قوتیں اور امکانات پیدا ہوتے ہیں۔ چغتائی نے ذہنی اُفتاد اور آرزوؤں کے پھلنے پھولنے کی جو راہ نکالی ہے اس میں بالیدگی اور توانائی پائی جاتی ہے ؎

تیری پیشانی پہ تحریر پیامِ عید ہے
شام تیری کیا ہے صُبحِ عیش کی تمہید ہے

سرگذشتِ ملّتِ بیضا کا تو آئینہ ہے
اے مہِ نو ہم کو تجھ سے اُلفتِ دیرینہ ہے

میری قسمت میں ہم آغوشی اسی رایت کی ہے
حُسنِ روز افزوں سے تیرے آبرُو ملّت کی ہے

اوجِ گردُوں سے ذرا دُنیا کی بستی دیکھ لے
اپنی رفعت سے ہمارے گھر کی پستی دیکھ لے

EID MESSAGE

This huge and large painting is one of the artist's early ambitious efforts. It also depicts the ancient tradition. It is a very impressive study. The seated old graceful lady with youngsters of the family around her looking and watching the Eid Moon, present a beautiful scence. Realism which characterizes the painting of Chughtai come near to the feeling of the festival.

"FROM THE CELESTIAL HEIGHTS, SEE AWHILE THE ABODE OF THIS WORLD!
FROM THE HEIGHT, SEE THE LOWLINESS OF OUR HOUSE!
SEE THE CARAVAN AND WATCH THEIR LIGHTING SPEED;
AND WATCH AS WELL AS THE WARY TRAVELLERS DISGUST FOR THE MANZIL.

IQBAL

بے پروا احترام

کیوں تعجب ہے مری صحرا نوردی پر تجھے
یہ تگا پوئے دمادم زِندگی کی ہے دلیل

اقبال

بتِ غزال
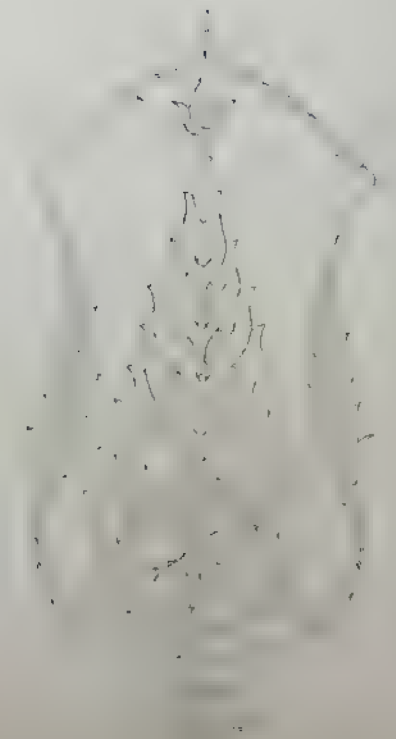
ایسا معلوم ہوتا ہے زندگی تسلسل اور جدّوجہد کا ایک لامتناہی سلسلہ ہے جس کی ابتدا اور انتہا ایک ہی ہے۔ آہُو نے انَا اور خود اعتمادی کے انداز میں گردن کچھ اس طرح بلند کر رکھی ہے جیسے کائنات کی تخلیق کے بعد اس کی یہ پہلی جُست ہے جو بے پروا خرامی کے سانچے میں ڈھل رہی ہے۔ زندگی اور آہو دوش بدوش ان صحراؤں میں چلتے رہیں گے۔ غیر مرئی آہٹوں کا پیچھا کرتے رہیں گے جب تک کہ وُہ اپنے مقصود کو پا نہیں لیتے۔

اقبالؒ نے زندگی کے تازہ بتازہ، نو بہ نو رہنے کی آرزو کی ہے۔ یہ فضا اور یہ ماحول جس میں چغتائیؒ نے آہُو کو جنم دیا ہے تمنّاؤں کے ڈھلتے ہوئے سائے نہیں۔ یہ اُن لازوال قوّتوں کے مظہر ہیں جو قُدرت نے انسان کے ذہن پر کچھ اس طرح مسلّط کر دی ہیں کہ وُہ ہر گھڑی یہ دُہراتا رہتا ہے کہ ہر دم جوان ہے زندگی۔ زندگی کی حرکتیں اور تسلسل، کوہکن اور تیشہ و سنگِ گراں اور جُوئے شیر سب دوام زندگی کی علامتیں ہیں۔ تخلیق اور ذہنی وسعتوں کا بے کراں سمندر موجیں مارتا، اُچھلتا کُودتا، جب ایک جست سے دُوسری جست کی طرف قدم بڑھاتا ہے تو بے کرانی سے ہمکنار ہوتا ہے۔ انسان اپنی ذمّہ داریوں سے تھک کر جی نہیں ہار بیٹھتا، بلکہ آہُو کی مانند بے پروا خرام چلتا رہتا ہے۔

چغتائیؒ کی اس تصویر کا مفہُوم لق و دق صحرا کی چھان بین، جدّوجہد بھی ہے اور افق اور شفق بھی۔ جن سے زندگی میں کبھی جمُود پیدا نہیں ہوتا۔ اس نے اپنی اس تخلیق کے لئے ایسے رنگوں کا انتخاب کیا ہے جن میں رُوح کی بالیدگی، کسک اور ولولے ہیں۔ جو ہمیشہ چنگاریوں کی مانند سُلگتے رہتے ہیں۔ زندگی کی جدّوجہد کے لئے، جینے کے لئے یہ آہُو یُوں ہی فراٹے بھرتا رہے گا۔ اور انسانوں کی طرح صحرؤں کو ناپتا رہے گا۔ جب تک زندگی زمان و مکان کی حصار بندی سے آزاد نہیں ہو جاتی اور اُسے سنگِ میل کا سُراغ نہیں مل جاتا۔

زندگی کی سرمستیوں میں رُوحانی اور وجدانی قوّتیں یُوں ہی آپس میں ٹکراتی رہیں گی۔ رنگ و خط تخلیق کے جنوں میں بصیرت اور جسارت کا اظہار کرتے رہیں گے۔ فن کا ارتقا، زندگی کی بڑھتی ہوئی قدروں سے اپنے معیار کی طرف قدم بڑھاتا رہے گا۔ تخلیق کے دوام کے لئے تأثر اور فضا بندی تصویر کا جُزوِ اعظم ہے۔ حرکت و اضطراب رنگوں کی لطافت اور امتزاج سے زندگی حاصل کر رہے ہیں۔

چھوٹے چھوٹے جھاڑوں اور خشک تن درختوں میں جمالیاتی حُسن اور توانائی ہے۔ اور وُہ زوال کا مقابلہ بڑی بے نیازی سے کر رہے ہیں۔ یہ ان وسعتوں کا اور اس قلندرانہ زندگی کا جائزہ ہے، جہاں آہو کھڑا ہو کر فن کار کی فن کارانہ سُوجھ بُوجھ

کی نشاندہی کرتا ہے۔ اقبال نے انسانی زندگی کا یہ زندہ تصور ایسے مظاہر کی مدد سے بیان کیا ہے جن کے گرد یہ زندگی جاوداں اور رواں دواں نظر آرہی ہے۔ ان بخششوں اور نعمتوں کے لئے جو خدا کی طرف سے اسے حاصل ہیں۔

چغتائی کے بعض شاہکار موضوع کے لحاظ سے ایسے ہیں کہ اس نے ان میں پہلے سے دُور ہٹ کر ایک دُوسری انفرادیت کا اظہار کیا ہے بیگانے بیگانے، اچھوتے اچھوتے کچھ اس انداز سے کہ وُہ خود کا امتحان کر رہا ہے۔ اِس تصویر کا رنگ رُوپ جو ہے وہ تو ظاہر ہے مگر اس کی تکنیک کا ایک روپ وُہ ہے کہ نقوش سطحِ زمین سے لہروں کی مانند پھیلتے اور سُکڑتے معلوم ہو رہے ہیں۔ رنگوں کا رچاؤ پختگی کا حامل ہے۔ اور آہو اس لق و دق میدان میں ایک جوہر ہے جس کی جولانیاں اور توانائیاں زندگی کی جولانگاہ کو کبھی اس کے شعور سے اِدھر اُدھر نہ ہونے دیں گی ؎

ریت کے ٹیلے پہ وُہ آہُو کا بے پروا خرام
وہ حضر بے برگ و ساماں وُہ سفر بے سنگ و میل

مگو از مُدعائے زندگانی
ترا بر شیوہ ہائے اُو نگہ نیست
من از ذوقِ سفر آنگونہ مستم
کہ منزل پیشِ من جز سنگِ رہ نیست

پُختہ تر ہے گردشِ پیہم سے جامِ زندگی
ہے یہی اے بے خبر رازِ دوامِ زندگی

وادیٔ کُہسار میں غرقِ شفق ہے سحاب
لعلِ بدخشاں کے ڈھیر چھوڑ گیا آفتاب

ELEGANTLY WALK

This is very wide and expressive application as to provide guidance for all freedoms of life. Chughtai has painted this picture in the form of a landscape with a gizal. As the gizal stands just like sweeping and running power from the East to West and South to North. He feels no restriction to his liberty.

The colour scheme of this picture gives an idea of an endless journey, and expresses the idea of an endless world. The desert, the kingdom of God with all co-operation on the earth can provide existence to every one.

"HOW PLEASANT IT IS TO MAKE LIFE A CONTINUOUS STRUGGLE,
TO MELT WITH A SINGLE BREATH THE HEART OF THE MOUNTAINS, THE FOREST AND THE DESERT!
I AM ALL AN IMPERFECT BURNING 'ALL A PAINFUL LONGING
I GIVE AWAY CERTAINTY FOR DOUBT AS I AM THE VICTIM OF A CEASELESS QUEST!

IQBAL.

رمز حیات
گمان مبر که بپایان رسید کار مغان
هزار بادهٔ ناخورده در رگ تاک است
اگر ز رمز حیات آگهی مجوی و مگیر
دلی که از خلش خار آرزو پاک است
چمن خوش است ولیکن چو غنچه نتوان زیست
قبای زندگیش از دم صبا چاک است
بخود خزیده و محکم چو کوهساران زی
چو خس مزی که هوا تیز و شعله بی‌باک است
اقبال

اِنسان اور شیطان

غرق اندر رزمِ خیر و شر ہنوز
صد پیمبر دیدہ و کافر ہنوز

اقبال

انسان اور شیطان

فراعنۂ مصر کے ایوانوں اور معبد خانوں میں ہر تحریک شیطانی اور مُشرکانہ تھی۔ یہ ایک ایسا مقام ہے جہاں ایمان متزلزل ہو جاتا ہے اور انسان خود اپنی خودی کا شکار ہو کر خُدا بن جاتا ہے۔ فرعون کہلانا اور خُدا بن جانا، نسائی عفت کے برعکس اور شیطانی عنصر کے عین مطابق ہے۔ صدیوں تک انسان خود کو بہکاتا رہا بخشش اور دُعاؤں کو بے کیف، بے رنگ و بُو کہہ کر اپنے آپ کو وسوسوں میں ڈستا رہا اور ان آرزوؤں کو اپناتے اپناتے ان معبد خانوں میں جا پہنچا جو اس کے اپنے آباد کیے ہوئے تھے۔ جہاں زندگی کا شور و شر اپنے پُورے عروج پر تھا۔ نفس پرستی اور ذہنی کیفیات کا یہ عالم تھا کہ انسان ہر شگفتگی اور بغاوت کو اس غلامی کے نام سے بلند کرنے لگا جو اُس نے ازل سے خدا کی خُدائی میں، اطاعت کی صورت قبول کر لی تھی۔

اِنسان اور شیطان کی یہ مجازی تصویر حکمت آموز اور گرہ کُشا ہے۔ ہو سکتا ہے آرٹسٹ نے اپنی تخلیقی قُوتوں کا جائزہ اقبال کے تصورات کی روشنی میں یوں لیا ہو اور ایک ایسی جُستجو کا پیچھا کیا ہو جو شیطان اور انسان کے درمیان ایک اضطرابِ مسلسل کی صُورت اختیار کر چکا ہے۔ انسان کی ذمہ داری اور شیطان کی خود اعتمادی پرکھی جائے تو بندے کی بندگی اس مسلسل جُستجو کا پیچھا کرتی رہی ہے جس کی تکمیل کی خاطر شیطان نے ہر بار اپنی فطرت کا مظاہرہ کیا اور شیطنت کے عنصر کو اس طرح اُچھالا کہ پتھروں کے خداؤں کا شور و شر اور ہنگاموں کا نظم و ضبط انسان کی سرشت بن جائے۔ اس کا وجود ابھی تک اپنے محور کے گرد چکر کاٹ رہا ہے۔ یہی ایک نقطہ ہے اور یہی ایک تاثر کہ یہ تصویر بحث اور تنقید کا بڑا اچھوتا موضوع نظر آتی ہے۔ اسکے پیچھے صدیوں کی تاریخ، بنی اسرائیل کی داستانِ حیات، فراعنۂ مصر کے ادراک اور شعور کے نقش پوشیدہ ہیں۔ فراعنۂ مصر کی بدعنوانیوں اور دعووں نے وادیٔ نیل کا رنگ بدل دیا تھا اور نیل کی سرزمین پر خیر و شر کی جنگ لڑی گئی تھی۔ اس وقت کے فنکاروں نے اپنے آقاؤں کو استحکام اور ثبات بخشا تھا۔ فراعنۂ مصر کے لافانی اور پُر شکوہ مجسّمے اس تہذیب کے استبداد کی یاد دلاتے ہیں جہاں غُلاموں کی بصیرت کا امتحان بغیر کسی کشمکش اور نصب العین کے لیا گیا تھا۔

اِس تصویر کا فنّی مواد اور اس کی ہیئت علاّمہ اقبالؔ کے اس تصورِ ابلیس کی غمّازی کرتی ہے کہ انکار اور خود پرستی سے انسان کے کردار نے کیا صُورت اختیار کی اور شیطانوں نے مل کر خُدا کی خُدائی میں اُس کے بندوں کے اعتماد کو کس طرح کچلا۔ چغتائی نے ان کیفیات اور تاثرات کی اثر آفرینی دیکھی ہے اور ان معبد خانوں کا ماحول بھی جنہیں خدائے دو جہاں نے دُنیا کی ہر نعمت سے مالا مال کیا، سرفرازی دی اور حُکمرانی بخشی۔ آج بھی کروڑوں انسان کی اس عظمت اور فنی قدروں کو دیکھنے آتے ہیں جنہوں نے پیغمبروں کی تلقینِ تبلیغ اور مرتبے کو جان بُوجھ کر جُھٹلا دیا تھا۔ جو جوہر تخلیقی محرکات سے پھُوٹ نکلے تھے

ان کو دیکھ کر کہنا پڑتا ہے کہ ان پتھروں کے خداؤں کو تراشنے والے زندہ خدا تھے۔

جب تک انسان اور شیطان کی کش مکش جاری ہے خیر و شر کا تصادم بھی جاری ہے۔ چاہے انسان کی نگاہوں میں فرعون کی عظمت اور اُس کے دعووں کا اعتراف نہ ہو، فن کاروں کے فن اور اُنکی عظمت کا اعتراف نہیں کیا جا سکتا۔ اُن کے لئے اس کے سوا کوئی رستہ نہ تھا کہ وہ اس موضوع پر عظمتِ آدم اور شیطان کی ترغیبات کی عمارت کھڑی کرتے جن سے سوچنے سمجھنے کی راہیں کشادہ ہوتیں، آرزوئیں ارتقار کی منزلوں کو چھو سکتیں اور ان کاوشوں کو پرکھ سکتیں جن سے اقبال کی ہم نوائی اور رمز شناسی ہاتھ آتی۔

شیطان کی پکار در اس کے متزلزل ارادوں سے تنگ نظری جاتی رہی۔ یک ایسا آہنگ بلند ہوا جس سے ہیئت اور مواد کا سوال اُٹھ کھڑا ہوا۔ تکنیک نے حیرت انگیز طور پر ذہنی کشمکش کو سہارا دیا اور انسان ایسی دریافت کی طرف رجوع ہو گیا جس میں اس کا اپنا بھلا تھا۔

تصویر میں عورت کیوں جھکی ہے۔ ننگ دھڑنگ آدمی بوجھ تلے دبا جا رہا ہے۔ یہ نیابت خدا کی منشا کے عین مطابق ہے کہ انسان استعجاب سے اپنی فضیلت کا بوجھ اُٹھائے ہوئے ہے و رحُسن بار استعجاب سے جُھک گیا ہے ؎

نعرہ زد عشق کہ خونین جگرے پیدا شُد
حُسن لرزید کہ صاحب نظرے پیدا شُد
فطرت آشفت کہ از خاکِ جہانِ مجبور
خود گرے، خود شکنے، خود نگرے پیدا شُد
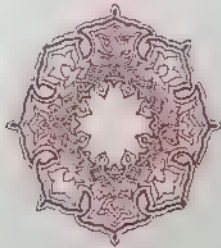
فراغت دے اسے کارِ جہاں سے
کہ چھُوٹے ہر نفس کے امتحاں سے
ہُوا پیری سے شیطاں کُہنہ اندیش
گُناہِ تازہ تر لائے کہاں سے

MAN AND SATAN

Chughtai's individual way of using colours, of course, depends on his great skill and power. He always controls the flat and gradation of the colours. He has control on his brush, lines and colours and command on the treatment. As a matter of fact, the artistic control and freedom from conventions means that there must be organisation and strong sense of rhythm of lines and colours in the picture. He is so far from that period in which his own spirit, unusual creative emotion, virtue of the inner emotion, growth of his art, touch the newmood.

Chughtai's supreme imaginative power shows his deep emotion. As he gives a very unusual touch to his paintings, we find new trends with such a mastery of his emotion and imaginative power.

"TO THE LORD OF THE UNIVERSE THE DEVIL SAID:
A FIREBRAND ADAM GROWS, THAT PINCH OF DUST
MEAGRE-SHOULD, LAUM OF FLESH, IN FINE CLOTHES TRUSSED,
BRAIN RIPE AND SUBTLE, HEART NOT FAR FROM DEAD.

IQBAL.

جنرل طارق

تنے پیدا کُن از مُشتِ غبارے
تنے محکم تر از سنگیں حصارے

اقبال
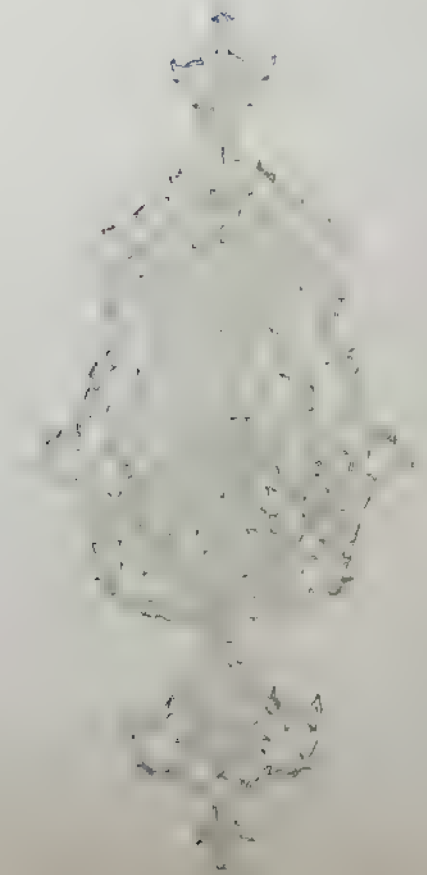
جنرل طارق

اگر ماضی کی عظمت اور برکتوں سے اپنے امروز کو ناپا جائے تو فردا کی ہر تخلیق زندگی کی رمز شناسی سے اپنی وحدت کا ثبوت دیتی ہے اور نظامِ حیات میں ان تو ہین کا درجہ اس ارتقاء سے جا ملتا ہے جن سے ہم وابستہ رہے اور چاہتے رہے کہ تاریخِ انسانی میں ہماری انفرادیت کا بھی کوئی درجہ اور مقام ہو اور اس مقام کا رشتہ ان انفرادی شخصیتوں سے جا ملے جن کے کارناموں نے ہماری گردنوں کو بلند ہونے کا موقع دیا۔ چغتائی نے انفرادی طور پر یہ تصویر کچھ اس طرح اختراع کی ہے کہ کچھ دیر کے لئے داخلی توازن کو سہارے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ ویسے تو فن کی دنیا میں فنکاروں کی کئی قسمیں ہیں پھر بھی انسانیت کی تشکیل اور روح کی بالیدگی کے نقطۂ نظر سے دو مختلف صورتیں بڑی اہمیت رکھتی ہیں۔ ایک وہ جو مذہبی نقطۂ نگاہ سے زندگی کے بعض پہلوؤں پر روشنی ڈالتے ہیں اور ایک وہ جو تصورات حیات کو اپنی بصیرت سے اُجاگر کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کی کبھی مشابہت مذہبی رنگ سے بہت مختلف ہوتی ہے اور انہیں ہم پہلی نظر میں اپنا مطمحِ نظر نہیں بنا سکتے۔ چغتائی سے جب کبھی ایسی تصویروں کے متعلق پوچھا جائے تو وہ اکثر چپ ہو جاتا ہے۔ وہ یہ کہتا ہوا محسوس ہوتا ہے کہ میرا کام تصویریں بنانا ہے، تصویروں میں رنگ اور جذبات بھرنا ہے، انہیں مسرتوں کا حقیقی سرچشمہ بنانا ہے۔ یہ تسخیرِ فطرت، یہ قلندر، یہ گُلِ خنداں، یہ قطع و برید، یہ تشخیص، اقبال، غالب اور عمر خیام، یہ سب چیزیں میرے لئے ایسے راستوں کا تعین ہے جن سے مطالعہ نگار تخلیق کی تشکیل کے قریب تر ہو سکے جیسے محسوس کر کے یوں محسوس ہوتا ہے۔ چغتائی کسی مخصوص تصویر کا نام لینے اور تفصیل بیان کرنے سے عاری ہے۔ وہ ہمارے ذوقِ نظر اور بصیرت سے جواب طلب کر رہا ہے۔ آخر میں نے کیا نہیں کیا، اور کیا ہے جو میرے پیشِ نظر نہیں، سوائے اس مقصد کے ثقافتی قدریں پرورش پاتی رہیں اور ان کے پھلنے پھولنے کے ذرائع ہاتھ آتے رہیں تاکہ ہماری تہی دستی باعثِ ندامت نہ ہو۔

چغتائی نے طارق کی تصویر ایک شبیہ کی صورت نقش کی ہے، اور اس سے اس کا مقصد اس حقیقت اور پس منظر کو زیادہ سے زیادہ روشناس کرانا ہے جس سے مجاہد طارق کی ذہانت اور اس کی غیر معمولی بصیرت پر روشنی پڑتی ہے۔ جو کچھ اس نے پیشِ نظر رکھا ہے اس سے تاریخی حیثیت سے اس کی اہمیت بہت بڑھ جاتی ہے۔ یہ تصویر یوں تو دیکھنے میں بڑی سادہ ہے مگر اس میں فن کار کے فنی انہماک کا ارتعاش اس شدت سے بھرا پڑا ہے کہ اس کا یہ شاہکار فنی افتخار کے علاوہ قومی افتخار کا سرچشمہ بھی ہے۔ وہ ان واقعات کی یاد دلاتا ہے جنہیں تاریخ نے کبھی فراموش نہیں کیا۔ اس کے عناصرِ ترکیبی میں وہ دائمی جذبہ اور عمل جراَت بھی ہے جس سے طارق کے عمل، اس کی عظمت کا جلال و جمال ان حقیقتوں کے پس منظر میں نمایاں ہے جن سے ارتقاء کی تکمیل ہوئی تھی۔ جوں جوں مطالعہ کے تسلسل کو بڑھایا جائے خیالات کا سلسلہ اس کی شخصیت سے ہم آغوش ہوتا چلا جاتا ہے اور

آنکھ یہی دیکھتی چلی جاتی ہے کہ وُہ کیوں اپنی انفرادیت سے ہمارے دلوں پر صدیوں سے حکومت کر رہا ہے۔ طارق کا کردار آج بھی اس بات کا آرزومند ہے کہ ایک بار پھر وُہی والہانہ وارفتگی پیدا ہو۔

چغتائی نے تصویر کو زیادہ اہمیت دینے اور اسے عرُوج پر پہنچانے کے لیئے جو استعارہ تلاش کیا ہے وُہ تاریخ اور واقعات کا جزو ہے۔ مجاہد کو تاریخ کے ان واقعات میں سے گُذرنا پڑا اور اُس نے اپنے اعتماد و ذہانت سے تاریخ کا رُخ بدل ڈالا۔ اُسے ایسے نازک واقعات سے دوچار ہونا پڑا جنہیں تاریخ پھر کبھی نہ دُہرا سکے گی۔ اور اس لیئے دُنیا اس کے عمل کی عظمت کو کبھی فراموش نہیں کر سکے گی

عجمی تصورات، قنوطیت کی مُوشگافیاں اور عمل کی دل آویزیوں میں ہمیشہ ایک جذبہ کارفرما رہا ہے۔ افکار کے حریری پردوں میں مردِ کامل کو بھی ٹھوکروں پر ٹھوکریں لگیں اور مدہوشیوں نے جلال کی دولت لُٹانی شرُوع کر دی۔ چغتائی کا پیغام اگرچہ عجمی کا ایک انقلاب انگیز کرشمہ ہے مگر اس کی تصویروں میں نہ وُہ مُوشگافیاں ہیں اور نہ وُہ خواب آور نشاط۔ سعی طرزِ نگارش اور رجائیت معاشرے کی عمارت کو استوار کرتی رہے گی اور آرٹسٹ کی خود اعتمادی اس کو بلند سے بلند تر کریگی ؎

طارق چو بر کنارۂ اُندلس سفینہ سوخت
گفتند کارِ تو بہ نگاہِ خرد خطاست

دُوریم از سوادِ وطن باز چُون رسیم
ترکِ سبب زرُوئے شریعت کجا رواست

خندید و دستِ خویش بہ شمشیر برد و گُفت
ہر مُلک مُلکِ ماست کہ مُلکِ خدائے ماست

GENERAL TARAQ

Chughtai is the artist, etcher, designer, and a talented writer. His spirit revealed in this picture is not keeping with the subject, but becomes apparent when he realises the real spirit of the subject and the character. His explanation and masterly drawing fully justifies its historical subjects and the characters. There is no question of painting, etching and writing. It is often discernible and describable by his insight by introducing even the historical subject.

General Taraq was great soldier, his name is alive for his great remarkable military achievement in Jibraltar.

It is not surprising to find a man of such a bold type. The creation of this figure is the delicate touch of art. General Taraq will always remain alive as a man of dignity, and this picture of General Taraq will be associated with Chughtai, the artist.

"WINDS OF THESE WATERLANDS BE YOUR LOVE!
BOKHARA, DELHI, ARE WORTH NO MORE. LIKE RUNNING WATER
GO WHERE YOU WILL: THESE DESERT PLAINS ARE OURS AND OURS ARE THESE VALLEYS.

IQBAL

رُخِ زیبا

اے پیکرِ گل کوششِ پیہم کی جزا دیکھ

اقبال

رُخِ زیبا
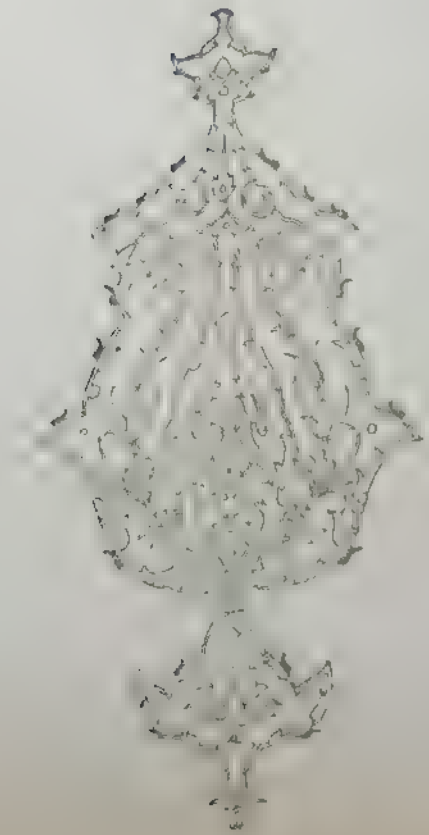
چغتائی سے جب بھی سوال کیا جائے کہ وُہ کس تحریک اور کس آرٹسٹ سے متاثر ہے تو اس کا نہایت پُرتکلف جواب یہ ہوتا ہے۔ نقادوں اور لکھنے والوں کا یہ دستور ہے کہ وُہ نجوم و رمل جاننے والوں کی طرح آرٹسٹ کے ماخذ کے متعلق پیشین گوئیاں کریں۔ حالانکہ نقّاد اور مبصّر کا کام ہے کہ وُہ اپنی بصیرت سے جانچے اور تولے کہ آرٹسٹ کس تحریک اور کس طرزِ نگارش کا حامل ہے اور اس کے فن کی عمارت کن بُنیادوں پر استوار ہے۔ ہو سکتا ہے کہ مَیں نے کسی بدترین آرٹسٹ سے اپنے آرٹ کا مواد جمع کیا ہو۔ یا کسی عظیم فن کار نے مجھے کچھ کا کچھ بنا دیا ہو۔ لیکن میرا ضمیر شرمندہ نہیں۔ میرا فن منّت کشِ ساقی نہیں کہ کوئی نام لے سکوں۔ کیونکہ علامہ کا ایک شعر سہارا دیتا چلا آیا ہے ؎

تقلید کی روش سے تو بہتر ہے خودکشی
رستہ بھی ڈھونڈ خضر کا سودا بھی چھوڑ دے

چغتائی کا ثقافتی ورثہ وسیع ہے۔ اس میں فن کے جینے کا ہر سامان مہیا ہے۔ رُوحانی، اخلاقی، اور فنّی سب کچھ اپنا ہے۔ اُسے رونا ہے تو یہ ہے کہ فن کار تو فن کا۔ رہا ہمارا بڑے سے بڑا شاعر اور نقّاد بھی کورانہ ذوق کا نمائندہ ہے شعر کیساتھ تصویر کو سمجھنے کی کچھ سُدھ بُدھ ہو تو تصویر کی ہیئت بدل جاتی ہے اور شعر بھی اپنے معنی کی کروٹ بدل لیتا ہے۔ چغتائی نے ایک موقع پر صُوبے کے بڑے کالج کے طالب علموں کو خطاب کرتے ہوئے کہا تھا۔ تصویریں دیکھا کرو اور بار بار دیکھا کرو۔ اس موقع پر ایک عظیم شاعر بھی موجود تھا۔ وُہ مُسکرایا۔ چغتائی نے بھانپتے ہوئے کہا۔ تمہاری غزلیں اور نظمیں حُسن کر جسارت اور ندرت بھرا تی ہے۔ مگر دوست تمہاری مُسکراہٹ سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ تصویریں دیکھتے وقت تمُہارے رُوکھے سُوکھے چہرے پہ اتنا بھی تغیر ظاہر نہیں ہوتا کہ میں محسوس کروں تُم نے کوئی تصویر دیکھی ہے یا شعر کہنے والا تصویر کی کلّی دلکشی سے بھی بہرہ ور ہے۔ بس تم بھی تصویریں دیکھا کرو اور بار بار دیکھا کرو۔

تصویر رُخِ زیبا جمالیاتی حُسن کا ایک ایسا کامیاب اور سنجیدہ پیکر ہے جس کی تکمیل کو فن کی صلاحیتوں نے الہام کے قریب تر کر دیا ہے۔ کبھی یہ حسن میٔ آغوش سے نکل کر مچل جاتا ہے۔ اور کبھی یُوں سمٹ آتا ہے کہ اس کے اعتراف کا بھی یقین نہیں ہوتا۔ آرٹسٹ نے پیکر کی تعمیر کے سہارے رنگوں کا ایک ایسا حصار کھڑا کر دیا ہے کہ پہروں سوچنا پڑتا ہے کہ چغتائی نے کن اثرات کے تحت تخلیقی پیکر کا سایہ ثقافتی موضوع اور ذہنی رنگ و بُو میں ڈھال دیا ہے کہ واقعات کی روشنی میں ایک نیا شاہکار بن گیا تخلیق کے ہر گوشے سے غمزہ و ادا سے، لوچ لچک سے، آرٹسٹ کے اشتیاق کا پتہ چلتا ہے۔ یہ تصویر اس کی اُن چند

تصویروں میں سے ایک ہے جس میں اس کی ذہانت، اس کا کمالِ فن اور اس کا مصوّرانہ تخیّل اپنے پورے عروج پر ہے۔

چغتائی کی یہ تصویر ایک غزل ہے، ایک نظم ہے۔ وہ ایوانوں میں رہنے والی محبوبہ اپنی وجدانی کیفیات میں درجہ بلند ہے کہ ایک ایک خم اور قوس پر آرٹسٹ کی عظمت کا اعتراف کرنا پڑتا ہے۔ رُخِ زیبا کی ہیجان انگیز صداقت ان کا شعور ریاضت سے بھرپور ہے جس میں اس کا ماضی مستقبل اور حال وسعتوں میں انگڑائیاں لیتا دکھائی دیتا ہے۔ خوش آہنگ پھول ان کے حلاوت سے بھرے ہوئے رنگ، رقص سے معمور فضا، معطر ہوائیں اور برگِ گل کی ضیا پاشیاں، فرحت و انبساط سے لرزاں دلکش پیکر۔ وہ فطرت کا رازدار نظر آتا ہے۔ چغتائی کتنا جامع اور کتنا بلند فن کار ہے جس کا مذہبی، اخلاقی اور ادبی نظریہ کس قدر بلند ہے۔ عورت جب اس کے تخیل کی ترجمانی کرتی ہے اور وہ اس کے خطوں سے زندگی حاصل کرتی ہے تو اس کا پیکر عام سطح سے بلند ہوجاتا ہے۔ رنگوں کی جہاں بانی، زندگی کی تابانی اور شباب آور توانائی، تہذیب کی عظمت کا مسلک بن جاتی ہے۔ تصویر کا حُسن محض رُخِ زیبا تک ہی محدود نہیں۔ وہ ایک ایسا ستون بھی ہے جس پر ہماری عمارت استوار ہے منقش دیوار، منبت کاری اس کا استعمال کتنا ولولہ انگیز ہے۔

اقبال کو رُخِ زیبا کے لئے چراغ بھی نہ ملتا تھا چغتائی نے مشرقی رنگ و بو میں ڈوب کر دو سمتی سہ سمتی شکلوں کو تصویروں میں دیواروں پر پس منظروں میں کچھ اس طرح سمو دیا ہے کہ صدیوں کے تجربات جو عقل اور سائنس کے تضاد نے ختم کردئے تھے پھر اُن کا استعمال ہونے لگا۔ تجریدی شکلوں میں بین الاقوامی جذبہ اس کا ہمنوا ہے اور اسے سکا رُخِ زیبا مل گیا ہے ؎

آنچہ در بزمِ شوق آوردہ ام دانی کہ چیست
یک چمن گل، یک نیستاں نالہ، یک خم خانہ مے

بہارِ قافلہ و لالہ ہائے صحرائی
شرابِ مستی و ذوق و سرور و رعنائی
نگاہ ہو تو بہائے نظارہ کچھ بھی نہیں
کہ بیچتی نہیں فطرت جمال و زیبائی

EVE OF THE FUTURE

This type of painting is a purely romantic subject in colour and lines. The artist is able to describe the character of the lady which is essentially romantic. The rhythmical pose brings to mind the glory of classical music. This subtle music and rhythm is very difficult to produce in a passionate mood.

This is a musical tune of Chughtai, in simplicity of colours and lines. Picture has been depicted with full confidence.
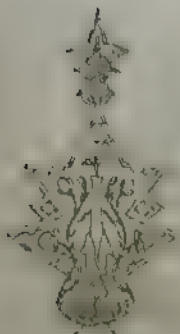
"THE MARTYRS OF LOVE ARE NOT MUSLIM NOR PAYNIM.
THE MANNERS OF LOVE ARE NOT ARAB NOR TURK !
SOME PASSION FOR OTHER THAN LOVE WAS THE POWER
THAT TAUGHT GHAZNI'S HIGH RULER TO DOTE ON HIS SLAVE.

IQBAL

اسحاق موصلی

نہ ہو جلال تو حُسن و جمال بے تاثیر
نرا نفس ہے اگر نغمہ ہو نہ آتش ناک

اقبال
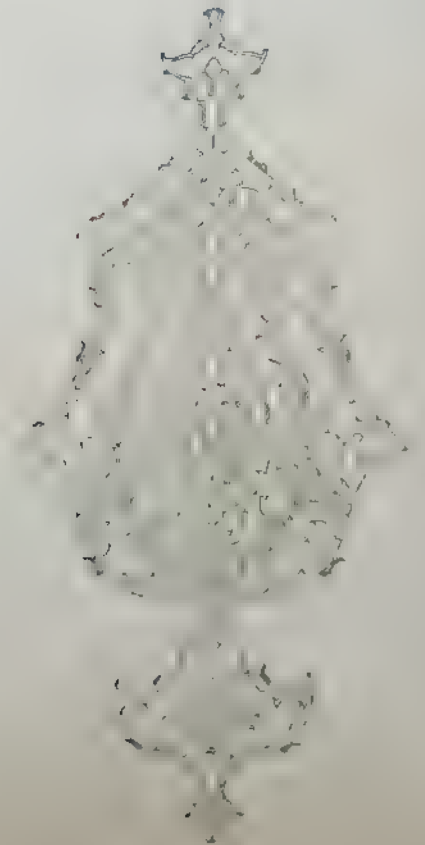
اسحاق موصلی

یہ تصویر ایک موسیقار سے منسوب ہے جس نے اپنے زمانے میں ایک ناقابلِ تسخیر فضا اور غیر فانی شہرت حاصل کی، اس کے کمالِ فن سے بادشاہوں اور دانشوروں نے وُہ فیضان پایا کہ وہ اپنی سرمستیوں کو اس کی صلاحیتوں سے جُدا نہ کر سکے۔ اسحاق موصلی اپنے زمانے کا مجدّد اور اپنے کلچر کا ایک مضبوط ستون تھا۔ وہ جعفر برمکی کا پروردہ اور قدرشناسی کی ایک دستاویز تھا اس نے اپنی ریاضت اور کمالِ فن سے دُنیا کو حیرت میں ڈال دیا تھا۔ جعفر برمکی نے بھی قدر و منزلت اور ہُنر شناسی کی وُہ راہیں نکالیں جس کا جواب آج بھی دُنیا کی تاریخ کے پاس موجود نہیں۔

اقبال ہو یا چغتائی انہیں کردار کی پختگی سے والہانہ عشق ہے دُنیا کا کوئی دور کردار سے خالی نہیں۔ دُنیا کرداروں کی جامعیت سے آباد چلی آ رہی ہے۔ جب تک کرداروں کی صلاحیتوں کے تقاضے زندہ ہیں یہ دُنیا اپنے محور پر کھڑی ہے اور انسان کبھی اپنی ذمّہ داریوں سے سبکدوش نہ ہوگا۔ چغتائی نے اسحاق موصلی کی یہ تصویر بنانے میں بڑے تخیّل اور ذہانت سے کام لیا ہے۔ اس کی طرزِ نگارش کی جدّت طرازیوں اور اسلوبِ فن نے اس صداقت کا ساتھ دیا ہے جو ایک موسیقار کے سچّے کردار کا سراپا ہے۔ اس کا یہ شاہکار ہمیشہ اس کے فن کی برتری کا تقاضا کرتا رہیگا۔ دیکھا جائے تو یہ تصویر ان ضرورتوں کا بھی احساس ہے۔ جو کلچر کی پرورش کیلئے ہمیشہ اس کے مدِنظر رہی ہیں۔ یہ ضرورتیں ہی اس کے ماضی کے روشن پہلوؤں میں ولولے پیدا کرنے میں معاون اور مددگار رہی ہیں۔ یہ ضرورتیں ہمیشہ سے اقدارِ حیات سے رُونما ہوتی رہیں اور فن کار قدرشناسی سے اسے جلا پر جلا دیتے رہے۔ اُنھوں نے ارتقاء کی وُہ راہیں ڈھونڈ نکالیں جو وقت کی صداقتوں کے پہلو بہ پہلو نشاۃ الثانیہ کا درجہ رکھتی ہیں۔ کمالِ فن کی یہ پیداوار آج بھی تہذیب و تمدّن کی علامت ہے۔

بربطِ موصل کا دور موصلی بربط کا ہم نوا ہے۔ اور یہ ابدی لے اسحاق موصلی کی شخصیت اور اسکے فن کا طرۂ امتیاز ہے۔ اس کا استغراق یوں نظر آتا ہے جیسے زندگی کا آہنگ اخلاقی طور پر زندگی کی جنبشوں سے کبھی جُدا نہیں ہوا۔ اور موسیقی کسی نہ کسی رنگ میں معاشرے کے تقاضوں سے وابستہ رہی ہے۔ برسرِ اقتدار طبقے کی زندگی اور اس کا ولولہ انگیز تناؤ رومانی اور رُوحانی طور پر محفلِ نشاط کی زندگی کا سامان ہے۔

ہر حسین منظر اور پُر رومان داستان زندگی کے کیف کے بغیر تکمیل کو نہیں پہنچی۔ اور اسکے ارتقاء کا رشتہ موسیقی کے ذریعے امیر خسرو، تان سین، سورداس اور اسحاق موصلی جیسے لافانی اُستادوں سے جا ملتا ہے۔ جُوں جُوں اُنکی ریاضت در رواں بھرے نتائج زیادہ وسیع ہوتے گئے دُنیا کو اس فن سے لگاؤ پیدا ہوتا رہا۔ اشتیاق اور عشق بڑھتا رہا۔ ہنر شناسی اور فن پروری ہاتھ

بڑھاتی رہی اور موسیقی جیسی نعمت غیر مترقبہ تہذیب و تمدن کا حصہ بن گئی۔

چغتائی کی یہ تصویر ایک ناقابلِ فراموش کوشش ہے موسیقار کی برتری اور اسکے فن کے وقار کو آرٹسٹ نے اس خوبی سے جنم دیا ہے کہ بغیر الفاظ کے بغیر کسی جنبش کے موسیقی کی فضا نغموں کی روانی ہے اور اعتماد و خلوص کا جامع تصور اس کے سامنے ہے۔ آرٹسٹ کو اس نتیجہ پر پہنچنے کے لئے کتنی مستعدی اور ریاضت سے کام لینا پڑا ہوگا۔

اسحاق موصلی کا زمانہ وُہ زمانہ ہے جب خلیفہ ہارون الرشید اور وزیر برمکی کا دور اپنے پورے شباب پر تھا۔ ثروت اور ندرت ایکدوسرے کے ہم رکاب تھیں۔ ذوقِ نظر اپنے پورے شکوہ سے موسیقار کے زمان و مکان کی دیکھ بھال کر رہا تھا۔ ذہنی منشیں اور بلندیاں، ثقافتی قدریں اور روحانی ولولے معاشرے کو اسکے وجود کا احساس دلا رہے تھے۔ یہ سب کچھ تھا اور موسیقار کے وجدان نے اس کے پرستاروں کو اپنی گرفت میں لے رکھا تھا۔ زندگی کی بھرپور امنگوں سے موسیقار کی آواز لہرا رہی تھی۔ اور اس کا تاثر وقت کی حدوں سے گذر کر آج بھی دلوں سے ہمکنار، دلوں پر حکمرانی کر رہا ہے۔

اسحاق موصلی کا کردار ایک ایسے موسیقار کا کردار ہے جس نے خلفاء اور وزراء کو لافانی مسرتوں سے ہمکنار کیا۔ آرٹسٹ نے صدیوں کی بھولی بسری داستانوں کی طرف توجہ دلائی ہے اور اپنی فنی کاوشوں اور شوق بے پرواہ سے کام لیکر وقت کی ان نزاکتوں کو اپنے قبضے میں کیا ہے جو آج بھی ہماری زندگی پر اثرانداز ہو رہی ہیں ؎

بدستِ من ہمان دیرینہ چنگ است — درونش نالہ ہائے رنگ رنگ است
ولے بنوازمش با ناخنِ شیر — کہ اُو را تار از رگ ہائی سنگ است

کھل تو جاتا ہے مغنّی کے بم و زیر سے دِل
نہ رہا زندہ و پائندہ تو کیا دِل کی کشُود
ہے ابھی سینۂ افلاک میں پنہاں وُہ نوا
جس کی گرمی سے پگھل جائے ستاروں کا وجُود
جس کی تاثیر سے آدم ہو غم و خوف سے پاک
اور پیدا ہو ایازی سے مقامِ محمُود

ISHAQ MOOSLI

Chughtai has painted Ishaq Moosli, the great musician of the court of Khalifa Haroon-Rashid. Ishaq Moosli was really a great classical musician of his time. He was a creator of so many Rags and Ragnis. This painting is one of his remarkable achievements. As a matter of fact, the artist has achieved a great success in this painting of the musician. It can be considered complete in technique, colour scheme and composition.

Being a gifted artist, sometime, he paints unusual pictures which depict vividly various unexpected aspects of our history. His subjects always stimulate his creative power.

" A MELODY MUST BE NOURISHED ON MADNESS OF LOVE,
IT SHOULD BE LIKE FIRE DISSOLVED IN LIFE-BLOOD.
A MELODY THAT HAS NO MEANING IS LIFELESS,
ITS WARMTH IS ONLY FROM A DYING FIRE !
THE SKILFUL MASTER IMPROVES UPON NATURE
AND REVEALS HIS SECRET TO OUR GAZE!
HE CREATS A NEW WORLD-
AND GIVES A NEW LIFE TO OUR BEING ! "

IQBAL
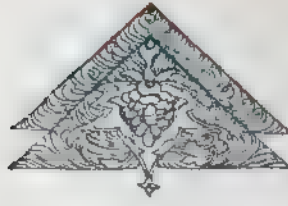
خوابِ گراں خیز

سلیمیٰ
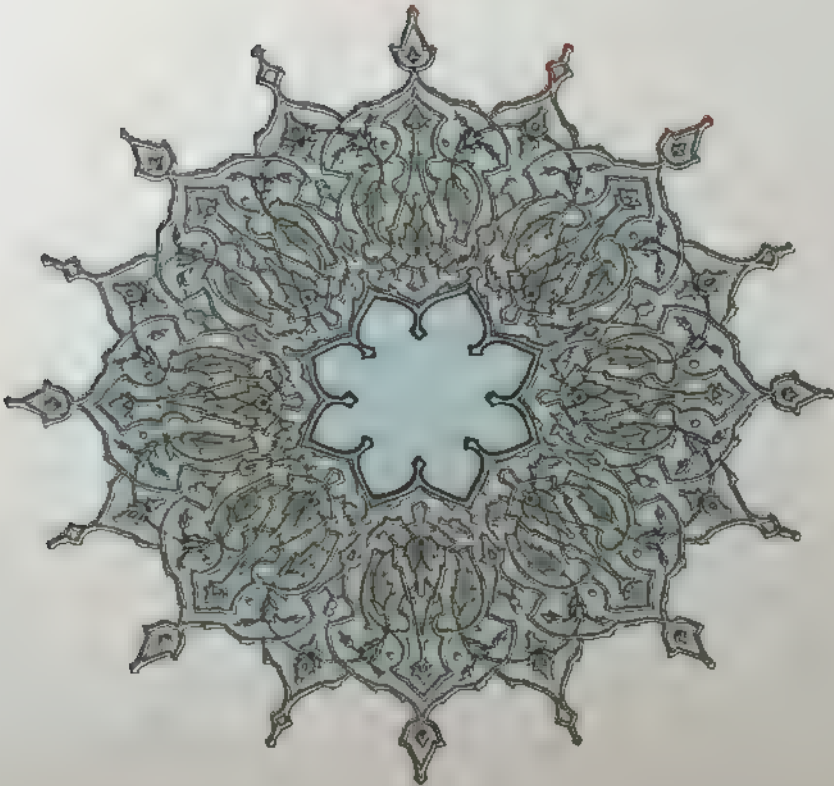
خوابِ گران خیز

اے غنچۂ خوابیدہ چو نرگس نگران خیز   کاشانۂ ما رفت بتاراجِ غماں خیز
از نالۂ مرغِ چمن، از بانگِ اذان خیز   از گرمئ ہنگامۂ آتش نفسان خیز
از خوابِ گران، خوابِ گران، خوابِ گران خیز
از خوابِ گران خیز

خورشید کہ پیرایہ بسیمائے سحر بست   آویزہ بگوشِ سحر از خونِ جگر بست
از دشت و جبل قافلہ ہا رختِ سفر بست   اے چشمِ جہان بیں بہ تماشائے جہان خیز
از خوابِ گران، خوابِ گران، خوابِ گران خیز
از خوابِ گران خیز

خاور ہمہ مانندِ غبارِ سرِ راہے است   یک نالۂ خاموش و اثر باختہ آہے است
ہر ذرۂ این خاک گرہ خوردہ نگاہے است   از ہند و سمرقند و عراق و ہمدان خیز
از خوابِ گران، خوابِ گران، خوابِ گران خیز
از خوابِ گران خیز

دریائے تو دریاست کہ آسودہ چو صحراست — دریائے تو دریاست کہ افزون نشد و کاست

بیگانۂ آشوب و نہنگ است چہ دریاست — از سینۂ چاکش صفتِ موج روان خیز

از خوابِ گران، خوابِ گران، خوابِ گران خیز

از خوابِ گران خیز

این نکتہ کشائندۂ اسرارِ نہان است — ملک است تنِ خاکی و دین روحِ روان است

تن زندہ و جان زندہ ز ربطِ تن و جان است — با خرقہ و سجادہ و شمشیر و سنان خیز

از خوابِ گران، خوابِ گران، خوابِ گران خیز

از خوابِ گران خیز

ناموسِ ازل را تو امینی تو امینی — دارائے جہان را تو یساری تو یمینی

اے بندۂ خاکی تو زمانی تو زمینی — صہبائے یقین درکش و از دیرِ گمان خیز

از خوابِ گران، خوابِ گران، خوابِ گران خیز

از خوابِ گران خیز

فریاد ز افرنگ و دلاویزیِ افرنگ — فریاد ز شیرینی و پرویزیِ افرنگ

عالم ہمہ ویرانہ ز چنگیزیِ افرنگ — معمارِ حرم! باز بہ تعمیرِ جہان خیز

از خوابِ گران، خوابِ گران، خوابِ گران خیز

از خوابِ گران خیز

سلیمیٰ

جس کی نمود دیکھی چشمِ ستارہ بیں نے
خورشید میں، قمر میں، تاروں کی انجمن میں

صوفی نے جس کو دل کے ظلمت کدہ میں پایا
شاعر نے جس کو دیکھا قدرت کے بانکپن میں

جس کی چمک ہے پیدا، جس کی چمک ہے ہویدا
شبنم کے موتیوں میں، پھولوں کے پیرہن میں

اقبال

صحرا کو ہے بسایا جس نے سکوت بن کر
ہنگامہ جس کے دم سے کاشانۂ چمن میں

ہر شے میں ہے نمایاں یوں تو جمال اس کا
آنکھوں میں ہے سلیمیٰ! تیری کمال اس کا

جس سے دلِ دریا متلاطم نہیں ہوتا
اے قطرۂ نیساں وُہ صدف کیا وُہ گہر کیا

اقبال

عظمتِ آدم
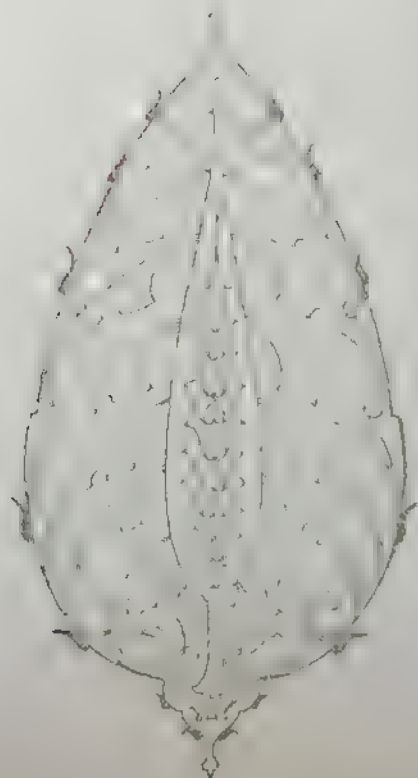
چغتائی اپنے دورانِ سفر میں خصوصیت سے جرمنی۔ اٹلی۔ فرانس اور لندن جہاں بھی گیا اُس نے فراعنۂ مصر کے قوی ہیکل بُتوں کو اس طرح استادہ پایا جیسے وُہ آج بھی اپنے دعووں کی صداقت پیش کرنے میں پیش پیش ہیں۔ اُن کا استبداد اور شکوہ ان کی موجودگی کا احساس بڑی شدت سے دلاتا ہے۔ بچپن ہی سے دماغ پر اُن کے خدائی دعووں کا اثر مسلط تھا۔ وہ خدا کی اس بے نیازی کا گہرا نقش دل پر تھا کہ انسان پتھر کا بن کر بھی پتھر نہیں کچھ اور نظر آتا ہے۔ ان پتھر کے خداؤں سے دُنیا کا کوئی مہذب مُلک خالی نہیں۔ ہزاروں برس گُزر جانے پر بھی ان کا جبر و استبداد جوں کا تُوں موجود ہے کہ یہ حکمران پتھر سلطنتیں اور جاہ و حشم مٹ جانے پر بھی اپنے جاہ و جلال کا مظاہرہ کر رہے ہیں۔

مصر پیغمبروں کا وطن رہا ہے۔ پیغمبروں کے احکام کی یادگاریں اس مٹی کے ذرّے ذرّے پر مثبت ہیں۔ وُہ خدا کی بخششوں سے ہمکنار ہوتے ہوئے بھی اُس کے قہر کی تاب نہ لا سکے۔ ہزاروں صدیاں گزر جانے پر بھی اُن کے تیور میں سرِ مُو فرق نہیں آیا۔ خود پرست خودستائی کے جنُون میں کھو گئے تھے۔ اس صداقت سے مُنہ موڑ بیٹھے تھے جس سے وہ سرفراز ہوئے تھے۔ خدا کی نعمتوں کے غلط استعمال سے وُہ اپنی راہ سے بھٹک گئے تو اس طرح جھنجوڑے گئے کہ کوہ و دشت ریزہ ریزہ ہو گئے۔ بجلیوں نے ان کے نشیمن کو جلا کر خاشاک کر دیا۔ ہر گوشے سے تباہی اور ہلاکت پھُوٹ نکلی۔

چغتائی کی اس تصویر کا مذہبی عقائد سے کوئی تعلق نہیں۔ اُس کی فن کارانہ ندرت نے ایک راہ تلاش کی ہے۔ ان سنگ تراشوں اور بُت کدوں سے قریب تر ہونے کی جو خدائی کا دعویٰ کرتے تھے، خدا کہلاتے تھے اور اس بات کا دعویٰ کرتے تھے۔ یہ عبادت خانے یہ معبد یُونہی آباد رہیں گے۔ وُہ اپنی خدائی کا اس جنون کا خود شکار ہو گئے جو خالق کی بے نیازیوں کو قطعی پسند نہ تھا۔

چغتائی آرٹسٹ ہے۔ وُہ فراعنۂ مصر کے مجسّموں سے متاثر ہے۔ اُس نے ان کی شان و شوکت کو محسُوس کیا ہے اور یہ اثرات اس کی اکثر تصویروں سے نمایاں ہیں۔ اس مجموعہ میں بھی دو تصویریں موجود ہیں۔ یہ تصویر اُن استادوں کے دوش بدوش نظر آتی ہے جنہوں نے اپنے شاہکاروں کو دوام بخشا ہے۔ اقبال می رود کی قیادت میں ان معبد خانوں میں جا پہنچا ہے جن کی ہیبت سے وہ متاثر تھا۔ اقبال محوِ استغراق ہے اور می رود عظمتِ آدم سے متاثر ہے۔ دونوں مفکر اس عالمِ رنگ و بُو پر نازل ہونے والی بخششوں اور رحمتوں کا مطالعہ کر رہے ہیں جن کی تباہی سے انسان کا خود اپنا دل پارہ پارہ ہے۔ یہ تصویر فن کار کے فن کی یوں ہی منادی کرتی رہے گی اور یُوں ہی اسکی تخلیقی عظمت کا اعتراف کرتی رہے گی۔ وہ یہ بھی بیان کرتی رہے گی کہ

شانِ ربُوبیت سے خاکِ نیل کو اس کی روایات اور وِرثے سے کبھی محروم نہیں رکھا۔

عظمتِ آدم کی یہ تصویر اُن دِنوں کی یاد دِلاتی ہے جب انسان کی بصیرت روشنی کی تلاش میں برسرِعمل تھی اور وُہ چاہتا تھا بڑے ہی مُؤثر طریق پر اس بغاوت کو جو آدم نے بہشت کی آسودگیوں میں محسوس کی پُورا کر دے۔ پھر اسے پھلنے پھُولنے کا موقع ملا اور وُہ آباد ہوگیا۔ اُس نے ایوان بنائے۔ ان میں شور وشر پیدا کیا عیش وعشرت کو اُچھالا۔ پھر ان آسمانوں اور ستاروں کو دیکھنے لگا۔ جہاں اُسے اُکتاہٹ ہی اُکتاہٹ محسوس ہوتی تھی۔ اور وُہ کفرانِ نعمت کو اپنے معرج سے تعبیر کرنے لگا۔ دونوں معنکر حقائق کی گہرائیوں میں اُتر کر عظمت آدم اور فراعنۂ مصر کے سنگدوں کے شکوہ میں اس عذاب سے دوچار ہیں جو اس سرزمین پر نازل ہُوا۔ وُہ ان بخششوں، رحمتوں اور عظمتوں کے کتبوں کو پڑھ رہے ہیں جنھوں نے ارتقائے انسانی کو جنون سے بدل دیا۔ اب اس کے گرد و پیش اسرار اور خاموشی کے سوا کچھ نہیں کہ پھر یہ غلطی کبھی سرزد نہ ہوگی ؎

اس دشتِ جگرتاب کی خاموش فضا میں
فِطرت نے فقط ریت کے ٹیلے گئے تعمیر!

اہرام کی عظمت سے نگونسار ہیں افلاک
کس ہاتھ نے کھینچی ابدیت کی یہ تصویر

فِطرت کی غلامی سے کر آزاد ہُنر کو
صیاد ہیں مردانِ ہُنرمند کہ نخچیر؟

خودی بُلند تھی اُس خوں گرفتہ چینی کی
کہا غریب نے جلّاد سے دمِ تعزیر
ٹھہر ٹھہر کہ بُہت دِل کُشا ہے یہ منظر
ذرا میں دیکھ تو لوں تابناکیٔ شمشیر!

THE GLORY OF ALMIGHTY

This is the most abstract subject and a pleasing symbol of revolutionary spirit. The impressionistic mood of the painting and background is remarkable.

The movement and the activities of art and the artist are as real as the creation of the real artist and exhibit the same kind of the paintings as he illustrated in his other paintings.

"TRANSMUTE THY HANDFUL OF EARTH INTO GOLD,
KISS THE THRESHOLD OF A PERFECT-MAN.
FROM THE WINE OF LOVE SPRING MANY SPIRITUAL QUALITIES;
AMONGST THE ATTRIBUTES OF LOVE IS BLIND DEVOTION.
BE A LOVER CONSTANT IN DEVOTION TO THE BELOVED,
THAT THOU MAYEST CAST THY NOOSE AND CAPTURE GOD.

IQBAL

دست نگر

سمندر سے ملے پیاسے کو شبنم
بخیلی ہے یہ رزاقی نہیں ہے

اقبال

دستِ ہنر

یہ ایچنگ چغتائی کی کندہ کاری کا ایک اعلیٰ نمونہ ہے ۔ ایچنگ سے آرٹسٹ کا مطلب یہی ہے کہ یہ آرٹ ہمارے معاشرے کا حصہ بن جائے ۔ اور اسے مقبولیت حاصل ہو ۔ اس سے پہلے ہمارے ہاں نہ اس آرٹ کی کوئی اہمیت تھی اور نہ اس کی کمی کا احساس تھا ۔ چغتائی نے اپنی اَن تھک کوششوں سے اس صنف کے ذریعے ۱۹۳۰ء میں اپنے آرٹ کا ایک نیا رُخ بنانے کی طرف توجہ دی ۔ ہوتے ہوتے اسے اس قدر مقبولیت حاصل ہوئی کہ آرٹ کے ہر اُس مدح کو جسے فن سے کچھ لگاؤ تھا کسی نہ کسی شکل میں توجہ دینی پڑی ۔ یہ عظیم فن دیکھتے دیکھتے آرٹ کی دنیا میں سما گیا اور اس کی ضرورت اور اہمیت کا احساس بڑھنے لگا ۔ دیکھنے اور پرکھنے والا اس کی عمیق گہرائیوں میں ایک ایسا آہنگ محسوس کرنے لگا جو یقینی طور پر ہیئت اور مواد کے لحاظ سے بالکل نیا تھا ۔ کندہ کاری کے اوصاف اور اسلوب سے ایک ارتعاش پیدا ہوتا ہے ۔ موضوع میں حرکت ہو تو ابدی سرور چٹکیاں لینے لگتا ہے ۔ سیاہی نے رنگوں کی جو جگہ لے لی ہے وہ محض خوشگوار ہی نہیں بلکہ ابھرتے ہوئے خط اپنی نوک پلک اور نقش و نگار کی گہرائیوں کی وجہ سے جذبات سے اور زیادہ ہم آہنگ ہو جاتے ہیں تخلیق کے بدلتے ہوئے رُخ پوشیدہ قوتوں سے جا گر نظر آتے ہیں ۔ نفسِ مضمون سے موافقت ہو تو کوئی وجہ نہیں کہ یہ آرٹ لطف اندوزی پیدا کرنے میں رنگدار تصویروں پر سبقت نہ لے جائے ۔

درگاہ کے بھکاری جذبات و احساسات کمتری میں سرمایہ دار کا پیچھا کر رہے ہیں جو دنیا کی ہر نعمت سے مالا مال اور بے نیاز ہے ۔ وہ ضرورتمندوں کی زبوں حالی کو سمجھنے اور دوسروں کے جذبات کچلنے پر قادر ہے ۔ چغتائی نے اپنی اس انمول تخلیق کے ترتیبی اجزا اور بندشوں کی فنی لطافتوں کو ایسے اچھوتے انداز میں انجام دیا ہے کہ تصویر کے ہر پہلو سے ندرت اور چابکدستی ظاہر ہے ۔ بھکاری ایک دوسرے کے پیچھے بتدریج گہرے اور ہلکے خطوں سے دور ہٹتے چلے جاتے ہیں ۔ یہ ایک فنکارانہ جہاد ہے کہ اپنے تخیل کی تکمیل کے لئے راہیں کشادہ ہوتے ہوتے ایک جگہ آ کر مل جائیں ۔ ایک لگاؤ پیدا ہو ۔ سمجھنے اور پرکھنے کی کوشش میں کشمکش بڑھے ۔ اور تشنگی کی تشنگی باقی رہے ۔ تصویر تمکنت ، اقتدار ، اور وضع قطع سے سرمایہ داری کا جنون ہے ۔ سرمایہ دار کا تناؤ موضوع کی اہمیت کو کہاں کا کہاں لے جاتا ہے ۔ جب بھکاریوں کی زبوں حالی پر نگاہ جاتی ہے اور ان کے کرداروں سے نگاہ کچھ ٹوٹتی ہے تو احساس ہوتا ہے کہ آرٹسٹ نے ایک ایک بھکاری کی کیفیات اور تاثر کا بڑی خوبی سے جائزہ لیا ہے ۔ پہلے جھکے ہوئے درویش کا جھکاؤ تصویر کی فضا اور سماں کو اپنی گرفت میں لئے ہوئے ہے ۔ اور دوسروں سے اس کا دلآویز موازنہ ہے ۔

کندہ کاری کے فن اور چغتائی کے فنی رُجحانات میں ایک فطری مناسبت ہے ۔ اس لئے جب بھی وہ اپنے موضوع کو تانبے کے پلیٹ پر اتارنے کے لئے آمادہ ہوتا ہے تو موضوع پورے طور پر اُس کی گرفت میں ہوتا ہے اور وہ اپنے

مدعا کو دوسروں پر واضح کر دیتا ہے۔ اس کے جام میں جو شراب ہے وہ اس قدر تلخ ہے کہ اس سے اشارات و کیفیات کا انکشاف ہوتا ہے۔ اور لب و لہجہ کا پتہ چلتا ہے جس کی وضاحت اسے منظور تھی۔

چغتائی کی اس کندہ کاری کا موضوع بڑا ہی پرشکوہ اور بلند آہنگ ہے۔ اس میں تاثرات کا توازن، مربوط کیفیات، سرمایہ داری اور ناداری کا شعور جس وسعت نظری سے پیش کیا گیا ہے وہ آرٹسٹ کی شخصیت کا مظہر ہے۔ کندہ کاری کی مشکل تکنیک کے باوجود تصویر کی استخواں بندی میں اس مغل کلچر کا انداز موجود ہے جس کا وہ نمائندہ ہے یہاں روایات کے وہ گہرے نشان بھی ملتے ہیں جن سے زندگی رواں دواں ہے۔ اسے دیکھ کر یہ احساس و شعور ہوتا ہے کہ موضوع فطری رجحانات سے موزونیت حاصل کر سکا ہے۔ ماضی، حال اور مستقبل کا موضوع سے گہرا رشتہ ہے۔ وہ اصولِ ارتقاء کا پابند ہے۔ اُسکے نزدیک سرمایہ دار نے ہمیشہ ہی رزق کی تقسیم میں تنگ نظری اور تنگدلی کا ثبوت دیا ہے۔ سرمایہ دار کی بے مردی اور ناداری کا ہلکا پن یونہی ٹکراتا رہے گا اور موضوع سے خطوں کی بے ساختگی اور وارفتگی زندہ و تابندہ رہیگی ؎

دست دولت آفریں کو مزد یوں ملتی رہی
اہل ثروت جیسے دیتے ہیں غریبوں کو زکوٰۃ

ہے ہمارے شہر کا والی گدائے بے حیا
تاج پہنایا ہے کس کی بے کلاہی نے اسے
کس کی عریانی نے بخشی ہے اسے زریں قبا

سمندر سے ملے پیاسے کو شبنم
بخیلی ہے یہ رزاقی نہیں ہے

DEAD SHRINES

This is another Etching of Chughtai. Etching work is more delicate and interesting. This Etching deserves more attention on account of its perfection, the artist's surprising command over lines and for his power of drawing. You will admire and appreciate this Etching. Its subject-matter is also very interesting. Composition of the shrines is marvellous. The beggars of the shrines and a capitalist are in a great movement.

As an Etcher Chughtai himself feels the equal of the great Etcher of Europe. He achieved every success in this technique.

"NOT MERE GIFTS—COMPOUND INTEREST THESE SAINTS WANT,
IN EACH HAIR-SHIRT A USURER'S DRESSED
WHO INHERITS HIS SEAT OF AUTHORITY
LIKE A CROW IN THE EAGLE'S OLD NEST.

IQBAL

تخلیقی پیکر

زآب و گِل خُدا خوش پیکرے ساخت
جہانے از ارم زیبا ترے ساخت

اقبال
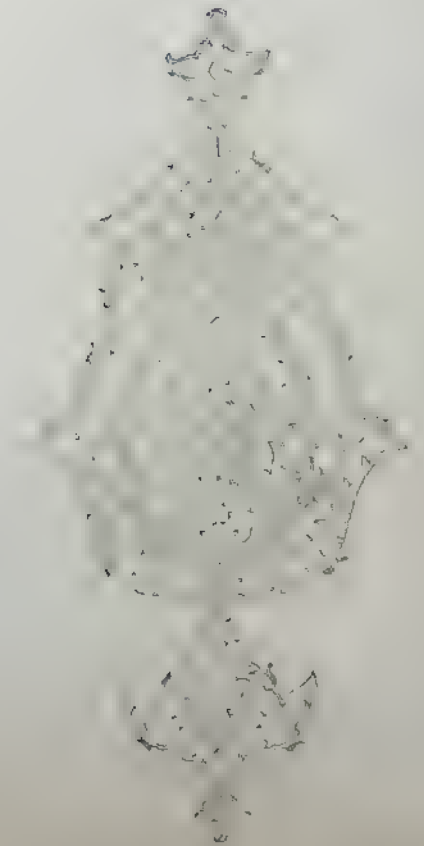
تخلیقی پیکر

چغتائی نے اپنے مخصوص انداز میں کہا۔ جناب یہ تخلیقی پیکر چغتائی صاحب کی تخلیق ہے۔ اسے دوام ہے تو چغتائی کو بھی دوام نصیب ہوگا۔ چغتائی کی رجائیت ہمیشہ اعتدال پر نظر آتی ہے مگر کبھی کبھار وُہ اپنی خود اعتمادی سے اسقدر برہم ہوجاتا ہے کہ ایک دوسرا آدمی نظر آنے لگتا ہے۔ مشرقی موسیقی کی طرح اس کا موثر موضوع کی عظمت اور گداز مترنم نغموں سے پُر ہے۔ چغتائی کی تصویروں کا جلال و جمال اس کے تخلیقی پیکروں میں کسی صورت کم نہیں ہوتا جیسا اس کی بنائی ہوئی مجاہدوں کی تصویروں میں ان کے اکھڑتے پن اور حیات پرور تناؤ میں درویشی کے جلال و جمال کا پرتو ہوتا ہے۔ سکی ہر ایسی تلاش پُرعظمت پُرتاثیر اور فطری نظر آتی ہے۔ مبالغہ نگار خود بخود ایسے دو پیچ میں اُلجھ جاتا ہے کہ اظہار کے راستے غیر محدود نظر آتے ہیں۔ موضوع کی عظمت بڑھ جاتی ہے اور تہذیبی قدر کو اسکی تخلیق سے بڑی تقویت حاصل ہوتی ہے۔ تخلیقی پیکر اس کاروانِ حرم کی بازگشت ہے جہاں ہجوم پیکروں سے اور پیکر ہجوموں سے کُھلے میدان یکدوسرے سے بغل گیر ہوتے ہیں۔ اور اخلاقی ذمہ داریاں زندگی کی توانائیوں سے بہرہ ور ہوکر رحمتوں سے سرفراز ہوتی ہیں۔

چغتائی کو اپنے فن پر پُورا قابُو ہے۔ وہ خود چاہے توقعات سے تجاوز کر بھی جائے پر اُس کے تخلیقی پیکر حقائق کی ساخت کو ہاتھ سے نہیں دیتے۔ جذباتی طور پر بھی جمالیاتی حُسن دبدبۂ تیموری کا نقش قدم ہوتا ہے۔ تخلیقی پیکر کو دیکھتے ہی یہ خیال برق رفتاری سے نس نس میں دوڑ جاتا ہے کہ آخر اقبالؒ کے تصور اور اسکے تخیل کو اس تصویر سے کیا رشتہ ہے۔ وہ اقبالؔ جو بڑی جرأت و بیباکی سے شکوہ کرنے پر آمادہ ہوتا ہے۔ ساغر و مینا کو شمشیر و سناں دیکھتا ہے۔ شیطان سے ٹکرا جاتا ہے۔ فرشتوں پر تنقید کرنے لگتا ہے انسانوں کو بغاوت پر آمادہ کرتا ہے۔ یہ تصویر یہ پیکر اس کے والہانہ عشق کا کہاں تک ساتھ دے گی جو حُسن و جمال سے مالا مال، بے نیازی سے اپنے مرکز پر کھڑی مائل پرواز ہے۔ حرم کی نُور دلپذیر طور پر رُوح کی بالیدگی میں پر تول رہی ہے۔ اس پیکرِ فن میں ان عناصر کی ایک جھلک ہے جنہیں چھونے کی تمنا اقبالؔ نے کی ہے۔ حُسن بے پروا کے اس دلکش انداز کو چغتائی نے بڑے سلیقے سے رنگوں کے امتزاج، اور لباس کی تراش سے زندگی بخشی ہے۔ اس شباب کو جو خود نمائی کا تاج ہے چغتائی نے اپنے طرزِ نگارش اقبالؔ کے حضور میں ہدیۂ عقیدت کے طور پر پیش کیا ہے۔

چغتائی کا یہ شاہکار ایک امتیازی درجہ رکھتا ہے۔ اسکی تکنیک سے اس کے اسلوبِ فن کی انفرادیت اس درجہ اُبھر آئی ہے کہ اقبالؔ ہوتے تو ایک نغمہ کہہ دیتے۔ تصویر کا پس منظر ان کاروانوں کے گرد و غبار کا شکوہ ہے جنکی بدویانہ ذہنیت کرۂ زمین کی تسخیر پر آمادہ تھی۔ وہ کشادہ دلانہ زار جن کا ادراک محال تھا۔ جن کا افق غیر محدود نظر آرہا تھا۔ کوئی قوت ان کے استغراق و تصور کا مقابلہ نہ کر سکی۔ جہاں بھی اُن کے قدم پہنچے فضا میں سفید سفید گنبد اور اُونچے اُونچے مینار آسمانوں کو چھُونے لگے۔

یہ تخلیقی پیکر، یہ نسیم جاں فزا ان کارونوں کی یاد ہے۔ جو پشت در پشت زندگی کی جستجو میں مارے مارے پھر رہے تھے

تصویر اتفاقات کا کرشمہ نہیں یہ آرٹسٹ کے مطالعہ کا کرشمہ ہے۔ یہ ان حدی خوانوں کے نغموں کی بازگشت ہے جو آج بھی صحراؤں کو تلملا دیتی ہے۔ شاہین مائل پرواز ہے۔ پیکر اس کے ساتھ ہے۔ ایک مغربی مبصر نے اس کے سامنے کھڑے ہو کر کہا تھا۔ اس دلنواز پیکر نے وہ بوجھ کندھوں سے اتار پھینکا ہے جو مغرب میں سوہانِ روح ہے۔ مشرق کا یہ روحانی طلسم چغتائی کی مشرقیت نے یوں تخلیق کیا ہے کہ یہ بلند کرداری، یہ دلکشی اور یہ نادرہ کاری آج بھی جوں کی توں زندہ و تابندہ ہے ؎

جس کی نمود دیکھی چشمِ ستارہ بیں نے
خورشید میں قمر میں تاروں کی انجمن میں
جس کی چمک ہے پیدا جس کی مہک ہویدا
شبنم کے موتیوں میں پھولوں کے پیرہن میں

صحرا کو ہے بسایا جس نے سکوت بن کر
ہنگامہ جس کے دم سے کاشانۂ چمن میں
ہر شے میں ہے نمایاں یوں تو جمال اس کا
آنکھوں میں ہے سلیمیٰ تیری کمال اس کا

زآب و گل خدا خوش پیکرے ساخت
جہانے از ارم زیباترے ساخت
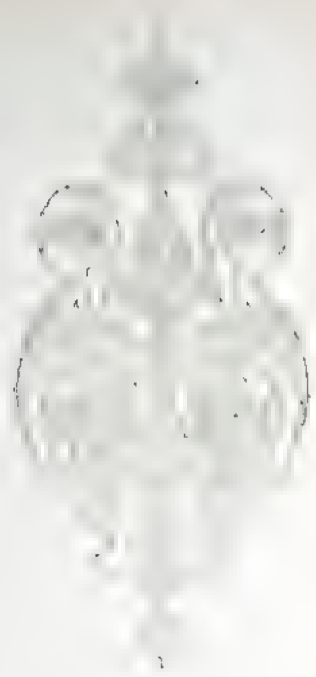
FLASK OF VANITY

Chughtai is an artist of rare merits. His style and composition always depicted his artistic experience. He draws decorative moods in some original forms. He finally showed an almost gay temperament in his studies of nature and human figures. In this picture you will find that he has depicted a new type of a graceful woman, standing with confidence. The dynamic arrangement of the figure also shows the calligraphic refinement. The artist has succeeded in drawing an extraordinary figure with technical skill. He is successful in keeping the harmony of colours and treatment. This painting deserves special attention on account of its perfection.

" ALTHOUGH THE ANGEL DWELLS BEYOND
THE TALISMAN OF THE SKIES,
YET ON THIS HAND OF DUST IS FOUND
AFFECTION REST HIS EYES.
THINK NOT UPON ONE FASHION GOES
THE GAME OF LOVE FORLORN;
SANE ARE THE TULIP AND THE ROSE
AND YET THEIR ROBE IS TORN.

IQBAL.

شُہرت

جینا وُہ کیا جو ہو نفسِ غیر پر مدار
شہُرت کی زِندگی کا بھروسہ بھی چھوڑ دے

اقبال

شہرت

ہر مذہب و ملت نے دکھاوے کی زندگی کی مذمت کی ہے اور علامہ اقبالؔ نے اپنی غیر فانی نظم شمع اور شاعر میں شمع کی زبانی جھوٹی شہرت کا نظریہ بڑے محققانہ انداز میں پیش کیا ہے۔ دیکھا جائے تو تصویر کے رُوپ میں آرٹسٹ نے وُہ مؤثر انداز پُر ترنم الفاظ کی بجائے رنگوں اور خطوں میں پیدا کر دیا ہے۔ یہ تصویر چغتائی نے غالباً ۱۹۲۱ء میں بنائی تھی۔ اور اُس نے اس کا نام لیڈر رکھا تھا۔ یہ تصویر مختلف نمائشوں میں پیش ہوئی۔ اس پر لے دے بھی ہُوئی۔ تعریف و توصیف بھی ہُوئی اور انعامات بھی ملے۔ آرٹسٹ نے تصویر کشی کے فن میں ایک نئے موڑ کی طرف توجہ دلائی۔ اور اس وقت کے سیاسی رُجحانات کی کچھ ایسے طریق پر توضیح کی کہ تصویر کی مقبولیت اور اس کی اہمیت کا اظہار بڑے پر زور الفاظ میں کیا گیا۔ تصویر کے تخیل اور کیفیات سے کوئی پیچیدگی پیدا نہیں ہوتی۔ جُوں جُوں تصویر کو دیکھا جائے تخلیق کی نغمگی اور جاذبیت اپنی اثر آفرینی سے مسحُور کر لیتی ہے۔ ایک نیم عُریاں عورت شہرت کے رُوپ میں شمع دان اُٹھائے چراغ تلے اندھیرے کی مثال بنی بیٹھی ہے۔ شمع کی لو سے متاثر سوز و گداز سے دیوانے، پروانے جانیں قربان کر رہے ہیں۔ شہرت اپنی رعنائی کو اپنے مدعا سے ناپ رہی ہے۔ اور سمجھتی ہے کہ یہ کھیل اس کے اپنے اوصاف اور حُسنِ ظاہری پر کھیلا جا رہا ہے اسے خراجِ عقیدت پیش کیا جا رہا ہے۔ شہرت، نمائش اور ستائش کی متلاشی عورت اپنی خود فریبی سے مسحُور ہے۔

تصویر کی استخوان بندی سے یوں معلوم ہوتا ہے کہ ایک سُلجھی ہُوئی پجارن مندر کے بلند دروازے کے آگے دھُونی رمائے دھیان گیان میں بیٹھی ہے۔ اُس نے اپنے حُسن کی نمائش سے آنے جانے والوں کو مسحور کرنے کا تہیّہ کر رکھا ہے۔ وُہ چاہتی ہے کہ مندر میں اس کے نام کی پُوجا ہو۔ پجاری پروانوں کی طرح جانیں دیں۔ سونا چاندی بس کی آشا پر بھینٹ چڑھے۔ وہ شہرت کی دیوی ہو۔ تو ہم پرستی رواج پا جائے۔ وُہ اپنے پرستاروں کو اپنے چنگل میں لے لے اور طبقاتی نظام کو اپنی سیاست کی غلامی سے نجات نہ حاصل کرنے دے۔ چغتائی نے جو تصویر کا پس منظر منتخب کیا ہے وہ خود شہرت کا ایک باب ہے۔ اسمیں بجائے تمنّی کے سکون کی آمیزش ہے۔ یہ سماں بندی یہ سوچنے اور سمجھنے پر مجبُور کرتی ہے کہ ہم ذہنی طور پر رمزیت سے بھاگتے ہیں جس کی تشنگی اور شگفتگی اعمال کی بازگشت کی طرح کبھی پیچھا نہیں چھوڑتی۔

چغتائی کی یہ رومانیت شباب آور اور فسوں انگیز ہے۔ یہ تصویر اس کی آزادیٔ فکر اور روشن ضمیری کا نتیجہ ہے۔ جن دنوں اس کا آرٹ ابتدائی مراحل طے کرنے میں اپنے مرکز کی طرف مائل پرواز تھا وہ غزل گوئی کرتے کرتے ایک نظم گو شاعر بننے پر مجبُور ہُوا اور بغیر کسی تعلق کے اندرُونی کشمکش سے ایسی تصویریں تخلیق کرنے لگا جو اس کے فطری تقاضوں اور دینی رُجحانات

کا پتہ دیتی ہیں۔ اُس نے ابتدا میں فوٹوگرافی کی اور اس جذبے سے کہ وہ اسے معیار پر لے جائیگا، افسانے لکھے کہ وُہ کوئی بلند مقام حاصل کرے گا۔ مگر وُہ سب کچھ چھوڑ کر رنگوں اور خطوں کے احساسات میں ایسا پھنسا کہ پھر نکل نہ سکا اور آرٹسٹ بن گیا۔ اسکی اس تصویر میں اس کے ہندوستانی آرٹسٹ ہونے کے جوہر نمایاں ہیں۔ اس نے ہندوانہ تصویریں بنانے میں بڑی شہرت حاصل کی اس کی انفرادیت اور بلند نگاہی کو دیکھ کر اس کے ہم عصر اس سے متاثر رہے۔

چغتائی کا مقولہ حیات ہے۔ وہ بنگال میں رہے یا پنجاب میں اس کا آرٹ وارداتِ قلب کی پیداوار ہے اور یہ وارداتِ قلب ہی ہے جس پر آرٹ کی بنیادیں استوار ہیں۔ اس کی ہر تصویر چاہے اس کا تعلق کسی مذہب وملت سے ہو اُسکی ہے۔ اُس کی نشوونما اس کے خلوص اور ریاضت سے رنگوں کے آہنگ میں ڈھلی ہے۔ یہ تہذیبی دولت، زندگی کا سنجوگ، اس کی ہندوانہ تصویریں سدا اس کی بلند نگاہی کے گیت گاتی رہیں گی۔ اس کی ندرت اور توانائی کی منادی کرتی رہیں گی۔ اس نغمے کی طرح جو کبھی محو نہیں ہوتا ؎

تا کجا طوفِ چراغِ محفلے
زآتشِ خود سوز اگر داری دلے

لطف کلام کیا جو نہ ہو دل میں دردِ عشق
بسمل نہیں ہے تُو تو تڑپنا بھی چھوڑ دے

تقلید کی روش سے تو بہتر ہے خودکشی
رستہ بھی ڈھونڈ خضر کا سودا بھی چھوڑ دے

جینا وُہ کیا جو ہو نفسِ غیر پر مدار
شہرت کی زندگی کا بھروسا بھی چھوڑ دے

اس سرابِ رنگ و بُو کو گلستاں سمجھا ہے تو
آہ اے ناداں قفس کو آشیاں سمجھا ہے تُو

FAME

In this picture the difference between inspirational and realistic art is very clear. Chughtai is both imaginative and creative artist.

Note the masterly handling of the fine qualities of light and dark which runs throughout the whole picture. Amongst it, is sitting a graceful lady holding a burning lamp, giving the expression of her emotions. In fact this aspect of Chughtai's art inspires and attract us, and enables us to understand the inner meaning and the artistic organization of his attempt.

Fame gives a measure of mankind and all the disruptive tendencies for the structure of the society. It is one of the early paintings of Chughtai and illustrates Dr. Iqbal's verses.

"WHENCE HAST THOU GATHERED THIS WORLD LIGHTING FIRE ?
THOU HAST TAUGHT THE POOR MOTH THE BURNING ZEAL OF MOSES.
O HEEDLESS! ACQUAINT THYSELF WITH THY WORTH FOR THOU
ART A DROP—BUT HAST THE POTENTIALITY OF A BOUNDLESS OCEAN.

IQBAL

به جهان دردمندان تو بگو چه کار داری
تب و تاب ما شناسی دل بیقرار داری
چه خبر ترا از اشکی که فرو چکد ز چشمی
تو به برگ گل ز شبنم در شاهوار داری
چه گویمت ز جانی که نفس نفس شمارد
دم مستعار داری غم روزگار داری

پُرشکوہ

دِلبری بے قاہری جادُوگری است
دِلبری با قاہری پیغمبری است

اقبال

پیش گفتہ
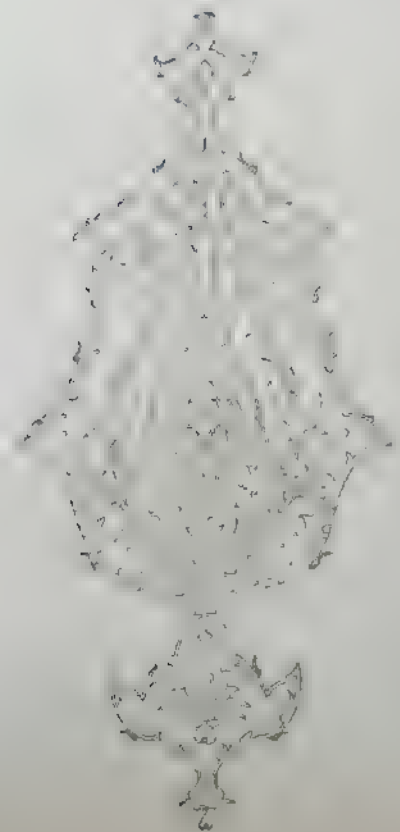
عمل و کردار زندگی کے اعلیٰ ترین اوصاف ہیں۔ یہی اوصاف قوموں اور ملکوں کی تقدیر اور تدبیر کے ضامن ہیں
جن سے حکومت اور مملکتیں برسرِ اقتدار رہی ہیں۔ یہی وہ اوصاف ہیں جن سے فرد اور جماعت کا رشتہ استوار ہوتا ہے اور خود اعتمادی
اور خودی کی نو پیدا ہوتی ہے۔ ثقافتی قدروں کی راہیں کشادہ ہوتی ہیں۔ یہ میراث قوموں کو ادیبوں، شاعروں اور فن کاروں
سے ملتی ہے۔

چغتائی کے فن میں فنی محاسن کے پہلو بہ پہلو ہر جگہ بلند نظری اور ثروتِ فکر موجود ہے۔ وہ اپنی ذہانت و مطالعہ
کی رو سے کھوئے ہوئے نقوش کو پھر اس معیار پر لانے کا آرزومند ہے جو گذشتہ تہذیب و تمدن کا آئینہ دار رہا ہے۔ اس نے
ان موضوعات کو اپنے فن میں سمویا ہے جو اس کے ماضی اور معاشرے سے وابستہ ہیں۔ اس کی آرزوؤں میں وہ جدت طرازیاں، وہ
جذبات موجزن ہیں جن کے ماحول میں وہ آج آباد ہے۔ یہی ایک سبب ہے کہ وہ دوسروں کو بھی دعوتِ عمل دے کر ان میں
ولولہ پیدا کرنے کا خواہش مند ہے۔ اس بے مثل نادرہ کاری اور معیاری فن کیلئے اس کا وجود قابلِ تعظیم ہے۔ اس کی ہر تخلیق اس کی
جدتِ طبع کی بدولت فنی عظمت اور برتری کی حامل ہے۔

یہ تصویر اس مغل شہزادے کی ہے جس کے ساتھ ہند کا تہذیب و تمدن وابستہ ہے۔ جس سے خود آرٹسٹ کا
نظریۂ زندگی واضح ثابت ہوتا ہے۔ مغل پادشاہوں اور شہزادوں پر خدا کی بخششوں اور برکتوں کا کس قدر نزول تھا جس کا
اظہار انہوں نے بڑے تشکر کی صورت میں پیش کیا اور بڑی لجاحت سے کہا۔ تم نے خدا کی رحمتوں اور بخششوں کا شکریہ رفیع الشان
عمارتوں، آباد شہروں اور بلند گنبدوں اور میناروں والی مسجدوں کی شکل میں پیش کیا ہے۔ اس تصویر کے متعلق جب بھی کوئی آرٹسٹ
سے سوال کرتا ہے تو وہ کہہ دیتا ہے یہ شیخو بابا ہے۔ یہ شہزادہ سلیم ہے۔ یہ وہ جہانگیر ہے جس کے نام نے زنجیرِ عدل کو زندہ کیا۔
اکبر اعظم کا بیٹا شاہنشاہ ہندوستان، جانشین شاہجہان کا باپ، جس نے تاج محل جیسی یادگار بنا کر ہندوستان کو جنت نشان بنا دیا
ہے۔ چغتائی نے یہ تصویر جس طرب انگیزی اور ارادت سے بنائی ہے یہ اس کی ہمہ گیری اور نگاہ سازی کا کرشمہ ہے۔ وہ افرو
مواد جو اس نے اس تخلیق کے لئے جمع کیا ہے، اس کلچر کا ورثہ ہے جسے آج بھی دنیا مغلوں کا ہندوستان کہہ کر تسکین محسوس کرتی
ہے۔ چغتائی نے بار بار اپنی بصیرت سے ملک کے موجودہ مسائل کی طرف توجہ دلائی ہے۔ اپنا فن وہ فن ہے جس سے اپنی انفرادیت
کا یقین دلایا جا سکے، اور پھر ایسا فن جس سے کبھی مایوسی نہ ہو۔

ایک مغربی مصور نے ایک موقع پر چغتائی آرٹسٹ سے سوال کیا تمہیں اپنے آرٹ سے کیا کیا توقعات ہیں۔

اُس نے کہا۔ وہی جو مغرب کو لینا، ڈوڈونچی۔ بوتاچیلی، بیلینی۔ گوگیں اور رینائے سے ہیں۔ میری وطنیت، میرا مشرق، مغرب کے انگ انگ میں رچا ہوا ہے۔ میں محسوس کرتا ہوں ایک آرٹسٹ اندھا دھند تقلید کا مقلد نہیں ہو سکتا۔ تقلید سو بیماریوں کی ایک بیماری ہے جس سے چھٹکارا حاصل نہیں کیا جا سکتا۔ چغتائی کی یہ تصویر اس عظمت کی تصویر ہے جس سے ہم دوسروں کی نگاہوں میں بلند و پرشکوہ بنتے ہیں۔ اس کے دیکھنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ علم و ہنر، تدبیر و تعمیر اس گھر کی پروردہ تھی۔ وہ تمکنت و تمام جاہ و جلال، شان و شکوہ اور انسانی قدروں کے زندہ معمار تھے۔ آرٹسٹ کا مقصد ایرانی و ہندی تصویریں بنانے سے صرف یہ مدعا ہے کہ وہ کرداروں میں وہ صورت و سیرت اور بصیرت بھر دے جس سے ہماری برتری اور زندگی کی صلاحیتیں اجاگر ہوتی ہیں۔

تاریخ نے بادشاہ جہانگیرؒ کے مقام کو اور اس کی پُروقار شخصیت کو ہمیشہ سراہا ہے جو عوام و خواص دونوں کے قریب رہی۔ اس کے دورِ عظیم میں ہنرپروری، ہنرشناسی نے ترقی کے بڑے بڑے مدارج طے کیے۔ آرٹسٹ نے تصویر کی دستوں اور وقت کے تقاضوں کی وضاحت کے لیے پس منظر میں ہاتھی کے بھاری بھرکم جثے کو بطور استعارے کے استعمال کیا ہے جو مغل تہذیب کی عظمت اور شکوہ کا ایک پُرعظمت نشان تھا۔ خطوط کی لطافت، رنگوں کی حلاوت و سادگی سے تصویر کا تصور ابھرتا ہے۔ اس تصویر میں اس نے سبز و سیاہ رنگ کے امتزاج کو اپنے کمالِ فن سے اجاگر کیا ہے۔ اسے تکنیک اور تخیل بندی پر پورا پورا ایقان حاصل ہے۔ تصویر موضوع کے لحاظ سے باعثِ افتخار ہے ؎

نہ فقر کے لیے موزوں نہ سلطنت کے لیے
وہ قوم جس نے گنوایا متاعِ تیموری

نعرہ زد عشق کہ خونین جگرے پیدا شد
حسن لرزید کہ صاحب نظرے پیدا شد

فطرت آشفت کہ از خاکِ جہانِ مجبور
خودگرے، خودشکنے، خودنگرے پیدا شد
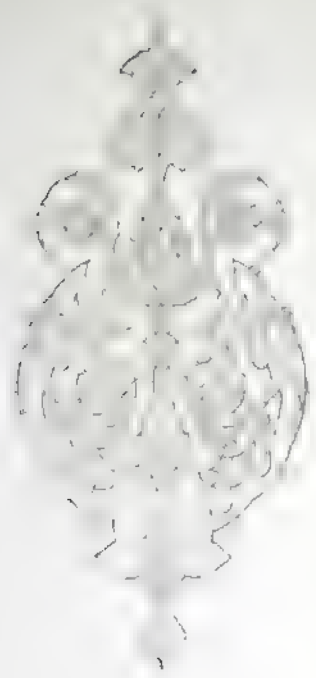
PRINCE SALIM

The evolution of Chughtai's style is excellently revealed in his historical paintings. He has a fine taste inherited from his forefathers and ancestors, with lineage of the Tartar-Mughals and the family of the master-builders of the Pearl Mosque of Delhi and Taj Mahal of Agra.

When Jahangir inherited Akbar's throne, was the Golden Age of the great Mughals. His understanding and attitude towards the paintings and fine arts, was extraordinary and differed from others.

This picture is a successful attempt of the artist, between the impressionistic and romantic sparkling. Prince Salim standing before the sculpture of an elephant in a characteristic mood, with grace and dignity. The artist understands the balance of design with form of expression. Sensibility with which he has drawn the graceful figure is most attractive. Chughtai always creates memorable and remarkable objects with great emotion and observation.

"APPEAR, O RIDER OF DESTINY!
APPEAR, O LIGHT OF THE DARK REALM OF CHANGE;
SILENCE THE NOICE OF THE NATIONS;
IMPRAISE OUR EARS WITH THY MUSIC;
ARISE AND TUNE THE HARP OF BROTHERHOOD,
GIVE US BACK THE CUP OF THE WINE OF LOVE!

IQBAL

دُخترِ حرم

وجودِ زن سے ہے تصویرِ کائنات میں رنگ
اسی کے ساز سے ہے زندگی کا سوزِ دروں

اقبال

دخترِ حرم
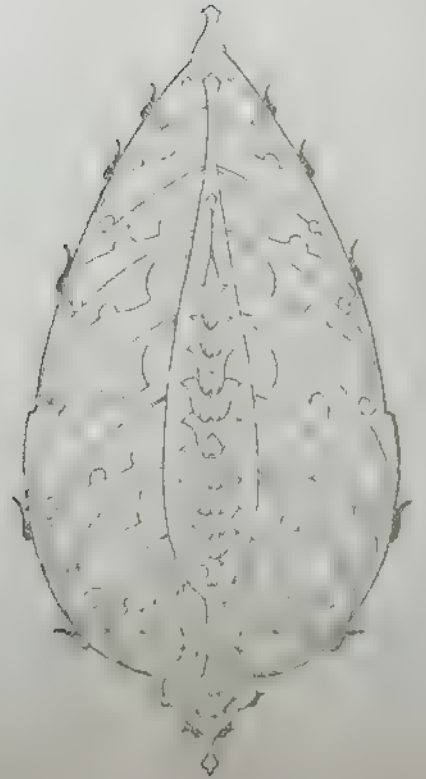
چغتائی کی کثر تصویروں کو دیکھ کر یہ احساس ہوتا ہے کہ وُہ ہزاروں سال سے قدیم انسانوں کے دوش بدوش زندگی گُذارتا چلا آ رہا ہے۔ اور اُس کا مشغلہ محض کلچر کا تصور نہیں بلکہ کلچر ہی اس کا ذریعہ اظہار ہے۔ اور اس سے نئی نئی روشنیاں بلا روک ٹوک اس تک پہنچتی ہیں۔ یہ تصویر اس پیکر کا ایک ولولہ انگیز تصور ہے۔ جس سے تہذیب تو نا آشنا ہی نہیں بلکہ اس کی اجنبیت سے محو حیرت ہے جب ہم اس کردار کو اس کی فسوں خیز جنبیت سے قریب ہو کر سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں تو یہ دُخترِ حرم ایک تہذیب ایک تمدن کا ایسا ستُون نظر آتی ہے۔ جس پر ہماری روایات، و روراثت کی تمام کائنات اپنی برتری کے ساتھ قائم ہے ایک ٹیس اُٹھتی ہے، ایک آہ نکلتی ہے اور اُٹھتی ہوئی نگاہیں اسے غور سے اور زیادہ غور سے دیکھنے لگتی ہیں۔ نئی نئی صُورتیں اور نئے نئے عنوان سُوجھتے ہیں۔ یہ ایک پیکر ہے عصمت وعفت، سیرت و تقدار کا، اس عالمگیر اخوت کا، اس مشرقی تہذیب کا اُس املاک کا جس سے شاعروں اور فنکاروں کو ہمیشہ لگاؤ رہا ہے۔

دخترِ حرم ایک ایسی دوشیزہ کا سراپا ہے جس کی سیرت کے سامنے دل اور سر جھک جاتے ہیں۔ چغتائی کے فن اور تخلیق کا انتہائی ارتقائی سلسلہ رنگوں کی حلاوت اور خطوں کے بناؤ اور لوچ لچک سے یُوں تو ہر جگہ موجود ہے لیکن ایسی پاکیزہ سیرت عورتیں، ایسے پختہ انسانوں کے کردار اور خدوخال خصُوصیت سے اسکے پیش نظر ہیں، جن سے مشرق کا انداز بدل سکے مشرق کے معاشرے میں ایک انقلاب بپا ہو سکے، اور اپنی دُنیا میں از سرِ نو فوق البشر اور فوق القوتیں آشکار ہوں تاکہ آج کا انسان فیت حاصل کر سکے۔ اور اپنا نصب العین بنا سکے۔

چغتائی کے فن کا اجتماعی تجزیہ فرد اور جماعت کا رشتہ ہے۔ انفرادیت اور سخت کوشی ارتقا کا معیار ہے جس سے زندگی کا تنوع بڑھتا ہے۔ اور وسیع النّظری پیدا ہوتی ہے۔ چغتائی نے تصویر کے پس منظر میں اسرار کُوٹ کُوٹ کر بھر دیئے ہیں۔ اور صدیوں کے ان پُر اسرار تصورات ہی کی بدولت دُخترِ حرم احترام و عقیدت کا سرچشمہ ہے۔ اُس کا نسوانی وقار اس کا انداز دلبری پس منظر کے اسرار کے ساتھ شامل ہو کر اس کی سیرت کی پاکیزگی کو اور بھی نمایاں کرتے ہیں۔ وہ مشاہدات کا سرمایہ اور حیات کا سرمایہ ہے۔ اور صدیوں کے جلوے اس کی ایک ایک کیفیت میں پوشیدہ ہیں اور اس کا کوئی امکان نہیں کہ زندگی کا وہ عظیم دھارا جو ہمارے گردو پیش ہے اس کو چھو سکے۔

چغتائی کو اپنے اس پیکر سے دلی اُنس اور لگاؤ ہے۔ اس سے پُوچھا جائے کہ اس لگاؤ کے اسباب کیا ہیں تو وُہ اس کا خالق ہوتے ہوئے بھی فوراً ان اوصاف کو نہیں گنوا سکتا، لیکن صاحب نظر فوراً ان اسرار کو محسوس کرنے لگتا ہے جو

آرٹسٹ نے اس کے انگ انگ میں چھپا دیے ہیں۔ ہلکے ہلکے جھلملاتے ہوئے بال، امنگوں کو ابھارتی ہوئی نگاہیں شبنم کے قطروں کی سی درخشانی، فرغل کا گہرا رنگ اور اس کا پھیلاؤ اور بناؤ ارتقا کے افسانوں کی وضاحت کرتا ہے۔ شاداب و زرّیں عروج زمانوں کی خصوصیات کی آئینہ دار یہ **دخترِ حرم** اس بات کا یقین دلاتی ہے کہ اس کی انفرادیت کا شعور قابل قبول ہے۔ اور اسکی ہیئت میں کسی قسم کا تذبذب نہیں۔

تصویر کی پُر وقار فضا اور اُس کے پُرشکوہ ماحول نے پنے گرد جو ہالہ بنایا ہے وہ ان والہانہ محبتوں کا کرشمہ ہے جو پس منظر اور پیکر سے ظاہر ہیں ؎

جلوۂ حُسن کہ ہے جس سے تمنا بے تاب
پالتا ہے جسے آغوشِ تخیّل میں شباب

ابدی بنتا ہے یہ عالمِ فانی جس سے
ایک افسانۂ رنگیں ہے جوانی جس سے

شرف میں بڑھ کے ثریا سے مُشتِ خاک اسکی
کہ ہر شرف ہے اسی دُرج کا دُرِ مکنُون

وجودِ زن سے ہے تصویرِ کائنات میں رنگ
اسی کے ساز سے ہے زندگی کا سوزِ درُوں
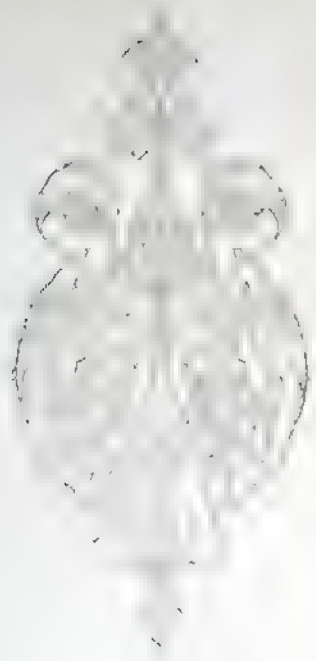
DAUGHTER OF THE HARAM

Chughtai beautifully gives expression of the idea of Daughter of the Haram. The atmosphere of solidity, seriousness and boldness have been drawn with rhythmical mood. The graceful and notable figure of the lady reveals her dignity. This picture is his masterpiece. It has the blend of emotions, feelings and of aesthetic sense. Chughtai is endowed with unusual gift of lofty understanding, exalted nature and sharp intellectual power. He always makes attempt to portray the pious and graceful ladies of the Haram.
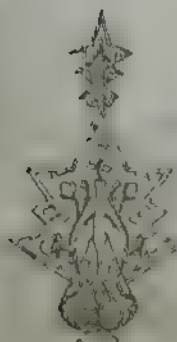
"THE COLOUR IN THE PICTURE OF THE UNIVERSE IS DUE TO WOMEN.
THE INNER BURNING OF LIFE IS DUE TO HER INSTRUMENT!
IN DIGNITY, HER HANDFUL OF DUST IS SUPERIOR TO THE PLEIADES.
FOR ALL DIGNITY IS THE SECRET PEARL OF THIS PRECIOUS BOX!

IQBAL

چشمِ نرگس

تو گوئی کہ یزدان بہشتِ برین را
نہاداست در دامنِ کوہسارے

اقبال

چشم نرگس

سُنا تھا کہ ایک آرٹسٹ کے لئے کشمیر دیکھنا اشد ضروری ہے۔ آج میں آرٹسٹ ہوں، اور جب کشمیر گیا تھا تو بھی آرٹسٹ تھا۔ میرا نظریۂ کشمیر ان دنوں بھی وُہی تھا اور آج بھی وُہی ہے کشمیر پہنچتے ہی یہ احساس پُختہ ہو گیا کہ یہ خطۂ زمین عدم نہیں یہاں کے باشندے غلام ہیں کشمیر میں پھل پھُول اُگتے ہیں فضا ہوتی ہے۔ بہار پہ بہار آتی ہے۔ پہاڑ جھُومتے ہیں۔ برفباری ہوتی ہے۔ شفق ورافق پر دل آویزی ہے۔ روح کی بالیدگی آسمانوں پہ کمندیں ڈالتی ہے۔ خوبصورت معصُوم چہرے صحت مند لوگ جنّت سے نکالے ہوئے معصوم ہوتے ہیں۔ جنّت جنّت کیا ہے جو اس بستی میں نہیں اور کیا ہے جس کا امکان وہاں موجود نہیں۔

آرٹسٹ جُوں جُوں بُلندیاں اور پستیاں دیکھتا چلا گیا۔ وہ نگاہ، وُہ بخشش، وُہ تاریکیاں، وُہ محکومیت کیا کیا اُس نے دیکھا ہوگا اُس نے یہ الفاظ دُہرائے کہ غلامی ہو یا آزادی کوئی تصوّر بغیر بصیرت حاصل نہیں ہوتا۔ غلامی کے اسباب اور غلامی کی ذہنی تصویریں دیکھتا گیا اور بناتا گیا۔ یہاں تک کہ غلامی کا تصوّر اس قدر پُختہ ہوتا گیا کہ غلامی سے ہٹ کر ذہنی تصویریں بنانے لگا۔ شدّت احساس سے پہاڑوں کی چوٹیوں پہ شفق کی تہوں میں کچھ اور ہی کروٹیں لیتا ہوا نظر آنے لگا۔ اسے آزادی کی کشادہ راہوں پر یک بگامر نظر آیا۔ ملاحظۂ بصیرت اس کی آنکھوں میں جچتی بھی نہ تھی کشمکش محسوس ہوتی رہی بخششیں پرتولتی ہیں جذبات میں وارفتگی پیدا ہوتی گئی وہ اپنی صحت مندی اور اپنی بصیرت سے کچھ کا کچھ دیکھنے لگا اور وُہ تصوّر اس کی تصویر میں حور اس من رہ۔ خوابِ چشمِ نرگس۔ سیبوں کے سائے۔ ڈل لیک۔ چشمۂ شاہی۔ اجنبی کردار اور میرے سیب جیسی تصویروں میں موجود ہے ایسے ہی جیسے کوئی اپنی بصیرت اپنی آزادی سے روشناس ہو چغتائی کی یہ تصویریں ان تصوّرات کا ایک خاکہ ہے جن سے کشمیر کے ہر باشندے کو اس کا حق پہنچتا ہے کشمیر اور کشمیر کے باشندوں کی ترجمانی کے سلسلے میں چغتائی نے جس قدر تصویریں بنائی ہیں اگر ان کو یک جا جمع کر دیا جائے تو کشمیر کی جمالیاتی کیفیت، اس کا حُسن و جمال، اُن کی زندگی کے امکانات کی یک ایسی تاریخ مرتب ہو جائے جیسی آرٹسٹ چاہتا ہے کہ یُوں نہیں یُوں ہوتا تو کیا ہوتا۔

چغتائی کا بیان ہے کہ علامہ نے کئی موقعوں پر فرمایا کہ یہ شعر، یہ نظمیں تصویروں کا مجمُوعہ ہیں۔ اُنھوں نے خاص طور پر میلادِ آدم کے متعلق چغتائی کو تصویریں بنانے کی تلقین کی اور شعروں پہ تبصرہ کرتے ہوئے کئی تصوّر پیش کئے۔ چغتائی کا ارادہ ہے کہ وہ ایک دن میلادِ آدم پر ایک مرقع شائع کرے گا۔ خطۂ کشمیر کا ذرّہ ذرّہ آرٹسٹ کو متاثر کرنے کے اسباب رکھتا ہے۔ یکے بہ موڑ پہ ایک تنومند سڈول جسم والا نوجوان، ایک تھکا ہارا بُوڑھا، آنکھوں میں چنگاریاں لئے، ایک حسین عورت ایک معصُوم دوشیزہ اپنے فرغل اور لبادوں میں لپٹی ہوئی ایک ایسی جنّت کا تصوّر پیش کرتی ہے، جہاں حور و غلماں انسانوں کی طرح اپنی زندگی کے

تقاضوں سے برسرِعمل ہیں اور یہی میلادِ آدم کا تصور ہے، جو جنت کو چھوڑنے پر مجبور ہوا۔ گر وہ وجد آفریں کیفیتیں جنھیں دیکھکر آرٹ کو پر لگ گئے تھے کشمیر میں بسنے والی قوم کا حصہ ہوتیں تو دُنیا کا ادب اور آرٹ خُدا جانے کہاں سے کہاں پہنچ جاتا۔ اس قوم کے حصے میں دُنیا بھر کی شہرت ہوتی۔ اور وہ ان نعمتوں سے مالا مال ہوتی جن سے دھرتی کا سینہ روشن ہے۔ کاش زندگی کے وسائل اُن کے ہاتھوں میں ہوتے۔ ہر چنگاری شعلہ بن کر بھڑک اُٹھتی اور ان پہاڑوں کی چوٹیوں سے جا چمٹتی جنھوں نے آج تک جھنگ کر اُن کی حالت زار کو نہیں دیکھا۔ اُن وادیوں کو نہیں دیکھا جن میں وُہ صدیوں سے اپنا خون پی پی کر سسک رہے ہیں۔

تصویر کا ترتیبی نظام اور رنگوں کا سیلاب ان لمحوں کی یاد دلاتا ہے جن لمحوں میں آرٹسٹ خود اپنا خون آپ پی جاتا ہے۔ اس کی یہ ایک ایسی فطری تخلیق اور تکمیل ہے جیسے کشمیر کو سب کچھ حاصل ہے۔ یہ ایک بشارت ہے جو ان فضاؤں اور حقیقتوں سے متاثر ہے جو آرٹسٹ چاہتا ہے اور اقبال اس کی آرزو کرتا ہے ؎

کشیری کہ پابندگی خو گرفتہ — بُتے می تراشد ز سنگِ مزارے
بریشم قبا خواجہ از محنتِ اُو — نصیبِ تنش جامۂ تار تارے
ضمیرش تہی از خیالِ بلندے — زخود ناشناسے زخود شرمسارے

آج وُہ کشمیر ہے محکوم و مجبور و فقیر
کل جسے اہلِ نظر کہتے تھے ایرانِ صغیر
آہ یہ قومِ نجیب و چرب دست و تر دماغ
ہے کہاں روزِ مکافات اے خدائے دیرگیر

چہ بے پروا گذشتند از نوائے صبحگاہِ من
کہ برد آن شورِ مستی از سیہ چشمانِ کشمیری

چھپے رہیں گے زمانہ کی آنکھ سے کب تک — گہر ہیں آبِ وُلر کے تمام یک دانہ

SPARKLING EYES

Chughtai has attained perfection in his art, and there is none to be comparee with him as an artist. He follows his own style and technique but never criticises others. As a revivalist of the Persian and Mughal art, he won international fame.

The characteristics of Chughtai's painting, as is evident in the sparkling eyes, depict him a romantic type of artist. Picture further shows the technical mastry of modern tendencies.

"NOT INCLINED TO WORSHIP THE APPARENT, I BROKE THE IDOL-HOUSE;
I AM THAT RUSHING TORRENT WHICH SWEEPS ASIDE ALL OBSTACLES.
ABOUT MY BEING OR NOT BEING, INTELLECT HAD DOUBTS,
LOVE REVEALED THE SECRET THAT I AM.

IQBAL

آہنگِ دلبری

اے اہلِ نظر ذوقِ نظر خوب ہے لیکن
جو شے کی حقیقت کو نہ سمجھے وُہ نظر کیا

اقبال

آہنگِ دلبری
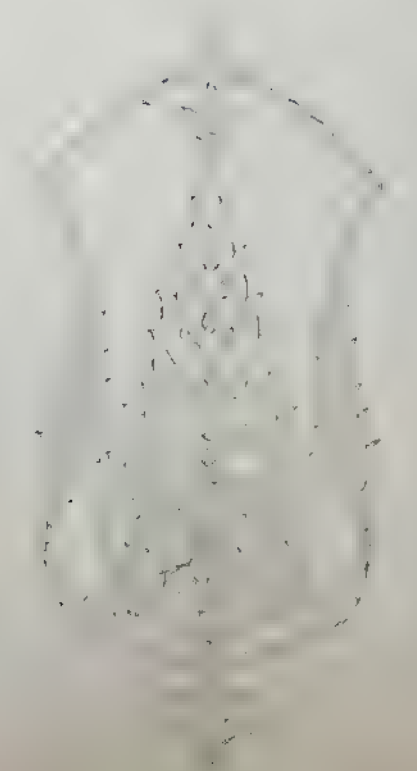
فیروزی، زمردی، نیلے اور بلّوری رنگ کے چھوٹے چھوٹے ریزے تصویر کی رُوح رواں نظر آتے ہیں۔ روپہلی زیور اور سفید موتی کاغذ کی رنگین سطح پر کچھ اس انداز سے بکھیر دئے گئے ہیں جیسے چراگاہوں میں بہار کی آمد پر ننھے ننھے خودرو پھول اپنی رنگین قباؤں میں رقصاں ہیں۔ ایسی شاعرانہ لطافتیں اور بخوبی بسری داستانیں مصوّر کی اکثر تصویروں میں چٹکیاں لیتی، زندگی کی حرکت کو جذبات کی کیفیات تک پہنچا دیتی ہیں۔

چغتائی کی ان شعلہ نوا تصویروں کے سامنے کھڑے ہوتے ہی یہ محسوس ہوتا ہے کہ فن سے اس کی والہانہ محبت کا اور سرشار ولولوں کا ایک آتشیں جذبہ، ترنم اور شعریت کی لے میں رچا ہوا، رنگوں اور خطوں کی نکھار میں گندھا ہوا پیش نظر ہے۔ کوئی اسے مغل اور کوئی اسے ایرانی اسکول کہہ اُٹھتا ہے۔ وہ سب کچھ ہے لیکن یہ آواز بہت کم سنائی دیتی ہے کہ اس کے فن کی انفرادیت، ہمہ گیری، انہماک اور طرز نگارش کہاں تک ایک دوسرے سے ہم آہنگ ہے۔ اور کہاں تک وہ نیا اسلوب اور نئی تکنیک پیش کرنے میں کامیاب ہوا ہے۔

بعض کا خیال ہے کہ چغتائی ہمیں صدیوں پیچھے لے جانے کا خواہش مند ہے وہ آج کے انسان کو ماضی کے اجڑے خوابوں میں دھکیل دینا چاہتا ہے ہم بھٹکتے در ٹھوکریں کھاتے پھریں لیکن بدقسمتی سے ہم یہ جاننے کی کوشش نہیں کرتے کہ چغتائی جیسا باکمال آرٹسٹ اپنے عمل پر کیوں ایقان اور اعتماد ظاہر نہیں کرتا، وہ کیوں اس کوشش میں منہمک ہے کہ اس ٹوٹے ہوئے رشتے کو جس سے ہم صدیوں دُور جا پڑے ہیں پھر سے جوڑ دے۔ جب ہم اپنی بدحالی سے دوچار ہوتے ہیں اور زمانے کی بدلتی ہوئی قدروں کو اپنے ماضی سے ہم آہنگ نہیں پاتے تو ایک آہ کھینچ کر یہ کہنے پر مجبور ہوتے ہیں کہ آج سے صدیوں پہلے ہم کیا تھے۔ ہمارے عمل اور ہمارے ارادوں میں کتنی مستعدی اور بلندی تھی۔ آج بھی اپنے غیر فانی املاک کو آسمان سے باتیں کرتے، دھرتی کے سینے پر بڑے طمطراق سے جھومتے دیکھ کر فرحت اور انبساط سے کہہ دیتے ہیں، یہ سب کچھ ان بخششوں کا حصہ ہے جو ماضی نے ہمیں بخشی ہیں۔ ان املاک میں انحطاط نہیں، محکومیت کی بُو نہیں۔ ان وسعتوں اور بلندیوں میں وہ تصوّر اور وہ امکانات پوشیدہ ہیں، جہاں انسانی عظمت شانِ رُبوبیت میں ڈھل جاتی ہے اور اس غرض سے ہتھیار ڈالتی ہے کہ فرست کی حدیں ختم ہیں۔ اور ارتقا کے رستے بند ہیں۔ ایسے ان مول لمحے فراموش کرنے والے بھی نہیں جو ہماری آزادی اور کھوئی ہوئی قوتوں اور ہمارے املاک کو زیادہ سے زیادہ بلند کرنے میں ہمارے معاون اور مددگار ہوتے ہیں۔ کیونکہ شاعر اور آرٹسٹ اُن قدیم عظمتوں کا ذکر اور ان حقیقتوں کا احترام اس وقت کرنے پر مجبور ہوتے ہیں جب ترقی پسندانہ رجحانات اور تہذیب و تمدن کی بدحالی معاشرے کا سہارا نہیں رہتی

موجودہ بدحالی اور موجودہ نظام کسی قیمت پر بھی ہمارے فنون کے انفرادی نشان نہیں۔ آؤ ہم چغتائی کی اِس تصویر میں مغربی نقطۂ نگاہ سے اسکے تاثر اور تشنگی دیکھنے کی کوشش کریں اور یہ بھی دیکھنے کی کوشش کریں کہ اُس نے اس تصویر میں مشرقیت کا سہارا لیتے ہوئے خود کس نگاہ سے دیکھا ہے۔ اصل میں باہمی آویزش اور نکتہ چینی ہی وُہ حقیقت ہے جو آرٹسٹ کی نگاہ کی ضمانت ہے۔ آرٹسٹ کیلئے یہ بھی ضروری ہے کہ نشوونما کے راستے تلاش کرنے پر بھی بدلتے ہوئے زمانے کے ساتھ تغیر پذیر ماحول اور اس ذہنیت کو بھی مطالعہ میں لائے جس سے اس کا فن معاشرے کا حصہ بنتا ہے۔ اور وُہ بدلتے ہوئے رُجحانات کے زیر اثر کہاں سے کہاں جا نکلا ہے اور تہذیب نو کے لئے اپنی تخلیق سے ہیئت اور مواد کو کس رنگ میں جنم دیا ہے کہ زندگی کا کیف اور زندگی کے تقاضے اپنے معیار پر پُورے اُترتے ہیں۔

چغتائی نے اس تصویر میں نہایت بلیغ انداز میں ایک معطّرِ شباب یک پُرکیف نکہت کی ترجمانی کی ہے جس میں زندگی کا رس ان دونوں محبُوبوں کے انگ انگ میں رچا ہوا ہے کہ تمنائیں جاگ اٹھتی ہیں اُمیدیں، انگڑائیاں لیتی ہیں، بجلیاں کوندنے لگتی ہیں جیسے ہم بھرپُور زندگی کے قریب اور آسُودہ زندگی کے سامنے ہیں ؎

مقصُودِ ہُنر سوزِ حیاتِ ابدی ہے
یہ ایک نفس یا دو نفس مثلِ شرر کیا

بے معجزہ دُنیا میں اُبھرتی نہیں قومیں
جو ضربِ کلیمی نہیں رکھتا وُہ ہُنر کیا

یاد ایام کہ خوردم بادہ ہا با چنگ و نے
جامِ مے در دستِ من مینائے مے در دستِ نے

آنچہ من در بزمِ شوق آوردہ ام دانی کہ چیست
یک چمن گُل یک نیستان نالہ یک خم خانہ مے

زندہ کُن باز آن محبت را کہ از نیروئے او
بوریائے رہ نشینے در فتد با تختِ کے

دوستان خرم کہ بر منزل رسید آوارۂ
من پریشان جادہ ہائی علم و دانش کردہ طے

THE MELODY OF LIFE

This is the most striking composition with intense light of two distinguished faces with unique illumination of the background. The attractive figures are in one direction and you will seldom find empty space in the picture. This decorative mood and simplicity is an expressive work of Chughtai.

Chughtai has successfully painted the state of his mind in the picture of the solitary atmosphere. Apart from the composition its colour scheme is marvellous. The combination of cool green colour. The expression, feelings of the figure are exquisite.

"SONG SHOULD BE VIOLENT LIKE A STORM
SO THAT IT MAY REMOVE FROM THE HEART THE CLOUDS OF GRIEF.
IT SHOULD BE NOURISHED ON ECSTASY—
A FIRE DISSOLVED IN THE BLOOD OF THE HEART.
IT IS POSSIBLE TO DEVELOP FLAME OUT OF ITS WETNESS,
AND MAKE SILENCE A PART OF IT.

IQBAL

گُل خنداں

بہار تا بہ گُلستاں کشید بزم سرود
نوائے بُلبُلِ شوریدہ چشمِ غنچہ کشود

اقبال

گُلِ خنداں

ہر کردار جو کلچر کی نمائندگی کا حق رکھتا ہے. صدیاں گزر جانے پر بھی دل و دماغ سے محو نہیں ہوتا۔ واقعات کی تاریخی اہمیت اور کرداروں کے کارہائے نمایاں سے جس کردار کی وحدت وجود میں آتی ہے۔ ہم سے کتنا ہی سر ہیں کتنا ہی پرکھیں اور اس پر کتنی ہی نکتہ چینی کریں کردار کی نفرادیت اور کیفیات میں کوئی کمی واقع نہیں ہوتی۔ فنون جمیلہ موسیقی۔ رقص یہاں تک کہ جنگ و جدل زندگی کے وُہ تغیر پذیر عناصر ہیں جن سے انفرادیت اُبھرتی ہے اور ماضی روشن ہوتا ہے۔ آرٹسٹ ہو یا شاعر وُہ اپنے مقاصد کے تعین اور جدید نظریوں اور نئے تقاضوں کا تسلسل قائم کرنے میں اپنے ماضی سے مدد لیتا ہے۔ وُہ عقل و وجدان کے وسائل کو بھی اپنی بصیرت سے مستحکم کرکے اپنے ماضی ہی سے جا ملاتا ہے۔

چغتائی کا بیان ہے۔ جب سے اُس نے اپنے ذہنی دھارے کا اپنے نظریۂ فن کی طرف رُخ کیا ہے۔ اُس وقت سے اب تک ایک گروہ کسی نہ کسی شکل میں بڑی دیدہ دلیری اور بددیانتی سے اُس کے مُدعا کی مخالفت کر رہا ہے۔ یہ گروہ نیا ہو یا پُرانا سمجھتا ہے کہ اس کی معاندانہ روش کے باعث چغتائی کو اپنے آپ پر اعتماد نہ رہے گا اور وُہ اپنے بُرش اور رنگ چھوڑ کر اپنے عظیم مُدعا سے مُنہ موڑ لے گا۔ اور ان کی کھوکھلی نکتہ چینی سے چغتائی چغتائی نہ رہے گا۔ پر چغتائی آج اپنے کمالِ فن اور اپنی خود اعتمادی کے باعث ایک ایسے مقام پر کھڑا ہے کہ اگر وہ خود بھی چاہے کہ چغتائی **چغتائی** نہ رہے تو یہ اُس کے بس کی بات نہیں۔

چغتائی کا آرٹ ہمارے ماضی کا ایک دھارا ہے۔ جو حال اور مستقبل کی تلاش میں رواں دواں ہے۔ یہ محض اسکا ذہنی کرشمہ نہیں۔ اس کی ان تھک کوششیں معاشرے کے تقاضوں سے وابستہ ہیں۔ اس کا فن برائے زندگی ہے۔ اس کا اپنا ایک کردار ہے۔ وُہ ہمارے امراض کا مسیحا ہے۔ اس کے مشن کو اس کے معاشرے سے بھی کہیں زیادہ تجاوز کرنے کی ضرورت ہے۔ اُس نے ان رُجحانات کی وضاحت کی ہے جو صدیوں سے مشرق کی سرزمین پر اُبھرے۔ مگر ہر بار رہبانیت اور قنوطیت کا شکار ہو گئے اس نے نقوش کو جلا دے کر تجریدی شاہراہوں کی طرف دھکیل دیا ہے۔ تاکہ اس کی تحریک عالمگیر صُورت اختیار کر جائے۔ وزیر بادشاہ۔ خلفاء۔ دُخترِ حرم بنت اُمم۔ شہزادیاں۔ شہزادے۔ مجاہد۔ شاہین زادے۔ مزدور اور کسان تک کوئی کردار ہو پھر مشرق مشرق بن جاتا ہے چغتائی کے آرٹ نے ان کرداروں کی ترجمانی میں کبھی کوتاہی نہیں کی۔ اس نے فنی انہماک، جمالیاتی تصور، وضع قطع خدوخال اور طرزِ نگارش سے ہمیشہ اپنے مشرقی تصور کو فوقیت دی ہے۔ اس کی مشرقیت سے اگر اناڑی لوگ جھنجلائیں یا اس کی عظمت کو جھٹلائیں تو اس سے اس کے مدعا اور ہر دل عزیزی کو کوئی صدمہ نہیں پہنچتا۔ دیکھا جائے تو مغرب کا سارا آرٹ بادشاہوں آقاؤں

شہزادوں، شہزادیوں، بیگموں اور خدمت گذاروں سے بھرا پڑا ہے۔ مقدس مائیں اور مقدس باپ اس درجہ ان کے دماغوں پر چھائے ہیں کہ آج بھی گوگیں۔ فان گوگ۔ متیثے اور پکاسو تک سر جھکائے ہیں۔ اور یہی اُن کی ثقافتی دولت اور اُن کے شاہکار ہیں۔ ان شاہکاروں کی کلاسیکی حیثیت ہی ان کی سلامتی کی ضامن ہے۔ وین آئیک رو بنز۔ ال گریکو۔ ڈیورر۔ ہالبین اور ریمبران تک ایرانی اور مغل مصوروں سے کہیں زیادہ درباروں کی سرپرستی میں پھلے پھولے۔ وہ اپنے عرفانی فن سے درباروں کے مذاق و رنگو کی دیکھ بھال کرتے رہے ہیں۔

دُنیائے عظیم آرٹسٹوں کی طرح کون سا موضوع ہے جو چغتائی کی تصویروں میں نہیں ملتا۔ کون سا جذبہ ہے جس کی حدت کو اُنہوں نے قبول نہیں کیا۔ گل نغمہ سرائی کی یہ مغل شہزادیاں اپنی تہذیب و تمدن کی نمائندہ ہیں۔ اُن کا رشتہ اس معاشرے سے ہے جو ہماری ثقافت کا ذمہ دار ہے۔ فرد اور افراد کا حصہ ہر قوم میں فرقِ مراتب کے مطابق تقسیم ہوتا چلا آیا ہے۔ بلند نگاہی اور بلند ہمتی ایک ایسی دولت ہے جس کے حصول کے لئے علیحدہ علیحدہ مقام اور رُتبے ہیں۔

چغتائی نے یہ تصویر اپنی تہذیب اور ثقافت میں رچ کر خونِ جگر سے سینچی ہے اسکے رنگوں کے اُتار چڑھاؤ اور نقوش کے لب و لہجہ میں ایسی توانائی، اور ایسی لطافت موجود ہے جو ایک مغربی یہ دل اس سے لُطف اندوز ہوتے ہوئے بھی سیر نہیں ہوتا جو اس کے تہذیبی ورثے کا حصہ ہے۔ یہ خوش اندام مغل شہزادیاں زندگی کی پیامبر زندگی کی فراوانی سے مالا مال ہیں یوں معلوم ہوتا ہے کہ ان کا ہر سانس اور ادا اقبال کی دُعا ہے اور وہ سماجی طبقات سے بے نیاز ہیں ؎

گُل گفت کہ عیشِ نوبہارے خوشتر — یک صُبح چمن ز رُوزگارے خوشتر
زان پیش کہ کس ترا بہ دستار زند — مُردن بکنارِ شاخسارے خوشتر

خیز کہ در باغ و راغ قافلۂ گُل رسید
بادِ بہاران وزید مُرغِ نوا آفرید
لالہ گریبان درید حُسنِ گُل تازہ چید
عشق غمِ نو خرید — خیز کہ در باغ و راغ قافلۂ گُل رسید

THE MUGHAL PRINCESSES

Chughtai made many important paintings from Mughal history. He always paints with love and regard. In this painting he shows his tendency to express the glory of the great Mughals.

There are many vertical lines and contrast, which flourished with supreme quality and beauty. The artist frequently uses ornamental elements and decorative patterns such as we find in many of his paintings.

The figures are admirably contrasted against their setting under the open air atmosphere in a typical Mughal Garden. Its colour scheme is an extraordinary rich, pure and harmonious rendering of the subject of the picture.
The painting was exhibited in India, the Royal Academy, London, Rega, Paris and Pakistan.

"ARISE! FOR HILLS AND DALES
THE SPRING HAS ARRIVED!
MAD IN SINGING ARE NIGHTINGALES
CUCKOOS, PARTRIDGES, AND QUAILS,
ALONG THE BANKS OF THE BROOK
HAVE SPRUNG ROSES AND THE POPPY,
COME OUT AND SEE.
ARISE! FOR ON HILLS AND DALES
THE SPRING HAS ARRIVED!

IQBAL

GOD'S COMMAND TO HIS ANGELS

Rise, and from their slumber wake the poor ones of My world !
Shake the walls and windows of the mansions of the great !
Kindle with the fire of faith the slow blood of the slaves !
Make the fearful sparrow bold to meet the falcon's hate !
Close the hour approaches of the kingdom of the poor –
Every imprint of the past find and annihilate !
Find the field whose harvest is no peasant's daily bread –
Garner in the furnace every ripening ear of wheat !
Banish from the house of God the mumbling priest whose prayers
Like a veil creation from Creator separate !
God by man's prostrations, by man's vows are idols cheated—
Quench at once in My shrine and their fane the sacred light !
Rear for me another temple, build its walls with mud –
Wearied of their columned marbles, sickened is My sight !
All their fine new world a workshop filled with brittle glass—
Go ! My poet of the East to madness dedicate.

—Bal-i-Jibreel

GOD AND MAN

I MADE this world, from one same earth and water.
You made Tartaria, Nubia, and Iran.
I forged from dust the iron's unsullied ore,
You fashioned sword and arrowhead and gun ;
You shaped the axe to hew the garden tree,
You wove the cage to hold the singing-bird.

MAN

You made the night and I the lamp,
And You the clay and I the cup ;
You—desert, mountain-peak, and vale :
I—flower-bed, park and orchard ; I
Who grind a mirror out of stone,
Who brew from poison honey-drink.

—Pyam-i-Mashriq

Out of leaden sleep
Out of slumber deep
Arise !
Out of slumber deep
Arise !
Thou art true and worshipful
Guardian of eternal Rule,
Thou the left hand and the right
Of the world-possessor's might.
Shackled slave of earthy race,
Thou art Time, and thou art Space :
Wine of faith that fear defies
Drink, and from doubt's prison rise !
Out of leaden sleep,
Out of slumber deep
Arise !
Out of slumber deep
Arise !
Against Europe, I protest
And the attraction of the West :
Woe for Europe and her charm,
Swift to capture and disarm !
Europe's hordes with flame and fire
Desolate the world entire ;
Architect of Sanctuaries,
Earth awaits rebuilding ; rise !
Out of leaden sleep
Out of slumber deep
Arise !
Out of slumber deep
Arise !

—Zabur-i-Ajam

And a wasted sigh and spent :
Yet each atom of this earth
Is a gaze of tortured birth.
Under Ind's and Persia's skies,
Through Arabia's plains, rise !

Out of leaden sleep,
Out of slumber deep
Arise !
Out of slumber deep
Arise !

See thy ocean is at rest,
Slumberous as a desert waste ;
Yea, no waxing or increase
E'er disturbs thy ocean's peace.
Ne'er thy ocean knoweth storm
Or Leviathan's dread swarm :
Rend its breast and billow-wise
Swelling into tumult, rise !

Out of leaden sleep,
Out of slumber deep
Arise !
Out of slumber deep
Arise !

Listen to this subtlety
That reveals all mystery :
Empire is the body's dust,
Spirit, true Religion's trust ;
Body lives and spirit lives
By the life their union gives.
Lance in hand, and sword at thighs,
Cloaked, and with thy prayer-mat, rise !

OUT OF SLUMBER DEEP ARISE

Little flower fast asleep,
Rise narcissus-like, and peep ;
Lo, the bower droops and dies
Wasted by cold griefs ; arise !
Now that birdsong fills the air
And muezzins call to prayer,
Listen to the burning sighs
Of the passionate hearts, and rise !
        Out of leaden sleep,
        Arise—Out of slumber deep
                Arise !
        Out of slumber deep
                Arise !
Now the sun, that doth adorn
With his rays the brow of morn,
Doth suffuse the cheeks thereof
With the crimson blush of love.
Over mountain, over plain
Caravans take route again ;
Bright and world-beholding eyes,
Gaze upon the world, and rise !
        Out of leaden sleep
        Out of slumber deep
                Arise !
        Out of slumber deep
                Arise !
All the Orient doth lie
Like strewn dust, the roadway by,
Or a still and hushed lament

See how those colours change, there in that azure vault !
Drowned in twilight, a cloud hangs over vale and hill,
Heaped by this sunset with red rubies of Badakhshan.
Simple, poignant, a girl singing her peasant song ;
Youth is the current that bears lightly the boat of the heart.
Flowing Guadalquivir ! Here on your bank is one
Gazing at things gone by dreams of another day.
Destiny's curtain till now muffles the world to be,
Yet, already, its dawn stands before me unveiled ;
Were I to lift this mask hiding the face of my thoughts,
Europe could never endure songs as burning as mine !
Death, not life, is the life no revolutions stir :
Change, upheaval, the air breathed by the nations' souls ;
Keen as a sword that Fate holds in its hand is a folk
Mindful to reckon its deeds, casting their sum in each age.
Warmed by no blood from the heart, all man's creations are botched ;
Warmed by no blood from the heart, poetry's rapture grows faint.

—Bal-i-Jibreel

THE EARTH IS GOD'S

Who rears the seed in the darkness of the ground ?
Who lifts the cloud up from the ocean wave ?
Who drew here from the west the fruitful wind ?
Who made the soil, or who that light of the sun ?
Who filled with pearls of grain the tasselled wheat ?
Who taught the months by instinct to revolve ?
Landlord ! this earth is not thine, is not thine,
Nor yet thy fathers' ; no, not thine, not mine.

—Bal-i-Jibreel

Ah, those proud cavaliers, champions Arabia sent forth,

Pledged to the splendid Way, knights of the truth and the creed !

Through their empire a strange secret was understood :
Friends of mankind hold sway not to command but to serve.
Europe and Asia from them gathered instruction : the West
Lay in darkness, and their wisdom discovered the path.
Even to-day in this land rich with their blood, dwells a race
Carefree, open of heart, simple and smiling-faced ;
Even to-day in this land eyes like the soft gazells's
Dart those glances whose barbs stick in the breast where they fall ;

Even to-day in its breeze fragrance of Yemen still floats.
Even to-day in its songs echoes live on of Hejaz.
Under the stars your realm lies like a heaven ; alas !
Ages are fled since your courts heard their last prayer-call sound.

What new halting-place now, what far valley, has love's
Dauntless caravan reached, treading its stormy road?
Germany saw, long since, Reformation's rough winds
Blotting the old ways out, sweeping away every trace,
Vicars of Christ and their pomp dwindling to lying words,
Reason's fragile bark launched once more on its course;
Under the eyes of France, Revolution long since
Fashioned anew the whole world known to the men of the West ;

Rome's chief daughter, grown old worshipping ancient things.
Led by desire of Rebirth found she too, second youth.
Now in the soul of Islam tumults like those are astir,
Working God's secret will: tongue cannot tell what they mean.
Watch ! from that ocean-depth –what comes surging at last !

Never can Muslim despair : he, reciting his creed,
Stands before God where once Moses and Abraham stood,
Limitless is his world, endless horizons are his,
Tigris and Danube and Nile billows that roll in his sea ;
Fabulous days have been his, strange are the tales he can tell,
He who to ages outworn brought the command to depart ;
He who gladdens the gay, rides in the lists of Love,
Pure and unmixed his cup, tempered and pure his steel,
Warrior armed in this mail : There is no god but God,
Under the shadow of swords refuged by no god but God.
Here stands his inmost self manifest in your stones,
Fire of passionate days, rapture of melting nights ;
Here his high station displayed, here his high-mounting thoughts,
Here his joy and desire, self-abasement and pride.
As is the hand of God, so the Believer's hand,
Potent, guided by craft, strong to create and to rule.
Fashioned of dust and light, creature divine of soul,
Careless of both the worlds beats his not humble heart ;
Frugal of earthly hope, splendid of purpose, he earns
Friendship with courteous mien, wins every voice by his glance ;
Mild in the social hour, swift in the hour of pursuit,
Whether in feast or in fray pure in conscience and deed.
Round His servant's firm faith God's great compasses turn ;
All this universe else shadow, illusion and myth.
He is Reason's last goal, he is the harvest of Love,
He in creation's hall sets all spirits ablaze.
Shrine of the lovers of art ! Visible power of the Faith !
Sacred as Mecca you made, once, Andalusia's soil.
If there is under these skies loveliness equal to yours,
Only in Muslim heart, nowhere else can it be.

Ages as yet unnamed far from this now-flowing hour,
Love is Gabriel's breath, Love is Mahomed's strong heart,
Love is the envoy of God, Love the utterance of God.
Even our mortal clay, touched by Love's ecstasy, glows ;
Love is a new-pressed wine, Love is the goblet of kings,
Love the priest of the shrine, Love the commander of hosts,
Love the son of the road, counting a thousand homes.
Love's is the plectrum that draws music from life's taut strings—
Love's is the warmth of life. Love's is the radiance of life.
Shrine of Cordoba ! from Love all your existence is sprung,
Love that can know no end, stranger to Then-and-Now.
Colour or stone and brick, music and song or speech,
Only the heart's warm blood feeds such marvels of craft ;
Flint with one drop of that blood turns to a beating heart—
Melody, mirth and joy gush out of warm heart's blood.
Yours the soul-quickening pile, mine the soul-kindling verse,
Yours to knock at men's hearts, mine to open their gates.
Not less exalted than high Heaven is the human breast.
Handful of dust though it be, bounded by that blue sky,
What, to Him Who is Light, is it to watch men kneel?
He cannot feel this fire melting our limbs as we pray.
I from the infidel East—see with what fervour I glow,
Blessings on God and His Saint filling my soul and my mouth:
Fervently sounds my voice, ardently sounds my lute,
God is God, like a song, thrilling through every vein !
Outward and inward grace, witness in you for him.
Prove your builder, like you, fair of shape and soul ;
Firm those foundations are fixed, countless those pillars soar
Like an array of palms over the Syrian sands.
Light such as Moses beheld gleams on those walls, that roof,
High on that minaret's top Gabriel sits enthroned !

جزیرۂ سسلی

رو لے اب دل کھول کر اے دیدۂ خوں نابہ بار
وہ نظر آتا ہے تہذیبِ حجازی کا مزار

تھا یہاں ہنگامہ ان صحرا نشینوں کا کبھی
بحر بازی گاہ تھا جن کے سفینوں کا کبھی

زلزلے جن سے شہنشاہوں کے درباروں میں تھے
بجلیوں کے آشیانے جن کی تلواروں میں تھے

اِک جہانِ تازہ کا پیغام تھا جن کا ظہور
کھا گئی عصرِ کہن کو جن کی تیغِ ناصبور

مُردہ عالم زندہ جن کی شورشِ قم سے ہوا
آدمی آزاد زنجیرِ توہم سے ہوا

غلغلوں سے جسکے لذّت گیر اب تک گوش ہے
کیا وہ تکبیر اب ہمیشہ کیلئے خاموش ہے؟

آہ! اے سِسلی، سمندر کی ہے تجھ سے آبرو
رہنما کی طرح اِس پانی کے صحرا میں ہے تُو

زیب تیرے خال سے رخسارِ دریا کو رہے
تیری شمعوں سے تسلی بحر پیما کو رہے

ہو سبک چشمِ مسافر پر ترا منظر مدام — موج رقصاں تیرے ساحل کی چٹانوں پر مدام

تو کبھی اس قوم کی تہذیب کا گہوارہ تھا
حسنِ عالم سوز جس کا آتشِ نظارہ تھا

نالہ کش شیراز کا بلبل ہوا بغداد پر — داغ رویا خون کے آنسو جہاں آباد پر

آسماں نے دولتِ غرناطہ جب برباد کی — ابنِ بدروں کے دلِ ناشاد نے فریاد کی

غم نصیبِ اقبال کو بخشا گیا ماتم ترا
چن لیا تقدیر نے وہ دل کہ تھا محرم ترا

ہے ترے آثار میں پوشیدہ کس کی داستاں؟ — تیرے ساحل کی خموشی میں ہے انداز بیاں؟

درد اپنا مجھ سے کہہ، میں بھی سراپا درد ہوں — جس کی تو منزل تھا، میں اس کارواں کی گرد ہوں

رنگ تصویرِ کہن میں بھر کے دکھلا دے مجھے — قصہ ایامِ سلف کا کہہ کے تڑپا دے مجھے

میں ترا تحفہ سوئے ہندوستاں لے جاؤں گا
خود یہاں روتا ہوں، اوروں کو وہاں رلواؤں گا

Day succeeding to night—moulder of all time's works!
Day succeeding to night—fountain of life and of death!
Chain of the days and nights—two-coloured thread of silk
Woven by him that is into His being's robe!
Chain of the days and nights—sigh of eternity's harp,
Height and depth of all things possible, God-revealed.
You are brought to their test; I am brought to their test—
Day revolving with night touchstone of all this world;
Weighed in their scales you and I weighed and found wanting, shall both
Find in death our reward, find in extinction our wage;
What other sense have your nights, what have your days, but one
Long blank current of time empty of sunset or dawn?
All Art's wonders arise only to vanish once more;
All things built on this earth sink as if built on sand!
Inward and outward things, first things and last, must die;
Things from of old or new-born find their last goal in death.
Yet, in this frame of things, gleams of immortal life
Show where some servant of God wrought into some high shape
Work whose perfection is still bright with the splendor of Love—
Love, the well-spring of life; Love on which death has no claim.
Swiftly its tyrannous flood time's long current may roll:
Love itself is a tide, stemming all opposite waves.
Other ages in Love's calendar are set down.

TO THE EARTH

"If thou hadst known Thy priceless trust thou would'st
Not grieve. For if thou look'st within thy soul
Thou'lt find tumultuous life to brighten up
Thy days and spurn the Outer source of light.
What makes the morning bright? the spotted sun !
From stainless life thy light will come. This light
Will move in pathless spaces faster than
The moonbeams or the sun's rays. Hast thou washed
Hope's limning from the tablet of thy soul?
It is from thy own dark dust that the glow
Of life will come. Man's knowledge will invade
All space, his love will claim the infinite.
With eyes more wakeful than e'en Gabriel's,
He'll find the way unled. Though moulded out
Of clay he will like the angels soar, until
The sky will be a tavern old upon
The path he treads. The texture of this vault
He will pierce just as a needle runs through silk.
And wash the cloth of life of all its stains.
His glance will make the murky earth aglow.
Though little given to prayer and disposed
To bloodshed, yet a spur he will be for time.
He from the universe will learn to see
The being in Attributes. "He who is lost
In rapture o'er the beauty of the Lord
Becomes the monarch of all living things".

Javid Nameh

Past moon and sun I journeyed,
To where God sits enskied;—
In all your world no atom
Is kin of mine, I cried :
Heartless that world, this handful
Of dust all heart, all pain ;
Enchantment fills Your garden,
But I sing there in vain.
—There gathered on His lips a smile ;
He smiled and did not speak.

—Pyam-i-Mashriq

GHAZAL

Slow fire of longing—wealth beyond compare;
I would not change my prayer-mat for Heaven's chair!
Ill fits this world Your freemen, ill the next
Death's hard yoke frets then here, life's hard yoke there.
Close veils inflame the loiterer in Love's Lane;
Your long reluctance fans my passion's flare.
The hawk lives out his days in rock and desert,
Tame nest-twig-carrying his proud claws forswear.
Was it book-lesson or father's glance, that taught
The son of Abraham what a son should bear?
Bold hearts, firm souls, come pilgrim to my tomb;
I taught poor dust to tower hill-high in air.
Truth has no need of me for tiring maid;
To stain the tulip red is Nature's care.

—Bal-i-Jibreel

SOLITUDE

I STOOD beside the ocean
And asked the restless wave—
To what eternal troubling,
To what quest are you slave?
With orient pearls by thousands
Your mantle's edges shine.
But is there in your bosom
One gem, one heart, like mine?
—It shuddered from the shore and fled,
It fled, and did not speak.
I stood before the mountain,
And said,—Unpitying thing!
Could sorrow's lamentation
Your hearing never wring?
If hidden in your granite
One ruby blood-drop lie,
Do not to my affliction
One answering word deny!
—Within its cold unbreathing self
It shrank, and did not speak.
I travelled a long pathway:
And asked the moon—Shall some
Far day, oh doomed to wander,
Or no day, end your doom?
Our earth your silver glances
With lakes of jasmine lace;
Is it a heart within you
Whose hot glow sears your face?
—It stared with jealous eyes towards
The stars, and did not speak.

GABRIEL AND SATAN

GABRIEL

COMARADE of ancient days ! how fares the world of sight and sound ?

SATAN

In fire and rage and grief and pain and hope and longing drowned.

GABRIEL

No hour goes by in Paradise but your name is spoken there ;
Is it not possible that rent robe be mended that you wear?

SATAN

Ah, Gabriel ! you have never guessed my mystery ; alas—
Maddened for ever I left upon Heaven's floor my broken glass.
Impossible, oh ! impossible, I should dwell here again ;
Silent, how silent all this realm—no place no loud lane !
I whose despair is the fire by which the universe is stirred.
What should I do all hope renounce, or hope yet in God's word?

GABRIEL

Your mutiny has put our high estate in Heaven to shame ;
In the Creator's eye what credit now can angels claim?

SATAN

But in Man's pinch of dust my daring spirit has breathed ambition
The Warp and woof of mind and reason are woven of my sedition.
The deeps of good and ill you only see from land's far verge :
Which of us is it, you or I that dares the tempest's scourge?
Your ministers and your prophets are pale shades : the storms I teem.
Roll down ocean by ocean, river by river stream by stream !
Ask this of God, when next you stand alone within His Sight—
Whose blood is it has painted Man's long history so bright?
In the heart of the Almighty like a pricking thorn I lie ;
You only cry for ever God, oh God, oh God most high !

—Bal-i-Jibreel

Denied celestial grace a nation goes
No further than electricity or steam ;
Death to the heart, machines stand sovereign,
Engines that crush all sense of human kindness
—Yet signs are counted here and there that Fate,
The chess-player, has checkmated all their cunning.
The Tavern shakes, its warped foundations crack,
The old Men of Europe sit there numb with fear ;
What twilight flush is left those faces now
Is paint and powder or lent by flask and cup.
Omnipotent, righteous, Thou ; but bitter the hours,
Bitter the labourer's chained hours in Thy World !
When shall this galley of Gold's dominion founder?
Thy world Thy day of Wrath, Lord, stands and waits.

—Bal-i-Jibreel

DAWN IN THE GARDEN

FLOWER

PERHAPS you fancied
My land far off, sky-herald!
No, it is not far.

DEW

But only labouring wings
Prove earth not far from heaven !

DAWN

Softly as morning,
Not trampling its dewdrop pearls
Enter this garden.
Clasp hill and desert yet still
Catch in your hands the sky's robe.

—Zarb-i-Kalim

LENIN BEFORE GOD

All space and all that breathes bear witness ; truth
It is indeed ; Thou art and dost remain.
How could I know that God was or was not,
Where Reason's reckonings shifted hour by hour?
The peerer at planets, the counter-up of plants,
Heard nothing there of Nature's infinite music ;
To-day I witnessing acknowledge realms.
That I once thought the mummery of the Church.
We, manacled in the chains of day and night !
Thou, moulder of all time's atoms, builder of aeons !
Let me have leave to ask this question, one
Not answered by the subtleties of the schools,
That while I lived under the sky-tent's roof
Like a thorn rankled in my heart, and made
Such chaos in my soul of all its thoughts,
I could not keep my tumbling words in bounds.
Oh, of what mortal race art Thou the God?
Those creatures formed of dust beneath these heavens?
Europe's pale cheeks are Asia's pantheon,
And Europe's pantheon her glittering metals.
A blaze of Art and Science lights the West
With darkness that no fountain of life dispels ;
In high-reared grace, in glory and in grandeur,
The towering Bank out-tops the cathedral roof ;
What they call commerce is a game of dice.
For one profit, for millions swooping death.
There science, philosophy, scholarship, government,
Preach man's equality and drink men's blood ;
Naked debauch, and want, and unemployment—
Are these mean triumphs of the Frankish arts !

بسم الله الرحمن الرحيم

POEMS FROM IQBAL

INVOCATION TO THE PERFECT MAN

Appear, O rider of Destiny!
Appear, O light of the dark realm of Change!
Illumine the scene of existence,
Dwell in the blackness of our eyes!
Silence the noise of the nations,
Imparadise our ears with thy music!
Arise and tune the harp of brotherhood,
Give us back the cup of the wine of love!
Bring once more days of peace to the world,
Give a message of peace to them that seek battle!
Mankind are the cornfield and thou the harvest,
Thou art the goal of Life's Caravan.
The leaves are scattered by Autumn's fury.
Oh, do thou pass over our gardens as the Spring!
Receive from our downcast brows
The homage of little children and of young men and old!
It is to thee that we owe our dignity,
And silently undergo the pains of life.

—Asrar-i-Khudi

and assessments by leading art critics. His paintings adorn the renowned collections of the world. He has contributed to almost every great exhibition held anywhere his paintings have been hung in the exhibitions held in India, Poland, Holland, France, Germany, Russia, America and in the Royal Academy of London. In 1934 the British Government bestowed upon him the title of Khan Bahadur in recognition of his artistic talents which today sounds like a legend. Government of Pakistan honoured him with the title of Hilal-i-Imtiaz (the order of the Crescent of Merit). His characteristic, individual style, his technique and his productions have been termed as Chughtai Art and Chughtai school. His art reflects a glory akin to that of the art of architecture and a fluidity and uprightness of calligraphy, and his lasting colours are like those of the carpet which are the products of his own country and community.

Chughtai is an artist but he is also a great collector. His collection contains rare Iranian miniatures and manuscripts; and such miniatures of the Mughal and Kangra schools, which are not to be found not only anywhere else in our own country but are seldom to be found even in a vast country like India. Besides Persian, Mughal and Rajput miniatures, his collection also comprises a very rare and fine collection of Muslim Calligraphy from the 14th to the 19th century. He has also original etchings and engravings of great European masters of the 14th to the 16th century; in these he has the work of Rembrandt, Durer, Rubens and other well-known artists of France, Germany, Italy and Belgium etc.; and a series of Japanese colour woodcut prints.

Chughtai is determined that if he lives long enough and the admirers of art make an enthusiastic demand of it, he will fulfil this ambition of his at all cost, especially because almost the whole of the literary, decorative and the illustrative materials for the intended publication are ready for the press. This is the outcome of his continuous, hard labour extending over not less than fifteen years.

Raza Abbasi, Faruk Beg, Nadir-ul-Asar, Syed Mir Ali, Khwaja Abdus Samad Shirazi just as the Western artists have done in the search of their ideals to enhance the prestige of their art. And it is necessary that, in order to draw the attention of our people to the creed of art, we should recount the social order and conditions of our past artists and should make use of the accruing similitudes and should cast our creative pattern in such moulds with which we wish to keep ourselves linked.

Chughtai's art has passed through various phases and in every period he has established his individuality. And up till now he has not given up his pencil and brush. It seems that the focus of his studies has been Iranian, Mughal, and Rajput painting. On being asked, Chughtai remarked that he felt that in comparison with the sincerity and the broadmindedness with which he had studied the Western art, he had not yet even looked enough at the Eastern art. He said that in pursuance of his studies of Western art he surveyed every inch of Italy; he journeyed to every corner of Germany; he travelled throughout the length and breadth of France, and explored every corner of Great Britain; and to refresh his studies he went again to Europe. He claims that he has exerted all his talents to comprehend the modern abstract art and all that he has inferred is this, that the right path for the Oriental arts lies in his adherence to the Oriental traditions just as the salvation of the whole of the East lies in its Orientalism. He has depicted such characters as bear the characteristics of an eagle, such dauntless, daring persons, such veteran holy warriors, and such lovely ladies who represent the glories of our culture and of our cultural values. His Etchings are a splendid contribution to our art and through this medium he has provided a memorable sustenance to our visual perceptions. It is a worthy achievement which has exerted its influence even on the West which has recognized the technical qualities and the artistic virtues of his great Etchings. All critics of art and letters have recognized his individuality in Etching.

To-day the art of Chughtai and his pictorial creations have an international reputation. Chughtai and his art are the subject of reviews

But it had the potential qualities and the elegance and loftiness of these great poems! If Chughtai has had the privilege of being a contemporary of Iqbal it is in this that Chughtai, under his influence, broke the shackles of pessimism, the conception framed by the philosophic theory which had long circumscribed the human mind. He has poured his green, red, blue and yellow hues in such a purple goblet that the human spirit may enjoy the rhythmic bliss and pleasure as well as the attractive way through which the message of life is expressed and communicated. The glory of Chughtai's colours and the conception of his images have an ennobling effect on life. His visualisations are wedded to the social order to which he belongs and are determined by its demands. His conceptions take the form of a melody that resounds within us so that we cannot remain unmoved by the purity of his art and his creations.

The personality of Chughtai even to-day because of his modern tendencies attracts to itself the solitary movements that have lost the faculties of thought and feeling because of their indulgence in art for art's sake. He does not indulge in escapism nor does he create any intricacies so that it may not be possible for us to easily appreciate his unbounded creative faculties. The upsetting bewilderment caused in the minds of his fault-finders because of his artistic vigour and his healthy growth is indirectly the recognition of his greatness, his popularity and his personality.

Chughtai has ever endeavoured that his art should express his culture and should lend support to the visual standard of those in whose eyes the Eastern art even to-day is as glorious as any great art of the world. The history of Oriental art from Persia to India and from India to the Far East proves its continuity, the centrality of which has raised its loftiness and has provided for it an opportunity to survive; and it is this continuity which is responsible for giving birth to Iqbal, Tagore and Chughtai. Chughtai is not desirous of becoming Gauguin, Van Gogh, Piccaso, Rolo or Barqui. He believes that the secret of our existence lies in the fufilment of our own aspirations. Why should we not explore the possibilities in the works of our own artists like Behzad, Mirak,

new vision and a new school. He has established such an individual school of art which called to-day and will ever be called so in future after his name as the Chughtai school. His name will ever remain boldly written in the annals of art history. The school that he has created with all his sincerity, will ever occupy an honourable place in the cultural heritage of mankind. He has created a style of his own out of the pictorial traditions which had wellnigh been forgotten for about two hundred years.

According to Chughtai, art whether Eastern or Western, which is cut off from its traditions, loses sight of its past and does not respond to the National aspirations and needs of contemporary society, has no future. His belief is that every movement that helps elevate man spiritually, morally or individually is valid and will outlast time. For thus it gives to humanity an extraordinary ecstasy, fulness of life and consolation. It is with devoted enthusiasm that the artist in the face of adversities, economic distress and the hypocrisy of friends and admirers confidently endeavours to check the decline and disintegration of humanity and lends strength to a movement with the help of which may be determined the direction to the right path.

The main view-point of Chughtai's vision is to provide such a highway between man and nature which has the warmth of love, the passion of life and the power of discernment that man may not be destitute of his aesthetic imaginations and may not be deprived of the intensity of devotion. When he started his pictorial creation, Indian painting, however modern it might have looked at the time, was as full of pessimism that any great poet or painter, although he was alive in his vision and ideology, bore the bond of a continuous slavery. All around this art had only one pursuit in its creativity, the quest where the Buddha had vanished after his self-emancipation (nirvana). Leaving aside the Mughals, the Orientals did everything to tighten the cords and to narrow the meshes of this net. When Iqbal had composed his first verse or his first poem, he had no thought of Zarb-i-Kalim or Pyam-i-Mashriq.

It is more than half a century ago that Modern Indian Painting was born. Although the political influence of the foreigners played a part in its formation, it also had the sincerity and the distinctive potentialities of the Indian artists whose achievements were so formidable that the school of Modern Indian Art became the focus of attention of the world. It had its glorious traditions behind it to justify its name, and it acquired such a place in the domain of art that the critics and the thinkers of Europe had to acknowledge its entity and individuality.

It is more than twentyfive years since Chughtai has been making contributions to the Modern Art of the Indo-Pak subcontinent and ever since he has stood beside his contemporaries for the enrichment of the art traditions of the country. But according to his own statement, he never had a moment's leisure to work in collaboration with these artists. He never found the time to go to Bengal for this purpose although he recognised with profound veneration the Bengal school of art. He has enriched the heritage of art and culture of his country through his sincere effort and his incessant struggle to realise his aspirations and, on innumerable occasions, his creative talents have received warm tributes of connoisseurs and art lovers. Before he achieved fame, his work received harsh criticism and he had to undergo many hardships. He fell a victim to narrow provincial prejudices, but he remained deeply absorbed in his own artistic pursuits and productions and subjected his potentialities to constructive effort in the face of every kind of hostile propaganda. This has earned him an undying name and the history of Modern Indian Art cannot be complete without a chapter of his achievements. Chughtai is the only artist of the Indo-Pak subcontinent whose works and style have raised so great a controversy and about whom so much has been written. Some think that Chughtai is an artist whose vision is inspired by the past. But those who are close to him and have studied his art fully believe that he is a progressive Modern artist and as a man he has all the qualities and characteristics of the twentieth century. Chughtai aims at a new technique, a new style, a

THE ARTIST

It is seldom that the greatness of an artist finds recognition in his own life time. Many creative artists have lived and passed away without achieving contemporary fame. But once in a while when the creative genius of an artist is discovered and recognised by his contemporaries, the aspirations, beliefs, convictions, values and their ideology become for the artist a directing and shaping influence. A true artist is always conscious of his responsibilities to his society. He is always searching for new means, methods and techniques to reveal his unique and personal experiences and emotions to common people, as well as to the refined and cultivated. He knows that his creations should embody the intellectual and spiritual desires, aspirations and values of the community which he represents. If he fails in this endevour, the springs of his creative energy will dry up. The development of his mind and art will be impeded

The creative values of Chughtai's art arise from his own confidence in himself. From his earliest years he was sceptical of many of the trends of modern art and was suspicious of the meretricious quality of much that was being produced in studios of popular artists. Had he not resisted the temptation of following modern trends and had he not remained true to his own vision, and his means and methods, his art would have become barren and he would never have been able to assert and illustrate by his work how deep and remote are the origins of our own culture. Chughtai has a profound knowledge and understanding of our culture and all his work is informed by this knowledge and understanding.

poet, Maulana Jalal-ud-Din Roomi whom Iqbal has acknowledged as his Preceptor and Teacher, at several places in his poems. But the approach of Iqbal is somewhat different from that of Dante in his Divine Comedy. As Professor Bausani has put it in one of his articles, "Dante starts on his voyage to purify himself so as to be able to contemplate God....Iqbal's voyage of conquest is possible only after Dante has returned from his voyage of purification". He has acutely remarked that the Divine Comedy stands "under the sign of redeeming feminity while the 'Book of Eternity' stands under the heavy and distant omen of the inimitable power of man".

It is beauty allied with power in Iqbal's poetry, that has impelled Chughtai's gifted brush to transmute his ideas into his inimitable combination of colours and lines that, in the words of Dr. James H. Cousins, "seem to be less lines of painting than of some inaudible poetry made visible". His sensitivity and the quality of pictorial lyricism that characterise his paintings, have already assured the Artist a niche in the Temple of Fame and I feel sure that the wealth of imaginative truth that he has offered us in this volume will endure in the coffers of Time, long after some of the present-day aberrations that pass muster under the generous name of Modern Art, have sunk into the Limbo of oblivion.

S. A. RAHMAN

65, Gulberg, Lahore.
16-12-62.

immortality is possible but it has to be won. "Spatialised time is a fetter which life has forged for itself in order to assimilate the present environment". In reality we are timeless, for real time is identical with life which can preserve itself even after the dissolution of the body in which it is centred here, by maintaining that particular state of tension which it has so far achieved. In this life too, by educating his ego on the right lines, man can advance to that level of personality which may be termed as God's viceregency on earth. Such a person is the goal of humanity, the Perfect Man in whom the highest power is united with the highest knowledge and in whose life, thought and action, instinct and reason become one. His advent will establish the Kingdom of God on Earth. "For the present", says Iqbal, "he is a mere ideal; but the evolution of humanity is tending towards the production of an ideal race of more or less unique individuals who will become his fitting parents. Thus the Kingdom of God on Earth means the democracy of more or less unique individuals, presided over by the most unique individual possible on this earth. Neitzsche had a glimpse of this ideal race, but his atheism and aristocratic prejudices marred his whole conception".

The opinion is sometimes expressed that Iqbal probably borrowed his idea of the Perfect Man from Neitzsche. The fact is that long before he had read or heard anything of Neitzsche, Iqbal had written on the sufi doctrine of the Perfect Man, in the Indian Antiquary, in 1902 and he later incorporated his ideas on the subject in his thesis on the Development of Metaphysics in Persia (1908). Indeed, Neitzsche's a-moral, power-mad superman whose eternal recurrence is predestined, bears no comparison to Iqbal's harmoniously developed Perfect Man who is to be "the last fruit of the tree of humanity". Neitzsche, according to Iqbal, had the heart of a faithful believer but the mind of an infidel—

قلب او مومن دماغش کافر است

Special mention must be made of Iqbal's masterpiece in Persian *Javid Nameh* (the Book of Eternity). It depicts the Poet's adventurous quest through the Heavens, under the guidance of the renowned Persian

into the Universal Soul and dismiss the world of matter as an illusion. In the final analysis, Pantheistic monism involves a moral holiday and destroys the incentive to a life of useful activity. That was why in the *Asrar-i-Khudi*, Iqbal described Plato as a sheep in man's clothing. Plato's theory of Ideas implies the unreality of the physical world around us and robs the life-struggle of all significance. It was this obsession with the unreality of the Universe that permeated through the Neo-Platonists to Pantheistic sufism and turned the essentially dynamic view of life that Islam promulgated into the stream of quietist escapism. The world of matter, according to Iqbal, is real and provides the necessary obstruction for full play to be given to man's capacity for the Conquest of Nature. Ceaseless striving alone is the sign and symbol of life and contemplation without action is death itself. The poet would rather travel than arrive, for he says :

اللہ کرے مرحلۂ شوق نہ ہو طے

[May God ordain that there be no journey's end for love.]

Iqbal has affinity with Bergson in his ideas of the Elan Vital and pure Duration, but he has criticised the latter's purposeless stream of life. For him the life urge is purposeful, being a creative force rationally directed. All life is individual and it becomes conscious of itself in its highest manifestation man who is at present partly free and partly determined. In its essence, life is a quest for greater freedom and its goal lies in continual approach to the most free and most unique individual —God. The individual, however, does not lose his identity in the Absolute. By voluntary adoption of a course of self-discipline, the individual can acquire the attributes of God and thus, in a sense, absorb God into himself.

Egohood or Personality, then, is the keynote of Iqbal's philosophy. This is for him the touchstone of all Art, literature, ethics and religion. That which strengthens the ego is good; that which weakens it is bad. The degree of reality of an individual varies with the degree of the feeling of egohood. Personality is a state of tension and the preservation of that state by sustained conscious effort, tends to make us immortal. Personal

relationship as a basis of human unity, describing it as earth-rootedness and a form of barbarism. "Humanity", he declared, "needs three things to-day—a spiritual interpretation of the Universe, spiritual emancipation of the individual and basic principles of a universal import directing the evolution of human society on a spiritual basis". These principles he found embodied in the Islamic conception of life, which cuts across all geographical, racial and other social barriers and visualises an ideological community traditional in its values, progressive in its outlook and reconciling the individual and the community, church and state, the ideal and the real into one harmonious whole. He could not countenance the dichotomy of religious and political values that prevailed in the West. The theistic Islamic socialism which declares land to be for God and makes property a trust in the hands of owners, was, for Iqbal, the social system of the future, in preference to materialistic communism with its class war and regimentation of thought and action. To those who were inclined to cavil at his ostensible parochialism, he pointed out that the object of his Persian poems was not to make a case for Islam. He was aiming at a universal social reconstruction and in the process, he found it philosophically impossible to ignore a social system which expressly avows a universal humanistic code of life. He did not regard philosophy as the handmaid of religion.

Iqbal was par excellence the poet of affirmation—his poetry says 'Yes' to life. In this respect he stands in refreshing contrast to some of the moderns whose frustrated and cynical outlook is singularly devoid of vital values. He describes life as a forward assimilative movement, its essence being the continual creation of desires and ideals. In his view, the Universe is not a finished product but is still in the process of making though not in accordance with a predestined, preconceieved plan, such as would rob it of all originality. Man too takes his share in creation inasmuch as he helps to bring order into at least a portion of the chaos. He thus parts company with the English Neo-Hegelians as well as those Pantheistic *sufis* who hold up as an ideal, the absorption of the individual

by the Oxford University Press—a monumental book which reveals the immense sweep of his scholarship extending from a profound study of Eastern religious literature to a critical appreciation of modern thought. There is also his Doctorate thesis entitled "The Development of Metaphysics in Persia" (1908) and his son, Dr. Javid Iqbal, has recently published the poet's diary, in which he had jotted down stray reflections, from time to time, in more or less epigrammatic form. Therein we find an interesting confession that it was the poetry of Wordsworth that saved him from atheism in his younger days.

Iqbal had come to be internationally known in his life-time, with the translation of his *Asrar-i-Khudi* (Secrets of the Self) into English, by the late Dr. R. A. Nicholson of Cambridge, but the passage of time seems to have won him a still wider appreciation, after his death. Prof. A. J. Arberry and Mr. V. J. Kiernan have given us English translations of some of his important works. Dr. Alessandro Bausani of Rome has published an Italian translation of his *Javid Nameh*, under the title "11 Poema Celeste". Dr. Anne Marie Schimmel is engaged in introducing his writings to German readers. The late Dr. Abdul Wahab Azzam of Egypt, himself a poet, had rendered some of his books into Arabic verse. The new orientation of thought in Iqbal's Persian poems so impressed the late Malik-ush-Shu'ara Bahar of Iran that he declared:—

عصر حاضر خاصۂ اقبال گشت

[The present era has become the era of Iqbal].

Local scholars have also produced translations of some of his works either into English or into one of the regional languages of Pakistan. The literature on Iqbal seems to be growing day by day.

Iqbal, in his younger days, had passed through the phase of ardent nationalism and sung the songs of a united India marching to freedom from the alien yoke. Though he retained his abhorrence of Colonialism and Imperialism right till the end of his life, he soon outgrew the shackles of territorial nationalism as a political creed. He also condemned blood-

All-India Muslim League, held at Allahabad in 1930 and in his historic address, formulated the idea of an independent Muslim State, which culminated in the famous Pakistan resolution of the Lahore Session of the League, in 1940, after his death. He was a Muslim delegate to the Round Table Conference of Indian Leaders convened by the British Government in London in 1931 and on this occasion, travelled through Spain, Italy and other countries. He returned to his remarkably simple life at home, marked by his unassuming accessibility to all types of visitors, at all odd hours of the day. He passed away on the 21st of April 1938, deeply mourned by the intellectuals of the country and idolised by the Muslim masses, seventy-thousand of whose number followed his funeral procession. He was laid to rest in the vicinity of the historic Badshahi Mosque, a monument to the piety of the Moghal Emperor, Aurangzeb.

Iqbal's versatile genius was equally at home in three languages—Urdu, Persian and English. In the former two, he has left us volumes of exquisite verse, that ensure him a place among the immortals of literature, beside some miscellaneous writings like his letters, an elementary book on Economics, odd essays and the records of his charming conversations—he was a vivacious conversationalist with an almost encyclopaedic mind. The first collection of his Urdu poems, *Bang-i-Dara*, came out in 1924. The *Bal-i-Jibril* (his acknowledged masterpiece in the Urdu language) and the *Zarb-i-Kalim*, were published in 1935 and 1936 respectively while the *Armughan-i-Hijaz* (which also included some Persian verse) appeared posthumously in 1938. His central philosophical theme found expression in poetical form in his Persian poem, the *Asrar-i-Khudi* (1914) and its supplement, the *Ramuz-i-Bekhudi* (1918). The Persian *Payam-i-Mashriq*, was written in response to Goethe's West-Osterliche Divan (1922). The *Zabur-i-Ajam* and *Pas chih bayad Kard cum Musafir*, followed in 1927 and 1936 respectively and his major work, "The *Javid Nameh*"—the Divine Comedy of the East in 1932.

Among his English prose works, pre-eminence belongs to "The Reconstruction of Religious Thought in Islam" which has been published

Iqbal appears to have been conscious of his own apostolic role, for he says:

> I have no need of the ear of To-day
> I am the voice of the poet of To-morrow.
>
> (Asrar-i-Khudi)

And again he predicts:

پس از من خوانند و دریابند و می گویند
جہانے را دگرگوں کرد یک فرد خود آگاہے

[After I am gone, they shall recite my verses, understand and say,
A man conscious of his self, changed the hue of a whole world].

This is not the occasion for an exhaustive account of Iqbal's life and thought but a brief survey of the salient points of both might serve to put this publication in its proper perspective, for Western readers.

Born at Sialkot in the Punjab on the 22nd of February 1873, in a middle class family, Muhammad Iqbal (to give him his full name) received his early education in the place of his birth. During those formative years he was fortunate in having a teacher of the calibre of M. Mir Hasan, a scholar of the old school, who inculcated in him the love of his Muslim heritage. In 1895 he shifted to Lahore, the Provincial capital, where he came under the influence of Sir Thomas Arnold who was then Professor of Philosophy in the Government College, Lahore. Iqbal obtained his Master's Degree from that College in 1899. He served for a time as a lecturer in that institution. In 1905 he proceeded to Europe to study Philosophy at Trinity College, Cambridge and at Munich where he qualified for his Doctorate. He was called to the Bar at Lincoln's Inn, London, in 1908. He returned in that year to Lahore where he passed the rest of his days, devoting himself whole-heartedly to his literary activities and resorting to his legal practice merely to keep body and soul together. In 1922 he was knighted for his eminence in letters. In 1927, he was elected to the Punjab Legislative Council of which he remained a member for three years. He presided over the Annual Session of the

JUSTICE S. A. RAHMAN, *H. Pk.*

INTRODUCTION

When Chughtai was only 29, he brought out a superbly illustrated edition of the Divan of the famous Urdu Poet, Ghalib, and named it "Muraqqa-i-Chughtai". Iqbal contributed a Foreword to that publication and described it as "a unique enterprise in modern Indian painting and printing". Now that the Artist and his art have both reached maturity, he has conjured up the practical idealism of Iqbal by the magic of his brush, in what bids fair to be his *magnum opus.*

The question may well be asked—why has Chughtai devoted the fullness of his artistic genius to this reverential tribute to Iqbal? The answer is plain. Iqbal was the apostle of Muslim renaissance and the ideological inspirer of Pakistan, though he did not live long enough to witness the translation of his dream into reality. He was the Poet-Philosopher of the East and in his time, the best representative and symbol of that culture in which Chughtai has his roots and with which he has maintained a vital contact in his life-work. It was he who quickened the Indian Muslims to a sense of their high destiny. In the words of the well-known Indian poet, M. Ghulam Qadir Girami who wrote in Persian:

در دیدۂ معنی نگہبان حضرت اقبال
پیمبری کرد و پیمبر نتوان گفت

[In the eyes of those who appreciate significance, Iqbal functioned as a prophet though he cannot be termed one].

فرمانِ خدا

اُٹھو مری دُنیا کے غریبوں کو جگا دو
کاخِ اُمرا کے در و دیوار ہلا دو

گرماؤ غلاموں کا لہُو سوزِ یقیں سے
کُنجشکِ فرومایہ کو شاہیں سے لڑا دو

سُلطانیٔ جمہُور کا آتا ہے زمانہ
جو نقشِ کُہن تم کو نظر آئے مِٹا دو

جس کھیت سے دہقاں کو میسّر نہیں روزی
اُس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو

کیوں خالق و مخلوق میں حائل رہیں پردے
پیرانِ کلیسا کو کلیسا سے اُٹھا دو

حق را بسجودے، صنماں را بطوافے
بہتر ہے چراغِ حرم و دَیر بجھا دو

مَیں ناخوش و بیزار ہوں مرمر کی سلوں سے
میرے لیے مٹّی کا حرم اور بنا دو

تہذیبِ نوی کارگہِ شیشہ گراں ہے
آدابِ جُنوں شاعرِ مشرق کو سکھا دو

انقلاب

خواجہ از خونِ رگِ مزدور سازد لعلِ ناب
از جفائے دہ خدایان کشتِ دہقانان خراب
انقلاب!
انقلاب! اے انقلاب!

شیخِ شہر از رشتۂ تسبیح صد مومن بدام
کافرانِ سادہ دل را برہمن زنّار تاب
انقلاب!
انقلاب! اے انقلاب!

میر و سلطان نرد باز و کعبتینِ شان دغل
جانِ محکومان ز تن بُردند و محکومان بخواب
انقلاب!
انقلاب! اے انقلاب!

واعظ اندر مسجد و فرزندِ اُو در مدرسہ
آن بہ پیری کودکے این پیر در عہدِ شباب
انقلاب!
انقلاب! اے انقلاب!

اے مسلمانان فغان از فتنہ ہائے علم و فن
اہرمن اندر جہان ارزان و یزدان دیریاب
انقلاب!
انقلاب! اے انقلاب!

شوخیِ باطل نگر اندر کمینِ حق نشست
شپّر از کوری شبیخونے زند بر آفتاب
انقلاب!
انقلاب! اے انقلاب!

در کلیسا ابنِ مریم را بدار آویختند
مُصطفٰے از کعبہ ہجرت کردہ با اُمّ الکتاب
انقلاب!
انقلاب! اے انقلاب!

من درونِ شیشہ ہائے عصرِ حاضر دیدہ ام
آن چنان زہرے کہ از وے مارہا در پیچ و تاب
انقلاب!
انقلاب! اے انقلاب!

با ضعیفان گاہ نیروے پلنگان می دہند
شعلۂ شاید برون آید ز فانوسِ حباب
انقلاب!
انقلاب! اے انقلاب!

دانائے راز
ہم ز وقت از خلوت دشت حجاز آید برون
کاروان زین وادی دور و دراز آید برون
من بسیمائے غلامان فر سلطان دیدہ ام
شعلہ محمود از خاک ایاز آید برون
عمرہا در کعبہ و بتخانہ می نالد حیات
تا ز بزم عشق یک دانائی راز آید برون
اقبال
چنگ را گیرید از دستم کہ کار از دست رفت
نغمہ ام خون گشت و از رگہائے ساز آید برون
طرح نو می افگند اندر ضمیر کائنات
نالہ ہا کز سینہ اہل نیاز آید برون
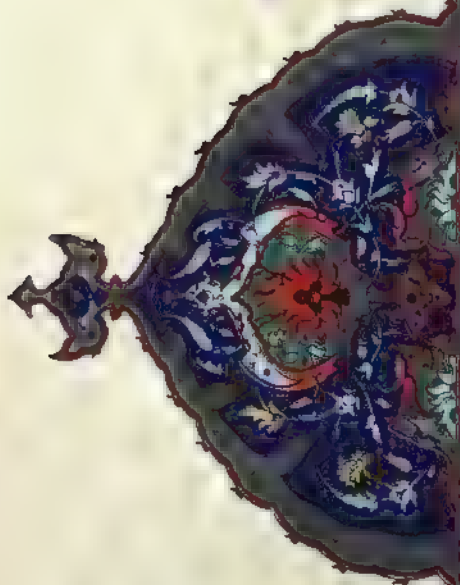
THE PUBLISHER EXPRESS HIS GRATITUDE TO PROF. R. A. NICHOLSON,
PROF. J. ARBERRY. PROF. V. G. KIERNAN. PROF. ERIÇ CYPRIAN.
AND OTHERS FOR ENGLISH POEMS OF DR. IQBAL.

MASTERPIECE

—The heavens and the earth were made
—The Creator paused and surveyed

His creation ; He wished to name
what was His masterpiece.

—All the world lay before him
But He could not name what was His masterpiece.

—Then said the Creator, Let him whom
We made in Our image do this for Us

Thus it fell to Man to name what was
His masterpiece.

The Angels bowed low before this honour
done to Man

And a Light spread far and wide and
gathered fast and quick over the entire cosmos.

The chosen one is still immersed
in the work entrusted to him

—In spite of all his strivings and efforts, out of the creation of his creator, he has not been able to name what is His masterpiece.

CHUGHTAI

عروسِ لالہ
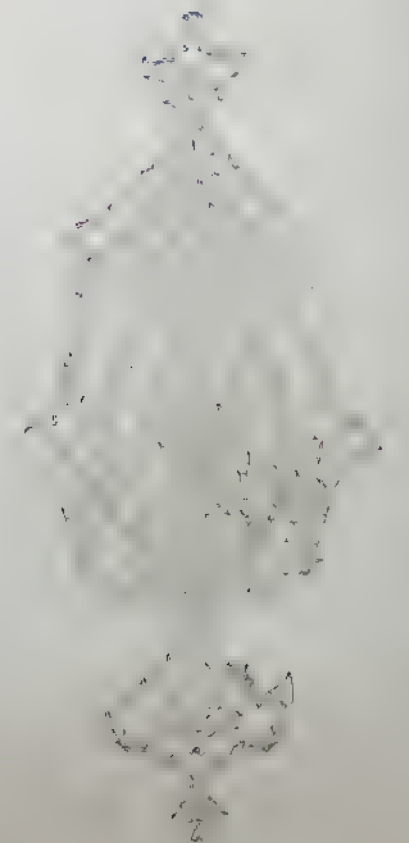
بیا کہ بُلبلِ شوریدہ نغمہ پرداز است
عروسِ لالہ سراپا کرشمہ و ناز است

اقبال

عروسِ لالہ

عُروسِ لالہ ، یہ تصویر خیامی رنگ و روپ اور عجمی لے میں بسی ہوئی ہے۔ تخیل آفرینی کے دوش بدوش دلنوازی و ر وورد انگیزی اس درجہ کیف آور ہیں کہ فن کار کی فنی عظمت کا اعتراف کرنا پڑتا ہے۔ عجمی تصورات ، ایرانی پس منظر اور رومانیت کو مصوّر نے رنگوں کے امتزاج و رحلاوت سے ایک ایسی فضا میں تخلیق کیا ہے کہ تصویر کی ہم آہنگی اس کے انگ انگ سے واضح ہے۔ چغتائیؒ کی مصوری میں حُسن کی تلاش اس قدر گہری اور نمایاں ہے کہ ثقافت و رفنی انہاک میں رچا بسا ہر شاہکار اک بحرِ بیکراں کی طرح موجزن نظر آتا ہے۔ اور موجوں کا گیت گہری رومانیت میں ڈوب کر محض سُنائی ہی نہیں دیتا ، بلکہ یوں محسوس ہوتا ہے کہ دلکشی ، حُسن و جمال اور ولولہ انگیزی زندگی کی حرارت کا ایک لازمی حصہ ہے چغتائیؒ اور اقبالؒ رومانیت کو روایات کا سرچشمہ سمجھتے ہیں اور ان کا یہ مشترکہ احساس کسی حدود کا پابند نہیں ؎

یہ محبت کی حرارت ، یہ تمنا یہ نمود
فصلِ گُل میں پھول رہ سکتے نہیں زیرِ حجاب

پھول اور خوشبو ، سرو اور چنار ، خزاں و بہار ، تمکنت اور تناؤ ، استعارے اور تشبیہیں ، لباس اور لباس کے تیور ، لوچ لچک ، لب ولہجہ زنِ تاریخ ہیں اور یہ بصیرت تاریخ کا منبع ہے۔ شاعر کے یہاں مصور کے مشاہدوں کا یہ لامتناہی سلسلہ مختلف کیفیتوں میں جلوہ گر ہے۔ ہمارا آرٹ اور ادب ہماری مشرقیت سے زندہ ہے۔ اقبالؒ اور چغتائیؒ میں یہ ملی قدریں مجاہدانہ عظمت کا درجہ رکھتی ہیں ؎

اگرچہ زادۂ ہندم ولے فروغِ من است
ز خاکِ پاکِ بخارا و کابل و تبریز

اقبالؒ نے زندگی کو خود آرائی سکھائی ، رومیؔ نے اسرارِ حیات کو سمجھایا اور سعدیؔ نے اخلاق کا اقتدار بڑھایا فردوسیؔ نے رزم و بزم کے منظر دیکھے۔ حافظؔ نے جذبات کے مد و جزر سے و رخیامؔ نے وقت کو لطف و نشاط سے آشنا کیا۔ تو چغتائیؒ نے اپنے متاع کو جلال و جمال بخشا ہے۔

ایک شہنشاہ نے تصویر دیکھی تو کہا۔ یہ جلال و جمال کا تہذیبی ورثہ ہے۔ یہ مخمل آرائی فنی شکوہ کا معجزہ ہے اور مصوّر کی بصیرت اس کی لافانی رومانیت کی آئینہ دار ہے۔ عالم اور نقاد بولا۔ تاثرات کی شدت ، وجدانی کیفیات ، نانیت اور رومانیت کی سحرکاری مائل پرواز ہے جس کے اجتہاد نے صدیوں جمالیات کے شجر کو سینچا اور بلند و بالا کیا ہے۔

چغتائی کے خون میں، رزم و بزم سبھی کچھ ہے۔ اس کے خون کی حدت نے رومانیت کو نئی گرمی دی ہے، رومانیت کو نیا مقام بخشا ہے یہی حُسن تخیل پھولوں کے تبسم سے گذر کر فکر و عمل سے ہموار ہوتا ہے اور ان عظیم آرٹسٹوں کی یاد دلاتا ہے جنہوں نے دورِ احیاء کی زندگی کے گہرے نقوش چھوڑے ہیں۔ **عروسِ لالہ** حسن لازوال کی سرمستیوں میں سرشار اپنے گرد و پیش سے متاثر، تسکینِ قلب کے لئے ایک نشاۃ ثانیہ ہے۔ جس میں قدیم و جدید کے متحرک اوصاف، ایک موضوع سے دُوسرے موضوع میں ڈھل جاتے ہیں۔ یہ لحن دلنواز، یہ سرور انگیز ترنم ہر آن وسیع سے وسیع تر ہے۔ یہ کبھی تھم نہ سکیگا **چغتائی** کا فن اپنی نادرہ کاری اور تجریدی امکانات کے پہلو بہ پہلو یونہی اپنے ارتقاء کا پیچھا کرتا رہے گا۔

بہار تا بہ گلستاں کشید بزم سرود
نوائے بُلبل شوریدہ چشمِ غنچہ کشود

خیز کہ در کوہ و دشت خیمہ زد ابرِ بہار
خیز کہ در باغ و راغ قافلۂ گُل رسید

پھر چراغ لالہ سے روشن ہوئے کوہ و دمن
مجھ کو پھر نغموں پہ اکسانے لگا مُرغِ چمن
پھُول ہیں صحرا میں یا پریاں قطار اندر قطار
اُودے اُودے، نیلے نیلے، پیلے پیلے پیرہن
برگِ گُل پر رکھ گئی شبنم کا موتی بادِ صبح
اور چمکاتی ہے اس موتی کو سُورج کی کرن

حُسن بے پروا کو اپنی بے حجابی کے لئے
ہوں اگر شہروں سے بَن پیارے تو شہر اچھے کہ بَن!

THE PERSIAN IDOL

This is a representation of romanticism of Chughtai, full of poetry and lyric. It has a glamour of colours, fragrance and dazzling perfection of a nice composition.

Chughtai as a master artist is gifted with extraordinary power of design and craftsmanship. This picture has been drawn with great love and affection. The brightest touches of colours and delicate tones are very sensitive and have a variety of mood. It seems to dissolve into a dream atmosphere.

This masterpiece is like a lyrical song, which has been composed in rhythmical lines and harmonious colours, along with green cypress trees in the background.

**"SPRING LIKE THIS! SUCH NOTES OF THE NIGHTINGALE!
UNVEIL THY FACE, SING A SONG AND HAND ROUND THE WINE THUS!
BID THE SPRING BREEZE TO FOLLOW MY FANCY
WHICH BEDECKS WITH BLOOMS VALLEY AND PLAIN THUS!**

IQBAL

Poet of The East and Chughtai